اردو کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والی اولین اہم شاعرہ

زخ ش

کی حیات و شاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے: پی ایچ ڈی

مرتبہ: انیس فاطمہ (فاطمہ حسن)

نگراں: ڈاکٹر اسلم فرخی

ڈاکٹر اسلم فرّخی

تاریخ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ تحقیقی مقالہ ''اردو کے ادبی رسائل میں شائع ہونے والی اولین اہم شاعرہ زخ ش کی حیات و شاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ'' برائے پی ایچ ڈی انیس فاطمہ نے میری نگرانی میں مرتب اور مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ طبع زاد اور مؤلف کی اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔ میری دانست میں یہ مقالہ کراچی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ہر لحاظ سے موضوع اور مناسب ہے۔

۲۰۰۵/۳/۱۴

(نگران تحقیق)

نگرانِ اعلیٰ (اعزازی)
ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ وفاقی اردو یونیورسٹی، گلشنِ اقبال کیمپس، یونیورسٹی روڈ، کراچی
فون: ۰ ۲۸۲۲۳۸ ۔۔۔۔ ۹۲۴۳۱۳۲_۵۰ (توسیع: ۲۰۳۳/۲۰۳۴)

فہرست

دیباچہ

جواں مرگ شاعرہ اور نثر نگار زاہدہ خاتون شروانیہ جو بالعموم ادبی رسائل میں اپنا نام زخ ش لکھتی تھیں۔ اُس وقت میری توجہ کا مرکز بنیں جب میں اردو رسائل کی روشنی میں خواتین کی شاعری کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان رسائل میں پہلی توانا اور معتبر آواز جو سامنے آئی وہ زخ ش کی تھی جس کا اعتراف ان کے عہد کی ذی علم شخصیات کر رہی تھیں۔ میں نے ان کے مجموعہ کلام آئینہ حرم اور فردوس تخیل کا مطالعہ کیا تو متحیر رہ گئی۔ ان کی نظموں میں شاعرانہ خوبیوں کے علاوہ مضامین کا تنوع، عصری حسیّت و مسائل سے ہم آہنگی اور نسائی شعور کا بھرپور اظہار تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی شاعری کے باقاعدہ اور سنجیدہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ جیسے جیسے میں نے اپنے مطالعے کو آگے بڑھایا ان کے شخصیت کی ایسی جہتیں سامنے آنے لگیں جو ان پر ایک تحقیقی مقالے کی متقاضی تھیں۔ اگر چہ یہ ایک مشکل کام تھا مگر میرے استاد و نگراں ڈاکٹر اسلم فرخی کی مشفقانہ رہنمائی نے مجھے اس کام کا حوصلہ دیا۔ جامعہ کراچی کے شعبہ ابلاغ عامہ کے صدر ڈاکٹر طاہر مسعود اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے بھی میری حوصلہ افزائی کی۔ ان تین فاضل ہستیوں کی تائید سے مجھے ایک ایسی سمت قدم بڑھانے کی ہمت ہوئی جہاں جستجو کی نئی راہ روشن ہو رہی تھی۔ یہ صرف ایک پردہ دار شاعرہ پر تحقیقی کام نہیں تھا بلکہ اس شخصیت پر کام کرنا تھا جو بہت سے رسائل و اخبارات کی غائبانہ سرپرستی کر رہی تھی۔ سماجی اور سیاسی تحریکوں میں رازدارانہ طور پر فکری و عملی حصہ لے رہی تھی اور ایک سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی پرخلوص کوشش میں داخلی طور پر لہولہان ہو رہی تھی۔ اس ہستی پر اب تک صرف ایک کتاب حیات زخ ش جو ان کی پھوپھی زاد بہن انیسہ خاتون شروانیہ نے ۱۹۴۰ء میں لکھی تھی۔ حیدرآباد دکن سے چھپی تھی اب یہ بھی نایاب ہے۔ دو مضامین شان الحق حقی نے لکھے ہیں۔ پہلا مضمون زخ ش ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا تھا اور ان کے مجموعہ مضامین نکتہ راز میں شامل ہے۔ دوسرا مضمون زخ ش کی شخصیت خطوط کے آئینے میں اس کے ضمیمے کے طور پر لکھا گیا۔ ان مضامین میں شان الحق حقی نے ان کی شاعری اور شخصیت کو نمایاں کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اس نابغہ روزگار شاعرہ پر تفصیلی کام ہونا چاہیے۔ انہوں نے مجھ سے ایک ملاقات کے بعد زخ ش کی سگی بھانجی مدیحہ خاتون شروانی کو میرے بارے میں لکھنے کے ساتھ ساتھ اسی خط میں اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ زاہدہ خاتون شروانیہ کے خطوط جو خواجہ حسن نظامی کی بیگم لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھے گئے تھے بڑی تعداد میں ان کے صاحبزادے حسن ثانی نظامی کے پاس موجود ہیں اور ان میں سے کچھ خطوط کی نقول انہوں نے مشفق خواجہ کو دی تھیں۔ یہ خط ۱۱نومبر ۲۰۰۳ء کو لکھا گیا۔ (مکمل خط ضمیمہ نمبر ۱)۔ جب مدیحہ خاتون شروانی نے مجھ سے رابطہ کیا تو شان الحق حقی اور مشفق خواجہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ مدیحہ خاتون سے رابطے کے بعد میں دہلی میں خواجہ حسن ثانی نظامی کے یہاں گئی اور علی گڑھ میں زخ ش کے عزیزوں سے ملاقات کی۔ علی گڑھ میں ان کے عزیزوں خصوصاً مدیحہ خاتون شروانی نے پرخلوص میزبانی اور تحقیق میں حتی الامکان تعاون کیا جس کے لیے میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔ انہوں نے زخ ش کے مجموعے کا دوسرا ایڈیشن جس کی وہ ناشر بھی ہیں عطا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی غیر مطبوعہ غزلوں، خطوط اور مطبوعہ مضامین کی نقول بھی فراہم کیں۔ زخ ش کی آبائی

حویلی مزمل منزل میں ان کے بھائی رحمت اللہ خان شروانی مقیم ہیں۔ انہوں نے اپنی حویلی اور وسیع کتب خانے کا دورہ کروانے کے ساتھ ساتھ اپنی حویلی کی تصاویر اور خاندانی معلومات فراہم کیں۔ زخ ش کے حقیقی بھانجے نعمت اللہ خان شروانی نے جو خود بھی شاعر ہیں ان کی شاعری اور خاندانی حالات پر روشنی ڈالی۔ کراچی میں مقیم زخ ش کی بڑی بہن احمدی بیگم نکہت کے سگے نواسے ریحان شروانی اور ان کی اہلیہ نادرہ خاتون شروانی نے بھی اس پوری تحقیق میں مسلسل میری مدد کی اور کراچی وعلیگڑھ کے درمیان رابطہ بنے رہے۔ انہوں نے خاندانی شجرہ اور شروانی نامہ جیسی نایاب کتاب مہیا کی۔ خصوصاً انہوں نے خاندانی حالات پر مشتمل ابواب کو پڑھ کر اس کی تصدیق وتصیح بھی کی۔ یہاں پر میں مشفق خواجہ صاحب کا بھی ذکر کروں گی جنھوں نے تحقیق کی ابتدا میں زخ ش، ان کی بہن نکہت اور پرانی شاعرات پر گراں بہا مواد کی نقول اپنی لائبریری سے مہیا کیں۔ کام کی تکمیل کے لیے میرے بزرگ لطف اللہ خان، دوستوں فہمیدہ ریاض اور ڈاکٹر شاہ محمد مری کا اصرار اور جناب مشتاق احمد یوسفی کی حوصلہ افزائی اور مشورے بھی ساتھ رہے۔ میری شاعرہ دوست ثمینہ راجہ نے علی گڑھ کے سفر میں میرا ساتھ دیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی اردو فیکلٹی خصوصاً ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے بھی تعاون کیا۔ ان کی اہلیہ کی مدد سے میں نے علی گڑھ کالج کی لائبریری سے بہت کم وقت میں رسالہ خاتون کے پرانے شماروں سے زخ ش کے مضامین کی نقول حاصل کیں۔ اس کے لیے میں ان کی اور لائبریرین کی شکر گزار ہوں۔ میں خواجہ حسن ثانی نظامی کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے ڈھائی سو سے زائد خطوط کی نقل مہیا کی جو زخ ش نے ان کی والدہ کو لکھے تھے۔ ان خطوط کے لیے بار بار تاکید کی گئی تھی کہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ چنانچہ خواجہ حسن ثانی نظامی کو ان خطوط کی فراہمی پر تامل تھا۔ لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی کی سفارش اور زخ ش کے بھائی رحمت اللہ خان شروانی کے تحریری اجازت نامے پر کمال مہربانی سے ان کی نقل ایک سی ڈی پر مدیحہ خاتون شروانی کو فراہم کردی تھی۔ جسے علی گڑھ سے مجھ تک پہنچانے کی زحمت میری دوست ثریا وقار نے اٹھائی۔ اس مقالے کی تحریر کے دوران میرے شوہر شوکت زیدی نے حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ پروف ریڈنگ میں بہت مدد کی ہے جبکہ میری بہن تحسین فاطمہ اور بیٹی اسریٰ زیدی نے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش رکھا۔ میں اپنے ٹائپسٹ عمران خان کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے بہت محنت سے اس مسودے کو ٹائپ کرنے کے لیے میری سہولت کے مطابق وقت نکالا۔ میں تاج آپا (بیگم ڈاکٹر اسلم فرخی) کے پرشفقت رویے کا بھی اعتراف کرنا چاہوں گی جو اس محنت طلب دور میں میرے لیے حوصلے کا باعث رہا۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ڈاکٹر اسلم فرخی جیسے قابل اور مشفق استاد کی نگرانی میں کام کرنے کا موقع ملا جن کے علم اور تجربے نے اس راہ کی مشکلات کو آسان کردیا۔ خدا ان کا سایا ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے کہ ہم ان کے علم سے استفادہ کرتے رہیں۔

(فاطمہ حسن)

۵ مارچ، ۲۰۰۷ء

زخ ش کا عہد

(انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے اوائل تک)

زخ ش (زاہدہ خاتون شروانیہ) کا عہد برصغیر اور عالمی سطح پر تاریخ اور تمدن کا بے حد اہم عہد ہے۔ اس دور میں برصغیر میں مغرب ومشرق کی کشمکش بہت نمایاں ہوچکی تھی۔ مشرق پسماندہ اور دل گرفتہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مغرب فاتح کی حیثیت سے پورے برصغیر کو اپنی تمدنی گرفت میں لینے کیلئے تمام کوششیں آزما رہا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کی تحریر قابل غور ہے۔

''۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۰ء تک کا زمانۂ عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کی داستان عظیم کا ابتدائیہ ہے۔ یہ دور اپنی دیوزاد شخصیتوں کی وجہ سے تمدنی تاریخ میں قابل ذکر ہے۔ سرسید محسن الملک' وقار الملک' چراغ علی' نذیر احمد' حالی' آزاد' شبلی اور ذکاء اللہ اس عہد کی وہ جلیل القدر شخصیتیں ہیں جن پر کوئی قوم بھی فخر کرسکتی ہے۔ اصلاح کے اس دور میں اردو ادب نے نیا قالب اختیار کیا اردو زبان نئے علوم سے آشنا ہوئی۔ شعر وسخن کا مزاج بدل گیا۔ بعض اصناف سخن یکسر ختم ہوگئی ۔ نظم کا آفتاب طلوع ہوا۔ ادب قومی اصلاح کا ذریعہ بن گیا۔ اس عہد میں اکبر کی طنزیہ شاعری نے فروغ پایا۔ اس دور میں اقبال کے شاعرانہ خیالات کی نشونما ہوئی اس دور میں قوم کے سرپر خشت کلیسا باقی رکھنے کا جذبہ عام تھا لیکن ایسے حالات پیدا ہوئے جو مسلمانوں میں قومیت کے تصور کو مہمیز کر رہے تھے۔'' ۱

سیاسی طور پر یہ عہد برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسے منجدھار میں لے آیا تھا جس کے مدوجزر پر ان کا اختیار نہیں تھا۔ حالات کی روانی اس کے خلاف تھی اس احساس کو اجاگر کرنے کے لئے پے درپے حادثات و واقعات رونما ہورہے تھے۔ ایسے میں چند اکابر حالات کو سنبھالنے کی کوشش میں تھے لیکن ان کا مقابلہ شاطر مخالفین سے تھا جو اپنے مُہرے کسی اخلاقی دباؤ کے بغیر چلنے کے عادی تھے۔ وہ مات ہوتے دیکھ کر بساط الٹنے سے بھی عار نہیں رکھتے تھے۔ انگریز آقاؤں کو اپنے وہ مفادات عزیز تھے جن سے مقامی آبادی کو بالکل آگاہی نہیں تھی۔ یورپ میں صنعتی انقلاب آچکا تھا اور اب ساری دنیا میں ان کی مارکیٹ کی دوڑ شروع ہوچکی تھی جس کا نتیجہ عالمی جنگوں کی صورت میں سامنے آنے والا تھا۔ ترکی کی شہنشاہیت اس کا شکار ہوئی تو برصغیر کے سادہ لوح مسلمانوں نے اسے خلافت کا خاتمہ جانا اور تن من دھن سے اس طرف متوجہ ہوگئے۔ مسلم اشرافیہ جو عالمی سیاست سے بے بہرہ تھی جاگیردار طبقے پر مشتمل تھی۔ اس کی دوراندیشی اور بصیرت پر اپنے

مفادات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ برصغیر کی بڑی آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی اور تعلیم سے قطعی محروم تھی۔ اس کمی کا ادراک بھی کسی کو نہیں تھا۔ خواتین خصوصاً مسلم خواتین میں تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور اظہار رائے تہذیب کے خلاف تھا۔ ان حالات میں وہ چند تعلیم یافتہ افراد جن کی مغرب کی درسگاہوں تک رسائی ہوگئی تھی وہ بھی انگریزی تعلیم کی حد تک باخبر تھے یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں بادشاہت کے خلاف شدید ردعمل انقلاب کی صورت میں رونما ہوا تو عرصے تک اس کا فکری عکس اس دور کے ہندوستانی معاشرے پر نظر نہیں آیا۔ تاہم حالات کے پے در پے تھپیڑوں نے مسلمانوں کو متحد ہونے اور اپنی سمت مقرر کرنے پر مجبور کردیا۔

تعلیمی بیداری کے دور کا آغاز سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے کیا۔ سرسید احمد خان نے برصغیر کے مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لئے انگریزی تعلیم پر زور دیا اور ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا جس کے تحت محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا گیا۔ سرسید احمد خان نے انگریزی کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو بھی نصاب میں شامل کیا۔ طلباء کیلئے سائنسی علوم کو آسان بنانے کے لئے انگریزی کتابوں کے اردو تراجم پر توجہ دی اور باقاعدہ سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ ان کے قائم کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے پورے ہندوستان میں منعقد ہوتے تھے۔ سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک کا بنیادی مقصد مسلمان مردوں کو جدید اعلیٰ تعلیم کے ذریعے معاشی اور سماجی طور پر ترقی یافتہ قوموں کے برابر لانا تھا۔

زاہدہ خاتون شروانیہ کے والد نواب بہادر سرمزمل اللہ خان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام اور سرسید کے ترقی پسند رجحان کے حامی تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی مالی اعانت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی رفاقت کے زیر اثر خاندان میں تعلیم کو عام کرنے کی بڑی وجہ سرسید سے ان کی پرخلوص وابستگی تھی جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر کے مسلمانوں میں سیاسی شعور تعلیم کی بنیاد پر پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں اخبارات ٗجرائد ٗناول ٗرسائل اور متعدد خواتین کے رسائل کا اجراء ہوا۔ یہ اخبارات و جرائد اپنے عہد کی تصویر کشی کے ساتھ رائے عامہ کی تعمیر بھی کررہے تھے۔ اس دور کے بہت اہم واقعات میں جس سے مسلمانوں میں بے چینی ٗاضطراب اور سیاسی ہلچل پیدا ہوئی۔ اس دور کے بہت اہم واقعات میں سب سے اہم مسلم لیگ کا قیام ہے۔

''۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ کانفرنس کے اختتام پر اسی شام نواب وقارالملک کی زیر صدارت مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ کانفرنس کے لئے آئے ہوئے زعماء نے اس میں شرکت کی۔ اجلاس میں نواب سلیم اللہ خان کی کنفیڈریسی کے خاکہ کی بنیاد پر پارٹی کے قیام پر بحث ہوئی اور تمام مسلمان قائدین

نے مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت کے قیام پر اتفاق کیا۔ چنانچہ نواب وقار الملک کی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ رئیس ڈھاکہ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی قرارداد پیش کی جس کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے کی۔ اتفاق رائے سے یہ منظور کر لی گئی اور یوں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ مسلم لیگ کا نام سر محمد شفیع نے تجویز کیا جو قبول کر لیا گیا۔ جن زعماء نے اس جماعت کے قیام میں بھرپور حصہ لیا، ان میں نواب سلیم اللہ خان، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا ظفر علی خان، حکیم اجمل خان، نثار احمد خان، حسین شہید سہروردی، عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا محمد علی، سید غلام حسین غازی، عبدالعزیز، شوکت علی، سید بقاء الحسن، فضل محمد خان، شیخ عبداللہ، عبدالمجید، سید نبی اللہ، عبدالسلام رفیق، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب محمد علی، راجہ نوشاد علی خان، سر رفیع الدین، خورشید جی، عبدالکریم، انوار احمد، ظہور احمد شاہ مصطفیٰ، وزیر حسن، شمشاد احمد، محمد یوسف، چوہدری غلام مصطفیٰ، سید ظہور احمد، نواب علی محمد علی، مولانا حسرت موہانی، راجہ صاحب محمود آباد، نواب محمد اسحاق خان، مولانا شوکت علی، میاں محمد شفیع، عزیز مرزا، سر آغا خان اور بیگم جہاں آراء شاہنواز کے نام قابل ذکر ہیں۔

مسلم لیگ کے قیام کے اغراض و مقاصد درج ذیل تھے:

۱۔ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں انگریز حکومت کی نسبت وفادارانہ خیالات کو پھیلانا اور حکومت کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہو، اس کو دور کرنا۔

۲۔ مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کی نگہداشت کرنا اور آگے بڑھانا اور ان کی خواہشات اور ضروریات کو مودبانہ طریقے سے حکومت کے سامنے پیش کرنا۔

۳۔ مسلم لیگ کے مندرجہ بالا مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانوں میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی طرف معاندانہ ہوں۔ سر آغا خان کو آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا صدر اور نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک دونوں کو اس کا جائنٹ سیکریٹری مقرر کیا گیا اور اس کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں قائم کیا گیا۔ ساٹھ ارکان کی کمیٹی کو لیگ کا دستور مرتب کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس کمیٹی کے سربراہ محمد علی جوہر تھے۔

(پہلا اجلاس):۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت آدم جی پیر بھائی نے کی جن کا نام نواب وقار الملک نے تجویز کیا تھا۔ سر علی محمد خان استقبالیہ کمیٹی کے سربراہ تھے۔ اس اجلاس میں یہ طے ہوا پایا تھا کہ مسلم لیگ کا ایک صدر، چھ نائب صدر، ایک سیکریٹری اور جائنٹ سیکریٹری ہوں گے۔ چالیس ارکان

پر مشتمل ایک مرکزی کمیٹی ہوگی جس کے ارکان مختلف صوبوں سے لیے جائیں گے۔ سب عہدیداروں کی مدت عہدہ تین سال ہوگی، لیکن صوبائی مسلم لیگ کے عہدیداروں کی معیادِ عہدہ پانچ سال ہوگی۔ آئین کی رو سے ہر مسلمان جس کی عمر پچیس سال سے کم نہ ہو اور کم از کم ایک زبان لکھ پڑھ سکتا ہو، مسلم لیگ کا ممبر بن سکے گا۔ اجلاس مجوزہ آئین کی منظوری کے بعد ملتوی ہوگیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو خان بہادر محمد مزمل اللہ خان کی کوٹھی (واقع علی گڑھ) پر منعقد ہوا، جس کی صدارت جسٹس شاہ دین نے کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے عہدیداروں کا باقاعدہ انتخاب عمل میں آیا۔ آغا خان کو مسلم لیگ کا صدر مقرر کیا گیا۔ نواب محسن الملک اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، اس لیے میجر سید حسن بلگرامی کو اعزازی سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ مختلف صوبوں میں مسلم لیگ کو فروغ دینے کیلئے شاخیں قائم کی گئیں۔'' ۲

جیسا کہ اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس زخ ش کے والد نواب مزمل اللہ خان کے یہاں ہوا تھا۔ زخ ش کی عمر اس وقت 14 سال تھی اور وہ لکھنے کی ابتداء کر چکی تھیں۔ اپنے والد سے قربت اور محبت کی وجہ سے ان کے خیالات اور رجحانات سے متاثر ہونا بالکل فطری تھا، جس کا ثبوت ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اپنے ایک خط میں وہ لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھتی ہیں۔

''کیا اچھا ہوتا اگر مسلم لیگ کے ریزولیوشن کی تائید عالم نسواں کا ایک اجتماعِ عظیم کرتا' کامیابی ہو نہ ہو مگر کم از کم فرض تو ادا ہو جاتا۔'' ۳

بین الاقوامی سطح پر بھی مسلمان مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ ترکی کی حکومت بدعنوانیوں کی شکار تھی اور اس کے زیر اثر سارے علاقے میں سیاسی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس دور میں جنگِ طرابلس شروع ہوئی۔

''۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی کے ساتھ جنگ شروع ہوگئی جو ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء تک جاری رہی اٹلی نے جرمنی، آسٹریا، انگلستان، فرانس اور روس کے ساتھ مختلف اوقات میں معاہدے کر کے طرابلس لے لینے کی منظوری حاصل کر لی تھی۔ حملے کے لیے عذر یہ پیش کیا گیا کہ ترک اٹلی کی جانب سے پرامن داخلے میں مزاحمت پیدا کر رہے ہیں۔ ۲۸ ستمبر کو ایک الٹی میٹم بھیجا گیا جسے ترکوں نے رد کر دیا۔ ۵ اکتوبر کو اٹلی نے ایک فوج طرابلس میں اتار دی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے ساحلی قصبے بھی تیزی سے لے لیے۔ ۵ نومبر کو طرابلس کے الحاق کا اعلان کر دیا گیا، اگرچہ ملک قطعاً قبضے میں نہیں آیا تھا۔ ترکی فوج نے انور بے کی سرکردگی میں بہادرانہ مقابلہ کیا۔ عرب انہیں امداد دے رہے تھے۔ بحیرہ احمر اور ساحل شام کے خلاف اٹلی کی بحری

کارروائیاں (جنوری۔فروری ۱۹۱۲ء)۔ متعدد شہروں پر گولہ باری لیکن کارروائیوں میں اس وجہ سے رکاوٹ رہی کہ آسٹریا نے بلقان اور بحیرہ ایجہ کے سواحل پر جنگ کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ بڑی طاقتوں نے مداخلت کی کوشش کی، ترکوں نے طرابلس چھوڑنے سے انکار کردیا اور مداخلت ناکام رہی۔ درہ دانیال کے خلاف اٹلی کا بحری مظاہرہ(۱۶۔۱۹ اپریل)۔ ترکوں نے آبنائیں بند کردیں۔(۴مئی تک) اس سے روسی تجارت کو بہت نقصان پہنچا۔ اٹلی نے جزیرہ روڈ اور دوسرے جزائر دوازدہ گانہ پر قبضہ کرلیا (۴۔۱۶مئی) صلح کے لیے گفت وشنید کا آغاز ماہ جولائی میں ہوا۔ کوئی بھی فریق جھکنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جب بلقان میں جنگ کا خطرہ پیدا ہوا تو ترک مان گئے۔ ۱۸۔ اکتوبر کو معاہدہ ہوا، ترکوں نے طرابلس کی سیادت چھوڑ دی۔ اٹلی کے لیے لازم ہوگیا کہ وہ سلطان کی طرف سے، جو خلیفہ بھی تھا ایک نمائندہ قبول کرے۔ اٹلی نے اس کے مقابلے میں یہ شرط قبول کی کہ ترک طرابلس کو خالی کردیں گے تو جزائر دوازدہ گانہ ترکی کے حوالے کردیے جائیں گے۔'' ۴

جنگ طرابلس کے حوالے سے ''فاطمہ بنت عبداللہ'' اور'' طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں'' جیسی معرکہ آراء نظمیں وجود میں آئیں۔ اقبال کے علاوہ بھی اس دور کے شاعروں نے جنگ طرابلس کے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں ظفرعلی خان اور زخ ش قابل ذکر ہیں۔

ترکی میں حالات دگرگوں تھے اور یورپی طاقتوں کی سازشیں جاری تھیں۔ ان حالات کے نتیجے میں نوجوان ترکوں کی سیاسی جماعت انجمن اتحاد وترقی کی طرف سے حکومت کی پالیسی پر سخت اعتراضات کیے گئے' جس کی وجہ سے ۱۸ جنوری ۱۹۱۲ء کو سلطان نے پہلی بار پارلیمنٹ توڑ دی۔ اپریل میں نئے انتخابات ہوئے جس میں انجمن اتحاد وترقی کو عظیم الشان کامیابی ہوئی' تاہم ایک حلقے میں یہ سمجھا جارہا تھا کہ انتخاب کرانے والوں پر ہرقسم کا دباؤ استعمال کیا گیا ہے۔ حکومت کے خلاف ایک اور بغاوت ہوئی جس کے نتیجے میں ۲۱ جولائی کو غازی احمد مختار پاشا کی کابینہ وجود میں آئی۔ یہ انجمن اتحادترقی کے حامیوں کی حکومت نہ تھی۔نئی حکومت نے 5اگست کو پارلیمنٹ توڑ دی اور مارشل لاء کا اعلان کردیا۔ اسی دوران جنگِ بلقان شروع ہوگئی۔

''اس جنگ میں بلغاریہ، سرویا اور یونان ایک فریق تھے، ترکی دوسرا فریق۔ تھریس کے ایک مقام کرک کلیسی میں بلغاریوں کی فتح (۲۲۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء)۔ کومانووو میں سرویوں کی فتح (۲۴۔۲۶ اکتوبر)۔ لولی برغاس میں بلغاریوں کی زبردست کامیابی (۲۸۔اکتوبر۔۳۔نومبر)۔ بلغاری فوجیں شتلجہ کے خطوط پر پہنچ گئیں جہاں قسطنطنیہ کے دفاع کے آخری مورچے تھے۔ روس کی طرف سے بلغاریہ کو انتباہ کہ قسطنطنیہ پر قبضہ نہ کیا جائے ورنہ روسی بیڑا مقابلہ کرے گا(۳۔۴ نومبر)۔ اہل سرویا شمالی البانیہ کو پامال کرتے ہوئے ایڈریاٹک کے ساحل تک پہنچ گئے(۱۰۔نومبر)۔ سرویا کی فتح مناستر میں (۱۵۔۱۶

نومبر)۔خطوط شتلجہ پر بلغاریہ کا ناکام حملہ (۲۱۔۲۲ نومبر)۔'' ۵

ایسے میں یورپی طاقتوں میں مفادات کا ٹکراؤ ہوا اور ان میں قابض ہونے کے لئے کشمکش شروع ہوگئی۔ آسٹریا نے اعلان کیا کہ سرویا کو ایڈریاٹک کے ساحل پر کوئی علاقہ نہیں دیا جاسکتا اور البانیہ کو آزاد ہونا چاہیے۔ اس نازک بین الاقوامی صورتحال میں سرویا اپنے مطالبے پر قائم رہا۔ روس نے ابتدا میں اس کی حمایت کی اور فرانس نے روس کو یقین دلایا کہ جرمنی کے ساتھ جنگ میں وہ اسے امداد دے گا۔ اٹلی آسٹریا کی حمایت کررہا تھا۔ تھوڑے تذبذب کے بعد جرمنی نے بھی وعدہ کرلیا کہ اگر آسٹریا پر حفاظتی مفاد کے سلسلے میں حملہ ہوگا تو اسے امداد دی جائے گی۔ انگلستان بھی آسٹریا کا ہمدرد تھا اور اس نے روس و فرانس سے تعلقات بگاڑے بغیر جرمنی کے ساتھ مل کر اصلاح احوال کی کوشش کی۔ نومبر اور دسمبر میں حالات بہت نازک ہوگئے۔ آسٹریا اور روس دونوں نے فوجی نقل و حرکت شروع کردی۔ بالآخر روس نے سرویا کے علاقائی دعوؤں کی تائید چھوڑ دی۔

''جنگ کا آخری دور۔ ترکی، بلغاریہ اور سرویا کے درمیان معارکہ (۳۔دسمبر)۔ یونان اس میں شامل نہ ہوا۔ سقوطری کے اردگرد جنگی سرگرمیاں جاری رہیں (مانٹی نیگرو کی جانب سے محاصرہ)۔ جنینہ (یونان کا قبضہ)۔ ادرنہ پر بھی لڑائی ہوتی رہی۔'' ۶

ان حالات میں لندن میں صلح کی کانفرنس ۱۷دسمبر ۱۹۱۲ء کو شروع ہوئی لیکن ناکام رہی کہ ۶ جنوری ۱۹۱۳ء کو ترکوں نے ادرنہ، بحیرہ ایجیہ کے جزائر اور کریٹ کو چھوڑنے سے انکار کردیا۔ ۲۲ جنوری کو بڑی طاقتوں نے ترکوں کو ادرنہ چھوڑنے پر آمادہ کرلیا۔ ۲۳ جنوری کو قسطنطنیہ میں کامل پاشا کی وزارت کا خاتمہ اور انتہا پسند قوم پرور انور بے اقتدار میں آئے۔ جنگ ازسرنو شروع ہوگئی۔ یونانیوں نے جنینہ لے لیا بلغاری ادرنہ پر قابض ہوگئے۔ ۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء کو معرکہ بلغاریوں اور ترکوں کے درمیان ہوا۔ دوسرے محارب فریقوں نے بھی اسے مان لیا۔ مانٹی نیگروں سقوطری پر قابض ہوگیا حالانکہ بڑی طاقتوں نے اسے البانیہ کے حوالے کیا تھا۔ آسٹریا کی طرف سے جنگ کی دھمکی دی گئی تو مانٹی نیگروں نے سقوطری اور سرویا نے ورازو چھوڑ دیے۔ لندن میں ازسرنو صلح کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ بڑی طاقتوں نے صلح کی جو اسکیم منظور کی تھی اسے الٹی میٹم کے ذریعے سے منوایا گیا۔ ۳۰ مئی کو پہلی جنگ بلقان ختم ہوگئی۔ ترکی نے اینوس، اور میڈیا کی درمیانی خط کی مغربی جانب سب علاقے چھوڑ دیے۔ کریٹ پر بھی کوئی حق باقی نہ رکھا۔ البانیہ اور جزائر ایجیہ کے متعلق طاقتوں کا فیصلہ قبول کرلینے پر آمادگی ظاہر کی۔ ان حالات میں دوسری جنگ بلقان شروع ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ سرویا کو ایڈریاٹک کے ساحل پر کوئی علاقہ نہ مل سکا اور بلغاریہ سے وہ مقدونیہ کا جتنا حصہ لینا چاہتا تھا وہ نہ ملا، اس نے یونان سے معاہدہ کرلیا۔ بلغاریہ چاہتا تھا

کہ باہمی جھگڑے کا فیصلہ زار سے کرالیا جائے۔ سرویا اس کے لیے تیار نہ تھا۔ بلغاریہ کے سپہ سالار نے اپنے وزیراعظم کو اطلاع دیے بغیر سرویا اور یونان کے مورچوں پر حملہ کردیا۔ بلغاریہ کی حکومت نے اس حملے سے برات کا اظہار کیا۔ سرویا اور یونان نے صورت حال سے فائدہ اٹھا کر بلغاریہ پر حملہ کر دیا۔ رومانیہ اور ترکی بھی بلغاریہ کے خلاف میدان جنگ میں اتر آئے۔ بلغاریہ کو شکست ہوئی اور بخارسٹ کا صلح نامہ ہوا جس کے مطابق رومانیہ کو شمالی دبروجہ دے دیا گیا، سرویا اور یونان نے مقدونیہ کا متصرفہ علاقہ سنبھال لیا۔ بلغاریہ کے پاس تھوڑا سا علاقہ رہ گیا۔ ترکی اور بلغاریہ کے درمیان ۲۹ ستمبر ۱۹۱۳ء معاہدہ قسطنطنیہ ہوا، جس کے تحت ترکوں نے ادرنہ لے لیا۔

اگرچہ ترکی حکومت بڑی طاقتوں کے دباؤ کے تحت ادرنہ بلقانی ریاستوں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی، تاہم نوجوان ترک اس کے مخالف تھے، انہوں نے انور بے کی سرکردگی میں حکومت پر قبضہ کرلیا۔ محمود شوکت پاشا کو وزیراعظم بنادیا گیا۔ اسی وزارت کے زمانے میں لندن معاہدہ ہوا تھا جس کی بنا پر پہلی جنگ بلقان ختم ہوئی تھی۔

ان حالات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی کیا حیثیت تھی۔ ۱۹۱۴ء میں عالمی جنگ شروع ہوئی ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا اور ہزیمت اٹھائی۔

''پہلی جنگ عظیم کا آغاز ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کے اس واقعہ سے ہوا کہ کسی سلاو (SLAV) دہشت پسند نے آسٹریا کے شہزادہ فرڈیننڈ کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ ۲۸ جولائی کو آسٹریا نے سربیا کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ ۱۵ اگست کو آسٹریا کے رفیق جرمنی کی فوجیں ہالینڈ اور بیلجیئم کے ممالک کو روندتی ہوئی فرانس کی سرزمین تک پہنچنے کی کوشش کررہی تھیں۔ جرمنوں نے فرانس پر حملہ آور ہونے کے لئے جو منصوبہ تیار کیا تھا اس میں یہ قرار پایا تھا کہ فرانس کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ ہوکر فرانس کی راجدھانی پیرس پر اس طرح حملہ کیا جائے جیسے پھیلے ہوئے بازو کی درانتی وار کرتی ہے۔ فرانسیسی فوج کا ہائی کمان اس منصوبے کو نہ بھانپ سکا اور اس نے اپنی مشرقی سرحد پر سے جرمنوں پر ۱۴ اگست کو حملہ کردیا۔ چونکہ یہ حملہ کسی تدبیر و منصوبہ کے تحت نہیں ہوا تھا لہٰذا جرمنوں نے جو پہلے ہی گھات لگائے بیٹھے تھے، ایک بھرپور وار کیا اور فرانسیسی واپس ہٹنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کے بعد جرمنوں نے اپنے حملے کی اسکیم کو، جسے شلفن منصوبہ (SCHLIEFFEN PLAN) کہتے ہیں اور جو ۱۹۰۵ء سے تیار پڑا تھا، عملی جامہ پہنچانا شروع کیا۔ جلد ہی فرانس کے دارالحکومت کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ فرانس کی بدقسمتی سے اس وقت اس کی بے نظیر افواج کی قیادت جافرے کے ہاتھوں میں تھی، جو مدبر سپہ سالار ثابت نہ ہوا۔ انگریزوں کا جرنیل ہیگ (HAIG) بھی جرمنوں کے جرنیلوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا ایسا معلوم ہونے لگا کہ پیرس چند دنوں میں ہی ہار جائے گا۔ مگر عین اس وقت ایک ہوشمند فرانسیسی جرنیل گلینی (GALLIENI) نام کا نمودار ہوا جس نے

جرمنوں پر وہ کاری وار کیا کہ انہیں پریشانی کے عالم میں پیچھے ہٹتے ہی بنی۔ اس کے بعد جرمنوں کی پیش قدمی رک گئی اور آئندہ چار برس تک کبھی تھوڑا سا جرمن بڑھ آتے تو کبھی فرانسیسی۔ مگر انگریزوں نے کوئی خاص کارہائے نمایاں انجام نہ دیا۔ نہ انہوں نے اس وقت تک فاش (FOCH) جیسا جرنیل پیدا کیا تھا جس کی زیر قیادت اتحادیوں کو بالآخر فتح نصیب ہوئی، نہ ان کے سپاہیوں نے وردن (VERDUN) جیسی خونریز لڑائی لڑی جس میں فرانس کے ۳۱۵۰۰۰ آدمی بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ جرمن جرنیلوں میں سب سے زیادہ نام جن اشخاص نے پایا وہ لوڈنڈارف (LUDEN DORFF) اور ہنڈنبرگ (HINDENBURG) تھے۔ فرانسیسی جرنیلوں میں فاش اور پیتان (PETAIN) قابل ذکر ہیں۔ انگریزوں میں لارڈ ایلن بی (ALLENBYE) ہے۔ اس جنگ میں ایک طرف جرمنی (آسٹریا ہنگری سلطنت)، ترکی اور بلغاریہ، اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی، رومانیہ، پرتگال، جاپان اور امریکا تھے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی نے جنگ بند کردی اور صلح کی درخواست کی۔ ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو فریقین کے مابین ورسائی کے مقام پر صلح کا معاہدہ ہوگیا۔ جنگِ عظیم میں دونوں فریقین کے تقریباً ایک کروڑ آدمی کام آئے اور دو کروڑ کے لگ بھگ ناکارہ ہوگئے۔''......؎

ان حالات میں ہندوستان کے مسلمان مسلسل اضطراب اور بے چینی کا شکار رہے۔ ان کے دل اپنے ترک مسلمان بھائیوں کے ساتھ تھے۔ ۱۹۱۱ء کے بعد مسلمانان ہند نے ترکی کے مستقبل اور مسلمانوں کے متبرک مقامات کی حفاظت کے لئے اپنی تشویش کا اظہار تین طریقوں سے کیا۔ اس وقت کے اردو ادب کے ذریعے، اردو اخبارات کی اشاعت کرکے اور مادی اِمداد کرکے۔ اس دور کے اردو ادب میں بھی مغربی سامراج کی سخت تنقید کی گئی اور مسلم کش پالیسی پر افسوس کا اظہار اور احتجاج کیا گیا۔ شبلی نعمانی، اکبرالٰہ آبادی اور اقبال کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اس دور میں مولانا ظفرعلی خان اخبار زمیندار، مولانا محمدعلی جوہر کے ہفت روزہ کامریڈ اور روزنامہ ہمدرد، ابوالکلام آزاد کے الہلال جاری ہوئے۔ ان اخبارات نے انگریز حکومت کی پالیسیوں اور ہندوستان کے باشندوں خصوصاً مسلمانوں سے بدسلوکی کے خلاف بطور احتجاج صاف صاف الفاظ میں ایسے مضامین لکھے کہ قصرِحکومت کے ایوان لرز اٹھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران مولانا محمدعلی جوہر، مولانا محمد شوکت علی اور ابوالکلام آزاد اپنی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے کئی دفعہ گرفتار ہوئے اور اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہوتا رہا، لیکن ان صاحبان نے اپنی روش نہ بدلی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی کی حمایت میں یہاں کئی تحریکیں چلیں جن میں تحریک خلافت بہت اہم ہے۔ ترکی کی اعانت کے لیے چندہ جمع کیا گیا اور بلقان کی جنگوں کے دوران ایک طبی مشن ترکی روانہ کیا گیا۔

۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو ترکی کی جرمنی کی حمایت میں جنگ میں شمولیت کے فوراً بعد وائسرائے ہند نے حکومت

انگلستان کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ یہ جنگ سیاسی ہے اور اس میں کوئی مذہبی سوال شامل نہیں ہے۔ حکومت نے یہ وعدہ بھی کیا کہ مسلمانوں کے متبرک مقامات کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان سے مسلمانوں کو وقتی طور پر تسلی ہوگئی لیکن جب وقت گزرنے کے ساتھ جنگ کا پانسہ ترکی کے خلاف ہونے لگا اور مصر میں اتحادیوں کی فوجیں داخل ہوگئیں تو ہندوستان کے مسلمان ترکی کی خلافت اور اپنے متبرک مقامات کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوگئے۔ مولانا عبدالباری نے ایک فتوے پر ۵۰۰ عالموں سے دستخط کروائے اور وائسرائے ہند کے پاس روانہ کردیا۔ اس میں خلافت کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کیا گیا تھا اور کہا تھا کہ مسلمان اپنے مقدس مقامات کی بے حرمتی برداشت نہیں کریں گے۔ ۱۹۱۶ء میں محمد میاں انصاری، حجاز کے ترکی گورنر غالب پاشا کی طرف سے جہاد کا پروانہ لے کر ہندوستان آیا۔ اس ہندوستان کے کچھ علاقوں میں تقسیم کردیا گیا جس سے مسلمان بے چین ہوگئے اور سیاسی اضطراب بڑھ گیا۔ انگریزوں کے مخالف جذبات بڑھنے لگے۔ ۱۹۱۶ء کے اختتام پر محمد علی اور شوکت علی کو گرفتار کرلیا گیا۔ آپ دونوں بھائی ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء تک جیل میں رہے۔

جنگ عظیم اول ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی اور اس میں اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی میں ایک قرارداد میں کہا گیا کہ صلح کی شرائط طے کرتے وقت مسلمانانِ ہند کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ ان کے مطالبات تھے کہ ترکی اور اسلام کے متبرک مقامات میں کوئی غیرملکی طاقت دخل نہ دے۔

مئی ۱۹۱۹ء میں صلح نامہ شرائط کا فیصلہ کرنے کی کانفرنس میں ترکی کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے جو تجویز پیش کی گئی، وہ ان تمام وعدوں کے برعکس تھی جو انگریز حکومت مسلمانانِ ہندوستان سے کرتی رہی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ عراق، شام اور فلسطین کا انتظام حکومت برطانیہ کے سپرد کردیا جائے۔ اڈ ولیا اور سمرنا کو بالترتیب اٹلی اور یونان کے سپرد کردیا گیا۔ تھریس اور قسطنطنیہ کو بین الاقوامی شہر بنادیا گیا۔ یہ شرائط کے لیے بہت سخت اور ذلت آمیز تھیں۔ خلافت کو بالکل محدود کردیا گیا اور اسلامی علاقوں پر غیر اسلامی حکومتوں نے قبضہ کرلیا۔

اس سلسلے میں زرخ ش اپنا نقطۂ نظر رکھتی تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں وہ لیلیٰ بانو کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''اگر میں اس مظلوم فرقے کی فرد نہ ہوتی جس کا پالیٹکس میں دخل دینا مسلمانوں کے نزدیک کفر وشرک یا گناہِ کبیرہ ہے۔ اگر میں سمجھتی کہ میرا کمزور دستِ عمل کسی نہ کسی صورت پتھر میں جونک لگا سکتا ہے تو کیا ممکن تھا کہ میں اپنے پیارے بھائیوں کو اُن کی چھبل سالہ سیاسی کجروی پر متنبہ نہ کرتی۔ تم کیا جان سکتی ہو کہ میری پیچ کاری پر میرا نفس کس قدر ملامت کرتا ہے۔

نہ اپنے نہ اسلام کے کام آئی
یہ شکوہ ہے جانِ حزیں سے قضا کو

بے شک پہلے میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ لوگوں کو مصائب اسلامیہ کا اچھی طرح احساس ہوگا مگر بہن وائسرائے اور دوسرے حکام بالا کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری آواز پریذیڈنٹ ولسن اور اراکین مجلس صلح کے گوشۂ مبارک تک پہنچے اور برطانوی اربابِ حل وعقد کو ازیاد رفتہ وعدہ یاد دلایا جائے جو انہوں نے اسلامی مقدس مقامات کی بابت کیا تھا۔''

جب ہندوستان کے مسلمانوں کو ان شرائط کا علم ہوا تو انہوں نے شدید غم و غصے کا مظاہرہ کیا۔ لندن میں مسلمان قائدین سید امیر علی' سر آغا خان اور عباس علی بیگ نے حکومت انگلستان کو ایک اجتماعی یادداشت پیش کی جس میں مطالبہ کیا کہ ترکی' تھریس اور قسطنطنیہ کو سلطان ترکی کی حاکمیت میں رہنے دیا جائے اور کسی غیر ملکی طاقت کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی لندن شاخ کے سیکریٹری سیٹھ یعقوب حسن نے بھی اسی قسم کی یادداشت وزیر اعظم برطانیہ کو پیش کی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اگر قسطنطنیہ ترکی سے لیا گیا تو مسلمان اسے اسلام پر عیسائیت کا سوچا سمجھا حملہ تصور کریں گے۔

مسلمانان ہند نے خلافت کے متعلق اپنے مطالبات پیش کرنے کے لیے ۵ جولائی ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم کی۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیل میں تھے۔ اس کمیٹی کو معرض وجود میں لانے کے لیے عبدالباری' حکیم اجمل خان' ڈاکٹر ایم اے انصاری' سیٹھ چھوٹانی' ممتاز حسین اور ظفر الملک کے نام نمایاں ہیں۔ خلافت کمیٹی کی شاخیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں قائم کی گئیں۔ اس کمیٹی کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ترکی کی قسمت کے سلسلہ میں جو روز روز واقعات رونما ہوں' ان سے ہندوستانی مسلمانوں کو باخبر رکھا جائے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی کا مرکزی سیکریٹری حاجی محمد صدیق اور صدر سیٹھ چھوٹانی مقرر ہوئے۔ جب مولانا شوکت علی جیل سے رہا ہوئے تو آپ نے سیکرٹری کا عہدہ سنبھال لیا۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام پہلی خلافت کانفرنس ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ دوسری قوموں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں کو بھی دعوت نامے جاری کیے گئے۔ گاندھی کے علاوہ کانگریس کے کچھ اور اراکین نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ گاندھی جی نے خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کو اپنی مکمل اور غیر مشروط حمایت کا یقین دلایا۔ کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمان جنگ میں فتح کی خوشی میں منعقد ہونے والے جشن کی تقریبات میں شرکت نہیں کریں گے اور برطانوی چیزوں کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ اگر خلافت کے سلسلہ میں حکومت نے مسلمانوں کے مطالبات پر

بھی غور نہ کیا تو حکومت سے عدم تعاون شروع کر دیا جائے گا۔ مہاتما گاندھی نے بھی ان اقدامات کے حق میں تقریر کی۔

اس کانفرنس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری ہفتہ میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس ایک ساتھ امرتسر میں منعقد ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیل سے رہا ہو کر ۳۱ دسمبر کو سیدھے امرتسر آئے جہاں ان کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ کانگریس نے خلافت کمیٹی کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں نے خلافت کے تحفظ کے لیے ہر قربانی دینے کے عزم کا اعادہ کیا۔

۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک نمائندہ وفد نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کی اور خلافت اور مقدمات مقدسہ کے بارے میں مسلمانانِ ہند کا نقطہ نظر پیش کیا۔ وائسرائے نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے واضح کیا کہ ترکی کی قسمت کا فیصلہ صرف انگلستان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں یورپ گیا۔ وفد کے دیگر اراکین کے نام یہ تھے۔ سید سلیمان ندوی، سید حسین اور حسن محمد حیات۔ بعد میں دو اور افراد اس وفد میں شامل ہو گئے۔ یہ بنگال کے مولوی ابوالقاسم اور بارابنکی (یوپی) کے مشیر حسین قدوائی تھے۔ اس وفد نے پیرس، لندن اور دیگر یورپی صدر مقامات پر خلافت کے مسئلہ اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے بارے میں مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کر کے رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن وفد کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔

۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو اتحادی طاقتوں نے ترکی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ مسلمانانِ ہند کے مطالبات اور جذبات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ ترکی کے سلطان کے اقتدار کو بحال کرنے کی بجائے ترکی کے خالص ترکی آبادی والے علاقوں کے بھی حصے بخرے کر کے دوسروں میں بانٹ دیا۔ یہ فیصلہ مسلمانانِ ہند پر بجلی کی طرح گرا۔ ۲۸ مئی ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مہاتما گاندھی اس تحریک میں پیش پیش تھے عدم تعاون کے لیے چار مرحلوں پر مشتمل عملی پروگرام پیش کیا گیا تھا:

۱۔ ترک خطابات اور حکومت کے تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا مقاطعہ

۲۔ پولیس اور فوج کے علاوہ حکومت کے باقی سب محکموں سے استعفیٰ۔

۳۔ پھر پولیس اور فوج سے علیحدگی۔

۴۔ ٹیکس دینے سے انکار۔

مہاتما گاندھی نے اس بات پر زور دیا کہ اس تحریک کے دوران تشدد سے پرہیز کیا جائے گا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے خصوصی اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوئے تاکہ عدم تعاون کے پروگرام کو موثر طور پر چلانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ دسمبر ۱۹۲۰ء کے ناگپور کے سالانہ اجلاس میں کانگریس نے عدم تعاون کے حق میں قرارداد منظور کرلی۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ مسلمانوں میں قائداعظم محمد علی جناح اور سر فضل حسین عدم تعاون کی تحریک کے حق میں نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ تحریک ناقابل عمل تھی اور اس سے تشدد اور جھگڑا پیدا ہوگا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اس تحریک کی اس لیے حمایت نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں گاندھی ایک غلط سمت میں بڑھ رہے ہیں۔ یہ تحریک کسی وقت بھی باشعور ہاتھوں سے نکل کر تباہی و بربادی اور فساد پیدا کرسکتی ہے۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کردیا کہ ان کا خدشہ درست تھا اور اس کا انجام تشدد ہی ہوا۔ اس اجلاس کے بعد عدم تعاون کے پروگرام پر عمل شروع کردیا گیا۔ جمعیت العلماء نے ایک فتویٰ جاری کیا اور مسلمانوں کو انتخابات، حکومت کے اسکولوں اور کالجوں اور عدالتوں کا مقاطعہ کرنے اور خطابات واپس کرنے کی تلقین کی۔ اس فتویٰ پر ۴۲۵ عالموں کے دستخط تھے۔ بعد میں مزید ۴۷۰ علماء نے دستخط کردیئے۔

عدم تعاون مکمل سوراج اور اور خلافت کی تحریک بہت تیزی سے مقبول ہوگئی۔ عدم تعاون کے پروگرام کے مختلف مراحل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رضاکاروں کی بھرتی شروع کی گئی۔ حکومت نے رضاکاروں کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ۸،۹ اور ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ اس میں تقریباً پانچ ہزار نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں۔ چند قابل ذکر قراردادوں کا خلاصہ یہ ہے۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کانفرنس سلطان ترکی سے اپنی وفاداری کا اعلان کرتی ہے اور انہیں یقین دلاتی ہے کہ مسلمان اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ خلافت کے متعلق اپنے مطالبات منظور نہیں کروالیں گے اور جب تک خلافت کے تحفظ، عرب علاقوں اور متبرک مقامات کا وقار بحال نہیں کریں گے جو کہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، وہ نہ ہی امن سے بیٹھیں گے اور نہ یہ مسئلہ اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں میں رہنے دیں گے۔ قرارداد میں ذیلی کمیٹیوں سے کہا گیا کہ وہ اس قرارداد کی روشنی میں اپنے عزم کا ایک بار پھر اعادہ کریں۔ مزید یہ کانفرنس غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت کو اسلام کے قوانین کو سربلند کرنے کی کوشش کرنے پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور یہ اجلاس دعا کرتا ہے کہ یہ جلد غیرملکوں کی فوجوں کو ترکی کی سرزمین سے باہر نکال دیں۔ جلسے میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج میں نوکری کرنا مذہباً غلط ہے۔ یہ تمام مسلمان خصوصاً علماء کا فرض ہے کہ یہ بات فوج میں ہر مسلمان تک

پہنچائی جائے۔ مزید اگر برطانوی حکومت نے انگورا کی حکومت کے خلاف بلاواسطہ یا بالواسطہ کھلم کھلا خفیہ فوجی کارروائی کی تو مسلمانان ہند قانون شکنی پر مجبور ہوجائیں گے اور کانگریس سے مل کر ''جمہوریہ ہندوستان'' کے قیام کے لیے تحریک سول نافرمانی شروع کردیں گے۔

ان قراردادوں کی وجہ سے حکومت ہند نے مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دیگر رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ ان قائدین کو دو سال قید سخت کا حکم سنایا گیا لیکن سول نافرمانی کی تحریک پورے زور سے چلتی رہی۔ پرنس آف ویلز کی آمد (نومبر ۱۹۲۱ء) پر بمبئی میں سخت ہنگامہ ہوا اور ایک اندازے کے مطابق ۵۳ افراد ہلاک ہوگئے ۱۹۲۱ء کے آخر تک گاندھی کے علاوہ تحریک خلافت کے تمام سرکردہ رہنما جیل میں تھے۔

اسی دوران جنوبی ہندوستان میں مالابار کے موپلوں نے بغاوت کی۔ ۲۶ اگست ۱۹۲۱ء کو مالابار کے متاثرہ علاقے میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ ساتھ ہی ہندو مسلم فسادات بھی رونما ہونے لگے۔ عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک بھی پر امن نہ رہ سکی۔ ضلع گورکھپور کے ایک مقام چوراچوری میں ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو کانگریس کے رضاکاروں نے پولیس اسٹیشن کا محاصرہ کرلیا اور آگ لگادی۔ پولیس اسٹیشن میں پولیس کے ۲۱ ملازمین موجود تھے جو وہیں جل گئے۔ اس واقعہ سے پورے ملک میں خوف و ہراس پھیل گیا مہاتما گاندھی نے اس پر تشدد واقعہ کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو اچانک یہ تحریک ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ مہاتما گاندھی کا یہ فیصلہ کافی حیران کن تھا۔ ان کے کانگریس کے ساتھیوں نے بھی اس یکطرفہ فیصلے پر حیرانی اور افسوس کا اظہار کیا۔

زخ ش نے اس تمام دور کے حالات و واقعات کو ایک باشعور اور حساس شاعرہ کی حیثیت سے نہ صرف محسوس کیا بلکہ ان پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتی رہیں۔ وہ سیاسی نظریات میں مسلمانوں کی ہمنوا تھیں۔ موپلوں کے لئے وہ اپنے روزنامچے میں لکھتی ہیں۔

''موپلاؤں کی شجاعت اور حمیت اسلامی متحیر کر رہی ہے۔ مگر افسوس نہایت افسوس ہے کہ ان کے دماغ اور عقل نے دھوکہ دیا۔ یہ محل و مقام جہاد سیفی کا نہیں اگر خدا نے ایسی ہی توفیقِ شہادت مرحمت فرمائی تھی تو مشرق قریب کا مشہد عظیم حاضر تھا، جاتے اور جنت کماتے۔'' ۸

اسی طرح وہ مہاتما گاندھی کی ترک موالات کی تحریک سے بھی متفق نہیں تھیں، مگر سودیشی تحریک کی حامی و پیروکار تھیں۔ اس سلسلے میں ان کے روزنامچے میں خیالات دیکھئے۔

''اگر چہ ترکِ موالات کے طریقِ عمل سے بعض صورتوں میں مجھے اختلاف ہے، اور نظام تحریک میں بھی تعلیمی مقاطعہ کو میں قابلِ اعتراض سمجھتی ہوں، مگر اس اہم اور اعلیٰ اقدامِ حریت سے اُصولاً مجھے اتفاق ہے، اور سودیشی تحریک پر تو میں عاشق ہوں، آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے۔ اب چونکہ تازہ واقعات نے بدیسی مال سے ناقابل برداشت نفرت پیدا کردی ہے اس لیے ان تمام مشکلات پر کامل غور کرنے کے بعد کبھی بدیشی کپڑا نہ خریدوں گی۔ کھدر کا ہر ممکن موقع پر استعمال کروں گی اور ہر قسم کا بدیشی مال کم سے کم تعداد میں خریدوں گی۔ اس اُصول کی مجملی تفصیلات بھی مرتب ہوگئی ہیں جو یہ ہیں ۔چونکہ از سرتاپا کھدر سے ملبوس ہونا خاندانی قیود اور والدِ ماجد کے مرتبے و خیالات کے خلاف ہے اس لیے سردست لباس کے استر وغیرہ میں اور تمام استعمالی کپڑوں مثلاً لحاف، توشک، میز پوش میں کھدر استعمال ہوگا۔ پہننے کے کپڑے باریک، دیسی ساخت کے ہُوا کریں گے۔ پرانے کپڑے جلادینے کے بارے میں مجھے گاندھی جی سے اختلاف ہے۔ اس لیے نہایت جبر، نہایت اکراہ، نہایت حقارت کے ساتھ اس عظیم ذخیرے لباس کو ختم ہونے تک استعمال کروں گی، مگر حتی الامکان گھر کو اس ناپاک چیز سے جلد تر پاک کرنے کی صورتیں نکالوں گی۔ دیسی کپڑے کی خرید اور استعمال آج ہی سے شروع ہوجائے گا۔ چرخے کا پیشہ بھی گھر میں رائج کروں گی۔ اے میرے مولا اس نیک ارادہ میں میری مدد کر تو جانتا ہے کہ اس عہد نے میری مشکلات میں ایک عظیم اضافہ کردیا ہے۔ اے میرے مہربان مولا! میرے پیارے باپ کو مجھ سے متفق الرائے کردے یا کم سے کم انہیں حکم دے کہ اس معاملے میں میری مخالفت نہ کریں تاکہ دیسی مال کی بہم رسانی اور استعمال آسان ہوجائے۔ اے میرے بہت ہی مہربان مولا! تو یہ بھی جانتا ہے کہ باپ کی محبت (جو تیری ہی پیدا کی ہوئی ہے) اور باپ کی اطاعت (جو تیرے ہی حکم پر مبنی ہے) حائل نہ ہوتی تو میں سادہ زندگی بسر کرنے کا ارمان ضرور پورا کرتی اور کسی دشواری کو خاطر میں نہ لاتی......''......۹

زخ ش اپنے عہد کے حالات کی خاموش ناظر نہیں رہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری، مضامین اور خطوط میں اس عہد کو قلم بند کیا ہے۔ اپنے ہم عصروں کو ان حالات کی طرف متوجہ کرنے کیلئے انہوں نے بار بار اپیل کی ہے۔انیسہ خاتون شروانیہ لکھتی ہیں

''باعتبار سنین کانپور کا واقعہ ہائلہ ترکی کی جنگِ طرابلس کے بعد رونما ہوا تھا۔ زاہدہ خاتون کے دل میں مذہبی بیداری کی اولین لہر اسی لڑائی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ جو والہانہ عقیدت و محبت مسلمانانِ عالم کے دل میں تھی۔ اس پر اٹلی کی حریصانہ فوج کشی نے اور بھی تازیانہ لگادیا۔ مرحومہ کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ ایک عزیز ترین اسلامی سلطنت سے ایک فریب کار یوروپی طاقت کا صرف ہوسِ ملک گیری کے لئے تصادم ہورہا تھا۔ مسلمانوں

کے کان اس وقت علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے ان اشعار کی غمناک لے سے گونج رہے تھے۔

زوال دولتِ عثمان زوال شرع و ملت ہے
عزیزو۔ فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

زخ ش بھی ان صداؤں پر تہ دل سے لبیک کہہ کر آلِ عثمان کی امداد کے لئے تیار ہوگئیں اور دامے درمے قلمے سخنے اپنی تمام مساعی کو ترکوں کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے کہا

جاتا ہے ذہن ترکی بیمار کی طرف
آتی ہے جب کہیں سے صدا آہ آہ کی

۱۰
......

علاوہ شاعری کے انہوں نے عملی طور پر چندے کی کئی قسطیں زمیندار' انجمن' خاتونان ہمدرد' لاہور اور دیگر ذرائع کو روانہ کیں اور حسب عادت اپنے حلقہ احباب و اعزہ میں نہایت سرگرمی سے ترکوں کی امداد و اعانت کا پروپیگنڈہ کرتی رہیں۔ اس سلسلے میں پھوپھی زاد بہن انیسہ خاتون شیروانیہ کے نام خطوط سے اقتباس دیکھئے۔

''......ہم تو اپنی جیبِ خاص سے سات سات روپیہ دیں گے۔ اتنا ہی تم دو اور بہت جلد دو۔ پس وپیش نہ کرو۔ مونسہ اور پھوپھی اماں صاحبہ سے بھی ضرور دلواؤ اور یاد رکھو کہ یہ جہاد بالمال ہے۔ ایسا موقعہ پھر نہ آئے گا۔ کیوں کہ بڑے بڑے جید علماء نے اس جنگ کو جہادِ اصلی قرار دیا ہے۔ آج تک ترکی کی یورپ سے ہزار ہا لڑائیاں ہوئیں مگر فتوائے جہاد صرف اسی لڑائی پر ہوا ہے کیوں کہ اس میں گروہ کفار خود چڑھ کر آیا ہے اور بے شمار مسلمان' ضعیف' بچے مرد عورتیں سب بالکل بے گناہ شہید کئے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کا قتل عام بھی صرف اسی کارزار میں ہوا ہے۔ آزمائش حب اسلام کا موقعہ اس سے بڑھ کر دستیاب نہیں ہوسکتا......مونسہ کو سلام اور سوال شرکت جہاد طرابلس اور مضمون واحد بخدمت عمہ محترمہ''

ایک دوسرے خط کا اقتباس

''۵ نومبر ۱۹۱۲ء۔ بہن۔ آج ہمارے ہاں بفضلہ تعالیٰ جوش اسلام کا عجیب وغریب منظر نظر آ رہا ہے۔ ابھی ابھی بہن فاطمہ بیگم (فاطمہ بیگم صاحب بنت مولوی محبوب عالم ایڈیٹر اخبار شریف بی بی لاہور) کے دو خطوط نیز سیکریٹری صاحبہ (سعیدہ احسان الحق صاحبہ مرحومہ سیکریٹری انجمن خاتونان ہمدرد لاہور) کا خط موصول ہوا ہے کہ خدا کے لئے مسلمان مریضوں کو گلنے سڑنے سے بچاؤ۔ ان میں سے دو خطوط بغرض مطالعہ ملفوف کرتی ہوں۔ تم کو ان سے معلوم ہوگا کہ 6 نومبر کو

بروز چہارشنبہ انہوں نے ہم سے بذریعہ تار مالی امداد طلب کی ہے ۔ یہ کس قدر دشوار کام تھا۔ مگر ہم نے توکل بخدا کام شروع کیا گھر میں کوئی چھوٹا بڑا نہ تھا جس نے حیثیت اور امید سے زیادہ چندا نہ دیا ہو۔'' جنگ کے متاثرین کی امداد کے لئے انہوں نے ایک بے حد اثر انگیز نظم خواتین سے مخاطب ہوکر لکھی جس کا عنوان تھا ''اپیل''۔ یہ نظم شریف بی بی لاہور میں ۲۸ مارچ ۱۹۱۳ء تہذیب نسواں لاہور میں اپریل ۱۹۱۳ء پردہ نشین آگرہ میں فروری ۱۹۱۲ء میں چھپی اور ذرا سی ترمیم کے ساتھ ان کے مجموعہ فردوس تخیل میں شامل ہے۔

جب ترکوں نے مجبوراً اٹلی سے صلح کی اور شرائط صلح میں طرابلس کے الحاق کا اعلان ہوا تو زاہدہ خاتون نے بڑے دکھ سے لکھا

''بہنو تم نے عدیم المثال اندھیر کا حال تو سن ہی لیا ہوگا کل پائینر میں رپورٹر کا تار شائع ہوا ہے کہ ترکوں نے بہ عوض تاوان جنگ الحاق طرابلس منظور کرلیا۔ خدائے حاضر و ناظر کی قسم مجھے عظیم صدمہ ہوا ہے اور رات کو میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ شب بھر شدید پریشانی رہی ۔ اس واقعہ پر انہوں نے ایک رباعی لکھی ہے جس میں تاریخ بھی نکالی ہے۔ یہ رباعی ان کے مجموعہ میں شامل ہے۔اس رباعی میں بکا کے اعداد کے ساتھ طرابلس ملانے سے الحاق طرابلس کا سال ۱۳۳۰ھ برآمد ہوتا ہے۔

کیا پوچھتے ہو آہ سراغ طرابلس — گل چیں ہوا ہے قابض باغ طرابلس
نزہت جو پوچھے حادثہ جانگسل کا سال — کہہ دو بکا کے ساتھ ہے داغ طرابلس

!!.....

جنگ طرابلس' جنگ بلقان' پہلی جنگ عظیم ان کا موضوع بنی ۔ نظمیں 'بصائر سیاسیہ (زمیندار لاہور۔۱۵اپریل ۱۹۱۲ء) ظہور امام(نظام المشائخ ۔دہلی ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ) 'معارف ملیہ (شہر منظوم ۔ستمبر ۱۹۱۱ء)'عالم خواب(خاتون علی گڑھ ۔جنوری ۱۹۱۲ء)' اپیل (شریف بی بی ۔لاہور مارچ ۱۹۱۲ء)'شہر آشوب اسلام(خاتون علی گڑھ ۔ اپریل ۱۹۱۳ء)' زندہ باد انور پاشا(خاتون علی گڑھ ۔مئی ۱۹۱۲ء)' جنگ فرنگ (تہذیب نسواں۔ اپریل ۱۹۱۳ء)اس عہد کی بین الاقوامی سیاست اور مسلمانوں کی پریشانی کا احاطہ کررہی ہیں۔اس دور میں اخبار زمیندار جس میں ز خ ش کی نظمیں باقاعدگی سے چھپتی رہتی تھیں زیر عتاب آیا۔ واقعہ کی تفصیلات میں امداد صابری لکھتے ہیں۔

''جنگ بلقان میں ابتداء میں ترکوں کو شکست ہوئی۔مخدومیہ البانیہ اور ایڈریانوپل ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔اس وقت مصطفیٰ کامل' مدارالہام نہایت ذلیل شرائط پر مصالحت کیلئے آمادہ ہوگئے جس سے ترکی میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔انور پاشا طرابلس سے

ترکی پہنچے ۔ انہوں نے انجمن اتحاد و ترقی کے جھنڈے تلے چند رفقاء کو جمع کر کے ایوان وزارت پر دھاوا بول دیا اور مصطفیٰ کامل کی وزارت کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا اور انور پاشا نے عنان حکومت سنبھال کر بلقانی ریاستوں پر حملہ کر دیا۔

انور پاشا کی اسکیم تھی کہ اسلامی سلطنتوں کو ان کی مدد کرنی چاہئے اور ہندوستان میں علی الاعلان کانگریس کی تحریک کی امداد کرنی چاہئے۔اس کے ساتھ خفیہ سوسائٹیاں ہونی چاہئیں جن کو اسلحہ فراہم کیا جائے طلعت پاشا نے مولانا ظفر علی خان سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کیا۔اس کے بعد خان زمان پاشا' غازی انور پاشا اور طلعت پاشا کے درمیان طویل مذاکرات ہوئے جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی کی بنیادوں پر ایک تحریک ہندوستان میں شروع کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولانا ظفر علی خان اس تحریک کے ہندوستان میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔مولانا ظفر علی خان لندن سے اخبار زمیندار کو مضامین بھیجا کرتے تھے۔''.....۱۲

مولانا ظفر علی خان کے مضامین اور سرگرمیوں کی وجہ سے اخبار زمیندار کی ضمانت طلب کی گئی اور جنوری ۱۹۱۴ء میں ۲ ہزار کی ضمانت ضبط ہوئی اور ۱۰ ہزار روپے کی نئی ضمانت مانگی گئی اور زمیندار کا پریس بھی ضبط ہونے کا حکم سنایا گیا۔ اس موقع پر مولانا ظفر علی خان کی جانب سے ہندوستان کے پریس میں یہ بیان شائع ہوا ''زمیندار کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ پریس کی دھمکی اس کی موت سبب نہ بنے گی اس سے دو ضمانتیں پہلے مانگی جا چکی ہیں۔ ایک نئے قومی جذبے سے سرشار قوم نے زمیندار کو زندہ رکھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس دفع بھی زمیندار کو قوم روپیہ دے گی اور یہ زندہ رہے گا۔

زاہدہ خاتون شروانیہ نے اس موقع پر ضمانتی چندوں میں حصہ لیا اور اپنے ایک شعر میں اس طرح اظہار خیال کیا۔

ضامن ہستی اسلام تو ہے ذات خدا
پھر زمیندار سے مانگی ہے ضمانت کیسی

اس حوالے سے ان کی ایک پر اثر تحریر دیکھئے۔

''لیکن آج کل میری غیر معمولی پریشانی کا باعث وہ آفت ناگہانی ہے جو عزیز زمیندار کی ضبط کی گئی پریس کی شکل میں نازل ہوئی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں مجھے اس واقعہ ہائلہ سے ایسا صدمہ ہوا ہے کہ میں خود بخت حقیر ہوں۔وفور غم کا باعث شاید یہ ہو کہ باوجود یہ کہ ''الہلال'' میری جان اور ''ہمدرد'' مجھے بے حد عزیز ہے۔لیکن جو خصوصیت

مجھے اس مرحوم (آپ کی مراد مرحوم اخبار) سے تھیں وہ کسی اور سے نہیں اور یہ تخصیص اس کی مظلومیت اور محسومیت کی وجہ سے تھی کوئی اخبار شائد دنیا میں ایسا محسود عالم نہ ہوا ہوگا جیسا کہ میرا زمیندار تھا۔ افسوس بھائی ظفر کے دل پر عالم غربت میں کیا گزرتی ہوگی۔ بارہ ہزار کی ضمانت کا قرض ابھی ادا ہوا ہی نہ تھا کہ تقریباً بیس ہزار روپے کا یہ دھچکہ اور لگا۔ کل پیسہ اخبار نے یہ جدید خبر سنائی کہ زمیندار پریس پہلے ہی قرضے میں مکفول تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قرض خواہ اپنے فوائد کیلئے کیا کارروائیاں کرے۔'' ۱۳

ظفرعلی خان کا ذکر اسی خلوص کے ساتھ اُن خطوط میں بھی بار بار آتا ہے جو انہوں نے لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھے۔ ان کی تفصیلات آگے کے ابواب میں آئے گی۔

اسی دوران مسجد کانپور کے وضوخانے کے انہدام کا واقعہ پیش آیا۔ جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے اور ان کا اضطراب اپنے عروج کو پہنچا۔ اس واقعے کی تفصیلات امداد صابری نے اس دور کے اخباروں کے حوالوں سے مرتب کی ہیں۔

''جون ۱۹۱۳ء کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کانپور میں ایک نئی سڑک نکل رہی ہے جس کا نام اے بی روڈ ہے یہ سڑک کلس بازار اور مچھلی بازار سے ہوتی ہوئی مول گنج جائے گی۔ مچھلی بازار میں ایک مسجد تھی جو اس سڑک میں آرہی تھی اس کے بارے میں امپرومنٹ ٹرسٹ کمیٹی نے یہ تجویز پاس کی کہ مسجد کا شرقی حصہ لے لیا جائے اور اس کے عوض میں مسلمانوں کو مسجد کے مغربی حصہ میں زمین کا ایک ٹکڑا دیدیا جائے۔'' اس فیصلہ کے خلاف کانپور کے مسلمان ضلع مجسٹریٹ کے پاس گئے دیگر حکام سے بھی ملے۔ انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی تو اس اسٹیج پر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے ایک طویل مقالہ افتتاحیہ ۱۱ جون ۱۹۱۳ء کے شمارے میں تحریر فرمایا' مسجد کے سلسلہ میں جو کچھ ہو چکا تھا اس پر روشنی ڈالنے کے بعد کانپور کے خواص سے نہیں بلکہ عوام کو حسب ذیل مشورہ دیا تھا۔

عہد رسوا عہد' امید و توقع' سعی و سفارش' آہ وزاری غرض تمنا اور امروز و فردا تا کجے۔؟ اور غفلت واہمال تا کجا؟ کچھ عجب نہیں کہ عمائدین کانپور کو اپنی دعا ہائے اقبال دولت اور گدایاز التماسات ومعروضات سے فرصت نہ ملے اور اسلام کی ناموس وعزت کا جو کچھ فیصلہ ہونے والا ہے ہوجائے۔ ہمارا تخاطب اس وقت عمائد کانپور سے نہیں بلکہ وہاں کی عام پبلک سے ہے ہمکو تازہ ترین حالات معلوم نہیں' لیکن آخری اطلاعات تک حالات بدستور تھے۔ اگر انہیں اپنی مسجد کا بھی وہی حال دیکھنا منظور نہیں' جو حال میں ان کے سامنے ایک مندر کا ہو چکا ہے تو خدارا آنے والے وقت کو محسوس کریں اپنی اور اپنی مسجد مقدس کی عزت کی حفاظت کو ارباب دولت و جاہ و رسوخ کے ہاتھوں میں بالکل چھوڑ دینے کی جگہ خود اپنے ہاتھوں میں

لیں کچھ ضرور نہیں کہ قانون کی خلاف ورزی کی جائے' پورے امن اور پورے سکون کے ساتھ ہم اپنے ہر حق کے لئے اپنے جذبات اور ان کی قوت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ عام باشندگان شہر کو فوراً عیدگاہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرنا چاہئے۔ شہر کے علماء اور بندگانِ دینی کا فرضِ اصلی ہے کہ اس معاملہ کو غیر متزلزل قوت اور محکم ثبات کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لیں اور تمام مسلمانانِ شہر کو اس جلسہ میں حکماً جمع کریں اس دن شہر کی دکانیں بند ہونی چاہئیں اور ہر کاروباری مسلمان کو اپنے خدائے قدوس و ذوالجلال کی عبادت گاہ کی عزت کے لئے ایک دن وقفِ راہ الٰہی کر دینا چاہئے جلسہ پورے سکون اور وقار کے ساتھ ہو مگر اس کی در و دیوار تک سے جوشِ ملی و جذبہ اسلام پرستی کی گرمی کے شرارے نکلیں اس میں یہ صاف ظاہر کر دیا جائے کہ مسجد کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے جسموں سے زندہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کٹی ہوئی رگوں اور ٹپکے ہوئے خون کے ساتھ کاٹ لئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ محال قطعی ہے کہ مسجد کی زمین اس کی عمارت بلکہ اس کی چار دیواری کے اندر کے کسی جز سے ایک انچ ایک انگل' ایک جَو برابر بھی کوئی ٹکڑا الگ کیا جا سکے۔ تم اپنے اندر قوت پیدا کرو گے تو قوت بھی تمہارا ساتھ دے گی۔ خدا تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کی صرف اتنی ہی تعریف نہیں کی کہ وہ اللہ کو پکارتے ہیں (ان الذین قالوا ربنا اللہ) بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا (ثمہ استقامو) پھر اس پر مضبوطی کے ساتھ جم بھی جاتے ہیں۔ پس استقامت اصل کار اور تمام کامیابیوں اور نصرت یابیوں کا سبب اصلی ہے' مسجدوں کی جب کبھی بحث چھڑتی ہے تو یہ صرف چند عمارتوں کا سوال نہیں ہوتا بلکہ قومی عزت و ذلت اور دینوی تذلیل و تعظیم کا' ایک نظیر اگر آج قائم ہوتی ہے' تو کل کے لئے اس کے دامن میں ہزاروں واقعات پنہاں ہوتے ہیں اس وقت مسجد کے وضوخانے کا سوال ہے کس کو معلوم کہ کل محراب و ممبر کا نہ ہوگا؟ اگر مسجدیں ڈھا کر سڑکیں نکالی جا سکتی ہیں تو پھر اقلیم ہند کے کسی شہر کی مسجد کی زندگی بھی خطرے سے خالی نہیں۔''

پروگرام کے مطابق کانپور کے انگریز آقاؤں نے یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو علی الصبح خانہ خدا کی دیواریں گرا دیں اور مشرقی حصہ کو منہدم کر دیا لوگ دوڑے ہوئے متولی مسجد کے پاس پہنچے اسی کی سازش سے یہ حرکت ہوئی تھی اس نے کوئی توجہ نہیں کی اور حکمراں طبقہ بھی لاپرواہ بنا رہا تو مسلمانانِ کانپور نے ایک مہینے کے بعد ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو صبح عیدگاہ میں ایک جلسہ کیا۔ اس میں کیا پاس ہوا اور اس کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا اور حکمراں طبقہ نے کیا وحشیانہ اور بہیمانہ حرکتیں کیں اور اس کے مختصر سے حالات انگریزی اخبارات میں شائع ہوئے جس کا ترجمہ الہلال کے ۶ اگست ۱۹۱۳ء کے شمارہ میں چھپا۔

۳ اگست کو ۱۰ بجکر ۳۰ منٹ پر مچھلی بازار کانپور کے متعلق ایک خوفناک بلوہ ہوا۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مجمع صبح کو عیدگاہ میں ہوا تھا۔ جس کے لئے مسلمانوں نے اپنے تمام کاروبار بند کر دیئے تھے اور بطور علامتِ حزن عیدگاہ کو

گئے تھے۔ جلسہ کے بعد چار پانچ سو مسلمانوں کی جمعیت نے ایک سیاہ علم کے پیچھے مسجد مچھلی بازار کا رخ کیا اور حصہ منہدمہ کی تجدید تعمیر کرنی چاہی۔ سب انسپکٹر نے بھیڑ کو منتشر کرنا چاہا۔ لیکن چند پتھر اور ڈھیلوں سے چوٹ کھانے کے بعد سٹی چوک تک پیچھا کیا اور چوکی کی بعض چیزوں کو خفیف نقصان پہنچانے کے بعد مسجد واپس آئے' مسجد کے قریب ایک ہزار سے زیادہ آدمی جمع تھے جن میں بہت سے تماشائی تھے' میجر ٹائکر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کچھ مسلح پیادے اور سواروں کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے اور تنہا سوار ہو کر مجمع کو منتشر کرنے کے لئے بڑھے مجمع نے پتھر اور ڈھیلے جو پاس پڑے تھے پھینکنا شروع کیا مسٹر ٹائکر نے اپنے فوجی مددگاروں کو آواز دی' خالی کارتوس کے فائر نے کوئی اثر نہیں پیدا کیا اس بناء پر انہوں نے اسے فائر کا حکم دیا' فائر سے جو ۱۰ منٹ تک رہا بھیڑ بالکل منتشر ہوگئی' متعدد آدمی مارے گئے اور ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی جس میں کچھ پولیس مین بھی شامل ہیں جو بھیڑ میں مجروح ہوئے کچھ بلوائی پولیس مین کے ہاتھ بندوق سے مارے گئے۔ ایک پولیس مین مرگیا جہاں تک معلوم ہوسکا بارہ آدمی مرے اور ۲۳ زخمی ہوئے جو ہسپتال میں پہنچائے گئے کچھ تماشائی جس میں ہندو بھی شامل تھے سخت زخمی ہوئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بھی چوٹ آئی کچھ تعداد گرفتار کی گئی۔

یہ تو نیم سرکاری اخبارات کی رپورٹ تھی لیکن غیر سرکاری لوگوں نے مسجد اور ہسپتالوں میں جا کر دیکھا ان میں ایک آنریبل سید رضا علی وکیل ہائیکورٹ الہ آباد بھی تھے۔ انہوں نے مسجد میں جا کر اور ہسپتال کے مریضوں کے معائنہ کے بعد ایک بیان پریس میں دیا تھا جو ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء کے شمارے میں چھپا۔

کانپور سے میں ابھی واپس آیا ہوں' مجھے افسوس ہے کہ بلوائے کانپور کے متعلق اکثر نہایت ضروری واقعات اخبار میں نہیں آئے درحقیقت اب تک جو کچھ شائع ہوا ہے اس کے پڑھنے سے ان ہیبتناک واقعات کا صحیح اندازہ ہونا ممکن ہی نہیں جو ۳ اگست کو کانپور میں پیش آئے مسجد میں داخل ہوتے ہی جو چیز پہلے نظر آتی ہے وہ محراب والی یعنی مسجد کی پشت والی دیوار پر گولیوں کے نشانات ہیں یہ نشانات اکثر چھت کی سطح زیریں پر بھی نظر آتے ہیں لیکن جو بات سب سے پہلے زیادہ توجہ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ مسجد کے اندر بھی محراب مسجد سے ۶ یا ۷ فٹ کے فاصلے پر دونوں جانب گولیوں کے بے شمار نشان ہیں۔ بظاہر یہ کسی طرح ممکن نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانات اس صورت میں پڑ سکتے ہیں کہ پولیس نے اندر آ کر فائر کیے ہوں خون کے نشانات اور بڑے بڑے چھکتے بہت سے دیکھے گئے' مسجد میں داخل ہوتے ہوئے ممکن نہیں کہ اس خون آلودہ نشان اس امر کی شہادت ہے کہ خدا کے گھر میں تعدی و خونریزی کی گئی ہے۔ موقع پر مسلح پولیس کی خوں ریزی اس منظر کی ہیبت میں اور بھی اضافہ کرتی ہے۔ اگر مسٹر ٹائکر مسلح پولیس متعین کردیے ہوتے تو غالباً خطرہ ہی نہ ہوتا۔ آخری چیز جو مسجد میں مجھے دکھائی گئی ہے وہ چند دریاں تھیں جو ان مقتولین و مجروحین کے خون میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ جن پر مجسٹریٹ

کے حکم سے فائر کیے گئے' مسٹر ٹائلر کی عنایت سے میں جیل اور ہسپتال میں بھی گیا' میں نے مولانا آزاد سبحانی اور ان کے دوستوں کو جیل کی تکلیف دہ زندگی میں روزہ دار اور مطمئن و بشاش پایا' بہت دیر تک ان صاحبوں سے باتیں ہوتی رہیں میری روانگی سے کچھ پہلے مولانا آزاد نے اپنے ہندوستانی ہم مذہبوں تک پہنچانے کیلئے مجھے ایک پیغام دیا۔ انہوں نے فرمایا' مہربانی کرکے مسلمان بھائیوں سے کہہ دیجئے کہ وہ ہماری رہائی کی فکر میں اپنے آپ کو پریشان نہ کریں بلکہ مسجد کی حفاظت کے لیے کوشش کریں۔''.....۱۴

اس حادثے پر بھی مسلمانانِ ہند نے تحریری طور پر بھرپور احتجاج کیا۔علامہ شبلی نعمانی نے ایک پر اثر نظم لکھی۔ زخ ش نے بھی مسجد کانپور کی باتیں کے عنوان سے نظم تحریر کی۔ اس نظم میں اہل اقتدار کا نام لے کر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ یہ نظم اُن کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔

اسی احتجاج کے دوران مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کا الہلال اخبار انگریز حکومت کے عتاب کی زد میں آیا۔زخ ش نے اس اقدام کو مذمت کی نگاہ سے دیکھا اور اس پر اپنے تاثرات پھوپھی زاد بہن انیسہ خاتون شروانیہ کو خط کی شکل میں لکھے ۔ابوالکلام آزاد کو اپنا دینی بھائی کہتی تھیں۔ اس خط سے اقتباس یہاں نقل کر رہی ہوں۔

''......کیا تم نے اخبارِ ہمدرد دہلی میں آزاد بھائی پر پولیس کانپور کا ظلم دیکھا؟ کیا رئیس احرار سلمہ الرب الابرار سے پولیس کی مخصوص اہانتیں مثلاً تمام پولیس وافسران پولیس کا ان کی شکل دیکھتے ہی پہچان لینا اور برادرِ ممدوح کا فوٹو ان لوگوں کے پاس نکلنا ان کو کسی سے عام بات چیت کی اجازت نہ دینا، ٹائیگر کی سخت کلامی، مسجد، جیل خانہ۔ ہاسپٹل کے دیکھنے سے روکنا، اور بالآخر کانپور سے نکلوادینا، ان کا لفٹنٹ گورنر کو تار دینا، وہاں سے جواباً عدم مداخلت کا اعلان کیا ان تمام باتوں پر مطلع ہوکر بھی تم عنانِ ضبط مضبوط تھامے رہوگی؟ فبای الذلِ بعدہ منتظرون؟ مگر ان باتوں سے ان کی کچھ ذلت نہیں ہوئی بلکہ عینِ عزت ہے۔ کیا جب کفار کے لڑکوں نے ساق آنحضرت ﷺ (بابی ہو وامی) کو خون آلود کردیا تھا تو عالمِ بالا میں آنحضور ﷺ کا رتبہ دوبالا نہ ہوا ہوگا؟ کیا حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی عزت اسیرِ زنداں ہونے سے کچھ کم ہوگئی تھی؟ حاشا وکلاً میں کہتی ہوں اگر خوانخواستہ مولانا آزاد بھی آزاد سبحانی کی طرح پابند سلاسل ہوجائیں جب بھی ان کی عزت دنیا کی نگاہ میں کم نہ ہوگی بلکہ اسے چار چاند لگ جائیں گے......''

زخ ش اگرچہ ہندوستان کے روایتی فیوڈل معاشرے کی فرد تھیں جہاں لڑکیوں پر پردے کی اتنی سخت پابندی تھی کہ وہ مردوں تو کیا خاندان سے باہر کی خواتین سے بھی میل ملاقات نہیں رکھ سکتی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا ذہن دیا تھا جو جس نے وسعت کی راہ تلاش کرلی تھی۔ مطالعے نے انکے سماجی و سیاسی شعور کو پروان چڑھانے کے ساتھ

معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کی شدید خواہش کو جنم دیا تھا جس نے پابندیوں میں بھی اپنی تکمیل کے راستے بنالیے۔ اخبارات کے مطالعے جن میں زمیندار، ہمدرد اورالہلال شامل ہے نے ان پر گہرے اثرات ڈالے اور وہ قومی سیاست میں نہ صرف نظریاتی استحکام کی حد تک شامل ہوئیں بلکہ ان کے اظہار کا ہر وسیلہ اختیار کیا۔ وہ اس زمانے کے تمام اکابر رہنماؤں سے متاثر ہوئیں خصوصاً وہ مسلمان مفکرین جو صحافت و سیاست میں بھی متحرک تھے۔ انہوں نے علی برادران کی نظر بندی پر بھی نظم لکھی جو مرشد دہلی میں یکم جون ۱۹۱۸ء کو شائع ہوئی۔

زخ ش نے جنگ عظیم اول کے حوالے سے بھی ایک طنزیہ نظم جنگ فرہنگ لکھی۔ اس دور میں زخ ش پر والد کی طرف سے براہ راست اس بات کی پابندی لگی کہ وہ اس جنگ کو موضوع نہ بنائیں اور خاموشی اختیار کریں۔ انیسہ خاتون شیروانیہ لکھتی ہیں۔

''نواب بہادر اعلیٰ اللہ مقامہ گورنمنٹ برطانیہ کے ایک وفادار معتمد علیہ آدمی تھے' اور اس موقعہ پر اگرچہ ان کے مذہبی احساسات جس حد تک بھی مجروح ومنقلب ہوں لیکن بہت سے اپنے دیگر ہم خیال مسلمانوں کی طرح وہ اس کا اعلانیہ اظہار نہیں کرسکتے تھے...... اسی بات کے وہ اپنے نوعمر اور ناتجربہ کار بچوں سے متوقع تھے۔ چنانچہ اپنے خط میں انہوں نے جنگ میں شمولیت ترکی پر شدید رنج وفکر اور غم وغصہ کا اظہار کیا' اور شائستگی ومحبت کے ساتھ ان کو وقار وصبر وسکون سے کام لے کر مسلمانوں کی ہدایت اور توفیق خیر کے لیے دست بہ دعا رہنے کی نصیحت تحریر فرمائی اشارتاً یہ بھی لکھ دیا کہ اگر خدانخواستہ ازراہ نادانی اس نہایت نازک موقعہ پر تم لوگوں سے حسب عادت جوشیلی حرکات سرزد ہوئیں تو علاوہ ان سنگین عواقب ونتائج کے جن سے تم سب بخوبی آگاہ ہو' ایک بڑی مصیبت ہوگی۔ ظاہر ہے تم لوگوں کے خیالات کا اتباع میرے اوپر تو کسی طرح لازم آتا نہیں اگر تم سب نے بھی میری موافقت کا فیصلہ کم از کم خاموش رہ کر نہ کیا جو یوں بھی شرعاً عرفاً اخلاقاً وعقلاً تمہارا فرض عین ہے تو خدانخواستہ دُنیا پر ہمارے گھر کے تصادم خیالات کی حقیقت آشکار ہوجائے گی اور اغیار کو شماتت کا ایک نکتہ خود تمہارا بہم پہنچایا ہوا ہاتھ آجائے گا (جو کہ یوں بھی جانتے ہو ہمیشہ بلاوجہ میرے درپے آزار رہتے ہیں) جس سے گھر کے ہر فرد کی دوراز حال سبکی ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت کچھ پند ونصائح اور نرم وگرم اشارات مرقوم تھے۔ ظاہر ہے کہ خود اس خبر وحشت اثر اور پھر اس خط کے زاہدہ خاتون اور ان کے بہن بھائیوں پر کیسے کچھ اثرات مرتب نہ ہوئے ہوں گے اور باہم کیا کچھ غور وفکر اور تبادلۂ خیال نہ ہوا ہوگا' اور نہ ہوتا رہا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مَنْ صَمَتَ نَجَا کے اصول پر اس مذہب اور باپ کی یکساں سچی شیدائی بیٹی نے ازراہ دوراندیشی باپ کی حسب خواہش ونصیحت خاموشی اور صبر وسکون کی پالیسی پر ہی کاربند ہونا مناسب خیال کیا...... بجز چند اشارات اور دو تین نظموں کے مرحومہ کا ان معاملات پر لکھا

ہوا کوئی قابل لحاظ تحریری مواد کم از کم ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ البتہ اس زمانے میں ان کی توجہ زیادہ تر نسوانی مسائل پر مبذول رہی۔''......۱۵

برصغیر کی خواتین خصوصاً مسلم معاشرے میں خواتین پر عائد بے جا پابندیوں کے اثرات سے کون خاتون تھی جو محفوظ تھی۔ خواتین ان بے جا رسوم و رواج اور مردانہ بالادستی کے معاشرے میں بے زبان و مجبور زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ سوچنے والے ذہن محسوس کر رہے تھے۔ معاشرتی رویے میں عورت کا وہ مقام جو بحیثیت انسان اسے ملنا چاہیئے تھا مردانہ جہالت اور بے جا انائیت کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ اس کے لئے ذہن تو کیا زبان' آنکھ اور کان کا استعمال بھی ممنوع ہے۔ نظریں نیچی' زبان خاموش' کان کچھ بھی سننے کی صلاحیت سے محروم یہ ایک آئیڈیل ہندوستانی عورت کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس معاشرے میں زخ ش جیسی باشعور شاعرہ کی گھٹن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس باب میں بھی اپنی شاعری کو وسیلہ بتایا اور مسلسل کئی نظمیں اور مضامین عورتوں کی تعلیم' ان میں فکر و تدبر اور ذہنی' سیاسی و سماجی شعور کی بیداری کی حمایت میں لکھے۔ سیاسی استانی کے عنوان سے لکھے ہوئے ان کے ایک مضمون کا اقتباس دیکھئے۔

''...... تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام بڑے آدمیوں کی مائیں خاص قسم کے دل و دماغ والی خواتین تھیں۔ فاتح کی ماں بہادر' مصلح کی جدت طراز' اور ولی کی فنافی اللہ...... جس طرح انفرادی طور پر ایک مرد کا اخلاق عورت ہی کا بنایا بگاڑا ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح اجتماع حیثیت سے ایک قوم کی اخلاقی و مادی ترقی قومی ماؤں کی دماغی حالت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر آپ سیاسی عظمت کی ٹھیکہ دار قوموں پر نظر ڈالیں گے تو ملاحظہ کریں گے کہ ان کی عورتیں سیاست کا کیسا صحیح مذاق رکھتی ہیں۔ اور حب وطن کے پاک جذبہ سے کس قدر سرشار ہیں۔ ان کا وجود ماں کی حیثیت سے نہیں بلکہ فلاح عامہ کے ہر ایک شعبہ میں کارکن کی حیثیت سے ملک و قوم کے لیے رحمتِ الٰہی ثابت ہو رہا ہے...... ہمارا قومی جوش جس قدر اپنی خوفناک شدت کے لیے دنیا میں مشہور ہے اس قدر سرعت فنا میں زبان زدخلائق ہے۔ ہمارا مجموعہ سیاست کیا ہے؟ ایک طومار۔ خرافات۔ ہمارا میدان عمل کیا ہے؟ ایک بازیچۂ اطفال۔ ہماری متفقہ آواز کیا ہے؟ ایک قہقہہ انگیز تمسخر۔ ہمارے رہنما سیاست کو تسخیر عوام کا چلتا ہوا جادو' عزت حاصل کرنے کا نسخۂ سونے چاندی کا مینھ برسانے والا پیشہ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں...... یہی وجہ ہے کہ ہمارا رعب اور اثر اقوامِ عالم کے دلوں سے بالکل اُٹھ گیا ہے......

حالات حاضرہ کی تفصیل سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ نزاکتِ وقت کو محسوس کر کے اغلاطِ ماضیہ کی تلافی کی جائے۔ مسلمانوں کی سب سے مہلک غلطی مستورات کو اول جاہل رکھنا اور پھر تعلیم دے کر سیاست سے بے تعلق رکھنا تھی۔ قومی ماؤں کی سیاست سے ناواقفیت کے سبب افراد قوم میں بھی صحیح سیاسی مذاق اور سچا جوش مفقود ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔

انہوں نے ولادت، طفولیت، ابتدائی تعلیم ان تمام مراحل کو طے کرنے کے بعد ''اسلامی حمیت'' کا نام اس وقت سُنا جب مولوی صاحب قبلہ نے قرآن و حدیث کے معارف وبصائر سے آگاہ کیا۔ حبِ وطن اور قومی جوش کی خوبیاں انہوں نے پہلے مدرسہ(آغوش مادری) میں نہیں سنیں۔ بلکہ طوق استعباد(ملازمت) گلے میں ڈالنے کی خاطر یونیورسٹی اور وہ بھی سرکاری یونیورسٹی میں ان لغتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مثل مشہور ہے بوڑھے طوطے پڑھا نہیں کرتے۔ تعلیم نے دلوں میں جوش پیدا کیا تو سہی مگر نہایت سطحی، نہایت ناپائیدار۔ چونکہ ہم جوشیلی زندگی بسر کرنے کے خوگر نہیں ہیں اس لیے طبیعت جوش کو بہت جلد دفع کردیتی ہے۔..........

آہ اگر خواتین اسلام آج سیاست شناس ہوتیں تو قوم کا نظام ترکیبی ست عمل اور غلط روعناصر کی جگہ ایسے کارآمد اجزا سے مرکب ہوتا جن کی رگ و پے میں خون کے ساتھ حمیت جاری و ساری ہوتی۔ حب وطن گھٹی میں پڑی ہوتی ترقی کا راگ اولین صدائے ہستی بن کر کانوں کی راہ دلوں میں اترا ہوتا۔ ضروریات قوم زندگی کا پہلا سبق بن کر ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہوچکی ہوتیں۔ صداقت بے غرض، پابندی اصول، اصابت رائے، استواری عزم، غرض وہ تمام خوبیاں جو ایک قوم کے اجزائے اخلاق ہوتی ہیں خود بخود ان میں پیدا ہوجاتیں، اور قومی اسٹیج پر یہ دعویٰ انہیں زیب دیتا۔

عشق تو در وجودم و مہر تو درسرم
باشیر اندروں شر باجاں بدررود

آخری التجا۔

اگر آپ ذلت و ادبار کی تلخ غذا سے سیر ہوچکے ہوتو مہربانی سے گزشتہ پر صلوٰۃ بھیج کر آئندہ کے لیے احتیاط کیجئے۔ تلافی کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ یعنی تعلیم نسواں کی نشر و اشاعت میں پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھائے۔ اور تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ انہیں اصول، سیاست (principles of polititics) سے آگاہ کیجئے اور اس سبق کو ان کے نصاب کا جزولانیفک مقرر فرمایئے۔ اخبار بینی اور سیاسی مباحث کی ترغیب وتشویق سے ان میں وجدان صحیح پیدا کرنے کی کوشش کیجئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں سیاسیات میں اعتدال احتیاط اور پردہ داری کے ساتھ دخل دینے کی آزادی مرحمت کیجئے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی رائے پختہ ان کا جوش مستحکم اور ان کی حمیت دو چند نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ وقائع دنیا پر رائے ظاہر کرنے کا حق خدا کی طرف سے ہر ذی عقل کو عطا ہوا ہے۔ اگر تم کمزور اور بے بس عورتوں کے جائز حقوق غصب کرو گے تو منصفِ حقیقی تمہاری رہی سہی آزادی کو بھی سلب کرلے گا۔ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ''

زخ ش نے خواتین کے حقوق اور بیداری پر متعدد مضامین ونظم لکھے۔ وہ خواتین کی تعلیم' ساجی و سیاسی تحریکوں میں انہیں فعال کرنے اور اُن کے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلسل آواز اٹھاتی رہیں۔ پنجاب میں خواتین کو والدین کی میراث میں ترکہ نہ دیئے جانے کے رواج کو قانون کی حیثیت سے منظور کروانے کی کوشش کی جارہی تھی جس میں کونسل کے چند مسلمان اراکین بھی شامل ہوگئے تھے۔ صنفی امتیاز کی تمام قبیح رسمیں جو برصغیر کے مسلمانوں نے اپنائیں ہوئیں تھیں ان کی وجہ خودغرضی' حرص اور کچھ حلقے میں جہالت تھی۔ لیکن کونسل کی سطح پر ایسا قانون بنانا جس کی اسلام بھی اجازت نہیں دیتا اس بات کی علامت تھی کہ عورتوں کے حقوق کے باب میں مردانہ رویہ معاندانہ اور خودغرضی پر مبنی ہے۔ اس حوالے سے زخ ش نے نظم'' تصادم رواج وشرع'' لکھی۔ اس کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی وہ مسلسل ان حالات اور رسومات پر نکتہ چینی کرتی رہیں جو صنفی امتیاز کا باعث تھے۔

خواتین کے حال زار پر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے ایک مجموعہ اپنی مشہور مثنوی آئینہ حرم کے ساتھ اسی عنوان سے تہذیب نسواں کے ایڈیٹر مولوی ممتازعلی کے ذریعے شائع کرواکے پڑھی لکھی خواتین تک اپنے خیالات پہنچانے کی ایک مثبت کوشش کی۔ یہ اس زمانے کے اعتبار سے بے مثال اور بہت جرأت انگیز قدم ہے۔

زخ ش گاندھی جی کی سودیشی تحریک میں بھی عملی حصہ لیا۔ انیسہ خاتون کے نام ایک خط میں لکھتی ہیں۔

ملت اسلامیہ کی سربلندی' مزدوروں کی حمایت' خواتین کی بیداری' سودیشی تحریک' ہندو مسلم اتحاد' اخبارات و رسائل پر پابندی کی مخالفت وعملی امداد' اپنے عہد کے اکابرین مثلاً محمد حسین آزاد' شبلی نعمانی' مولانا حالی کی وفات' علی برادران کی نظربندی کا دکھ' اقبال کی فکر جیسے اہم موضوعات ان کی نظموں میں اس عہد کی تاریخ کا معتبر حوالہ پیش کررہے ہیں۔ اور ایک ایسی باشعور شاعرہ کی اس عصر میں ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ جو علم' عمل' فکر و احساس ہر سطح پر اعلیٰ قدروں کی ترجمان ہیں اور ان کے اظہار پر مکمل عبور رکھتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسین آزاد' جلد اول۔ صفحہ ۴۷۔ ڈاکٹر اسلم فرخی۔ مطبوعہ' انجمن ترقی اردو' کراچی

۲۔ انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان۔ صفحہ ۱۰۶۱۔ اسد سلیم شیخ۔ مطبوعہ' سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

۳۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۴۔ انسائیکلو پیڈیا' تاریخ عالم۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۸۶۔ مصنف' ولیم ایل لینگر۔ ترجمہ' مولانا غلام رسول مہر۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، کراچی

۵۔۶ انسائیکلو پیڈیا' تاریخ عالم۔جلد اول۔صفحہ ۱۸۷۔مصنف' ولیم ایل لینگر۔ترجمہ' مولانا غلام رسول مہر مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، کراچی

۷۔ اردو انسائیکلوپیڈیا' تیسرا ایڈیشن۔صفحہ ۳۸۱۔سعید لخت۔مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور' راولپنڈی' کراچی

۸۔ روزنامچہ زخ ش، بتاریخ ۴ ستمبر ۱۹۲۱ء، غیر مطبوعہ کاپی محفوظ

۹۔ روزنامچہ زخ ش، بتاریخ ۳۰ جنوری ۱۹۲۱ء، غیر مطبوعہ کاپی محفوظ

۱۰۔ فردوس تخیل۔صفحہ ۲۰۔زخ ش۔مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علیگڑھ

۱۱۔ فردوس تخیل صفحہ ۳۵۷۔زخ ش۔مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علیگڑھ

۱۲۔ تاریخ صحافت اردو۔جلد پنجم ۔صفحہ ۳۷،۳۶۔امداد صابری۔مطبوعہ جمال پریس دہلی

۱۳۔ حیات زخ ش۔صفحہ ۴۷۔انیسہ ہارون بیگم شروانیہ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۱۴۔ تاریخ صحافت اردو۔جلد پنجم۔صفحہ ۲۰۴۔۲۰۸۔امداد صابری۔مطبوعہ جمال پریس دہلی

۱۵۔ حیات زخ ش۔صفحہ ۸۲تا۸۵۔انیسہ ہارون بیگم شروانیہ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن

باب دوم

برٹش کے عہد میں مسلمانوں خصوصاً خواتین کی تعلیم کی تحریک اور ابتدائی نسائی ناول

انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان کی خواتین تعلیمی اعتبار سے پسماندگی کے اندھیرے میں گم تھیں۔ خواتین تو کیا جدید تعلیم کے حصول میں مردوں کا رویہ بھی بے لچک تھا۔ مسلمان مردوں اور بالخصوص خواتین کی حالت تو اس سے بھی ابتر تھی۔ برصغیر کے ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کے بہ نسبت وہاں کے مسلمان جدید علوم کی جانب دیر سے متوجہ ہوئے۔ مسلمان انگریزی تعلیم اور اسی باب میں انگریزی کوششوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور اسے اپنے مذہب اور تہذیب کیلئے خطرہ سمجھتے تھے۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے دشمنی کی حدوں تک پہنچ گئے تھے۔ مغل حکومت کے خاتمے کے بعد بھی مسلمان اس تہذیب اور نظام تعلیم پر قائم رہے جو صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ ایک طرف انہیں خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے اپنے لڑکوں کو سرکاری اسکولوں میں بھیجا تو وہ اپنا مذہب تبدیل کرلیں گے۔ دوسری طرف انگریزی کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کرنے میں بہت سے نفسیاتی عوامل حائل تھے۔ عیسائیوں کی زبان کو سیکھنا وہ خلاف تہذیب و شرافت سمجھتے تھے۔ انگریزوں کا رویہ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں کے ساتھ سخت رہا۔ اس نے بھی تعصب کے جذبات کو مستحکم کیا۔ ۱۸۷۰ء میں جب برصغیر میں انگریز حکومت کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور مسلمان معاشی طور پر انحطاط کے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں وہ انکے لئے خطرہ نہیں تھے، تو انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔

۱۸۷۱ء میں حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے بارے میں ایک ریزولیشن جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں نے جدید نظام تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اس لئے ان کی ترقی کی راہ محدود رہی ہے۔ ''حکومت کو اس بات کی تشویش تھی کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی صرف اس لئے مادی اور سماجی فوائد سے محروم ہے کہ اس نے حکومت کی تعلیمی پالیسی کے ساتھ تعاون نہیں کیا اور دیگر قوموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا''۔......۱

اس طرح ۱۸۸۳ء میں انڈین ایجوکیشن کمیشن نے مقامی حکومتوں کی رپورٹوں کا جائزہ لیا تو تمام رپورٹیں اس بات پر متفق تھیں کہ مسلمانوں نے جدید تعلیم کو نظر انداز کیا جس کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں دیگر قوموں سے پیچھے رہ گئے اور ترقی نہ کرسکے۔ ''رپورٹوں میں اس تعلیمی پسماندگی کے اسباب بھی پیش کیے گئے تھے جن میں کچھ ممبروں نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو انگریزی تعلیم کے لئے ناسازگار قرار دیا تھا جبکہ کچھ کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کا مذہب سے

کوئی تعلق نہیں۔ سرکاری اسکولوں میں مسلمان اساتذہ کی کمی، سرکاری تعلیمی اداروں میں مسلمانوں سے رابطے میں کمی اور بے توجہی پر بھی تنقید کی گئی تھی، مسلمانوں کی غربت، خوشحال مسلمانوں کا گھر پر بچوں کو تعلیم دینا، نصاب میں ایسی کتابیں جن سے ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، مسلمانوں کا نسلی تفاخراور ماضی کی برتری کا احساس وغیرہ کو چند عوامل قرار دیا گیا تھا۔ کمیشن کی رپورٹوں کے نتیجے میں ایک طرف تو مقامی حکومتوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایسے اقدامات کئے جن سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا رجحان پیدا ہو، دوسری طرف روشن خیال مسلمانوں نے، مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کئی تحریکیں شروع کی جن میں سرسید احمد خان کی علی گڑھ کی تحریک، کلکتہ کے نواب عبدالطیف کی محمڈن لٹریری اینڈ سائنٹیفک سوسائٹی، شیخ عبداللہ کی انجمن خواتین اسلام، سید امیر علی کی سنٹرل نیشنل ایسوسی ایشن، بدرالدین طیب جن کی انجمن اسلام نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی حالت کو دھارنے کے لئے بڑے پیانے پر عملی جدوجہد شروع کی جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ انکی کوششوں نے وہ میدان ہموار کیا جس پر مسلمانوں کی آزادی اور نسائی تعلیم کی بنیاد رکھی گئی۔

سرسید احمد خان کی تحریک:

سرسید احمد خان نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کے تعلیمی نظام کا باقاعدہ آغاز کیااور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ انہوں نے انگریزی تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو بھی نصاب میں شامل کیا۔ طلباء کے لئے سائنٹیفک جدید علوم کے حصول کو آسان بنانے کے پیش نظر انگریزی کتابوں کے اردو میں تراجم کے لئے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ انہوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کے جلسے ہندوستان کے طول وعرض میں منعقد ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں لائحہ عمل طے کئے جاتے تھے۔ سرسید کے رفقاء نے بھی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دامے درمے سخنے ہر ممکن مدد کی۔ ان میں مولوی ممتاز علی، نواب عماد الملک، سید مہدی علی، شیخ عبداللہ، محسن الملک، مولوی مشتاق حسین وقار الملک، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ سرفہرست ہیں۔

سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک بنیادی طور پر مردوں کی اعلیٰ تعلیم کی تحریک تھی جو انہیں جدید علوم کے سہارے معاشی اور سماجی طور پر ترقی یافتہ قوموں کے برابر لانا چاہتی تھی۔ اس وقت تک ہندوستان کی مسلم خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی، نہ حالات اس کے لئے سازگار تھے۔

سرسید احمد خان کے زمانے تک تعلیم عورتوں کے لیے غیر ضروری ہی نہیں بالکل نامناسب سمجھی جاتی تھی اور بہت کم گھرانوں میں پڑھی لکھی عورتیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت جاہل تھی اور معاشی نظام میں ان کی حیثیت

بڑی حد تک عضو معطل کی سی تھی۔

اگر چہ سرسید احمد خان نے خواتین کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھا، تاہم انہی کی تحریک نسائی تعلیم کی بنیاد بنی۔ ایک تو سرسید کے رفقاء میں تعلیم نسواں کے حامی بھی شامل تھے۔ جنہوں نے تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں عملی مدد کی۔ دوسرے مردوں میں جدید علوم کے حصول سے جو روشن خیالی پیدا ہوئی اس نے اپنی عورتوں کی تعلیم میں دلچسپی لینے پر آمادہ کیا اور ان فرسودہ روایات سے بغاوت پر اکسایا جو مسلم گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم اور خواتین کی ترقی کی راہ میں حائل تھی۔

''یلدرم کے ایک ہم سبق مشتاق احمد زاہدی کا بیان ہے کہ ۱۹۰۱ء میں کالج چھوڑنے کے بعد ہم لوگوں کو اصلاح قوم اور طبقۂ نسواں کی ترقی کے علاوہ اور کوئی فکر دامن گیر نہیں تھی۔ سرسید اور ان کے ساتھی ان نوجوانوں کو صبح و شام ''اصلاحِ قوم'' پر لیکچر پلا چکے تھے اور علی گڑھ بہر حال 'ترقی' کا دوسرا نام تھا۔.....۲

سرسید احمد خان نے اپنی توجہ مردوں کی تعلیم پر مرکوز رکھی تو اس کا ایک واضح جواز ہمیں اس زمانے کے حالات کے مطالعے سے مل جاتا ہے۔ ہندوستانی معاشرہ جدید علوم کی آبیاری کے لئے اتنا زرخیز نہیں تھا کہ اس پر ہر طرح کے بیج ڈالے جاسکیں، اس کا اندازہ انگریز حکومتوں کو بھی تھا، جبھی ابتدا میں سرکاری طور پر حکومت نے صرف مردوں کی تعلیم پر توجہ دی تھی، تعلیم نسواں کو خطرناک میدان قرار دیا تھا جس میں قدم رکھنا مشکلات کو دعوت دینا تھا۔

مسلمانوں کے باب میں مردوں کی جدید تعلیم کا میدان بھی دشوار گزار ثابت ہوا اور سرسید کو جن تجربات سے گزرنا پڑا وہ کسی عام انسان کے حوصلے پست کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ کافر، نیچری، انگریزوں کے ایجنٹ جیسے الزامات کے باوجود وہ اسی میدان میں ڈٹے رہے اور اپنی پوری قوت اس شجر کی آبیاری پر صرف کرتے رہے جو بنجر زمین پر بویا گیا تھا۔ ایسے میں نسائی تعلیم کے علاقۂ ممنوعہ میں قدم رکھنا ایک ایسا محاذ کھولنا تھا جس کے لئے ان کے خیال میں حالات ابھی سازگار نہیں تھے۔ اس بات کی تائید سرسید کے رفیق اور تعلیم نسواں کے زبردست نواب محسن الملک نے بھی کی ہے۔

''سرسید ہرگز تعلیم نسواں کے مخالف نہ تھے۔ وہ تعلیم نسواں کو بڑی قومی ضرورت سمجھتے تھے۔ الہ آباد کانفرنس میں تعلیم کے متعلق ریزولوشن (قرارداد) پر وہ کچھ اختلاف کے بعد رائے دے چکے تھے۔ کانفرنس کا صیغہ تعلیم نسواں ان کی حیات میں اور ان کی پسند سے قائم ہو چکا تھا۔ وہ تعلیم کے سچے دل سے مرید تھے اور اس کی ضرورت کو سمجھتے تھے۔ اس قدر جوش اور سرگرمی نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک مرتبہ صرف ہمت کر چکے تھے۔ سرسید نے جب مغربی تعلیم کی

ضرورت مسلمانوں کو سمجھانی چاہی تو چاروں طرف سے مخالفت کا غلغلہ بلند ہوا۔ آپ صحیح اندازہ نہیں کرسکتے کہ سرسید کو کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کیسی کیسی آفت اٹھانی پڑی ہے اور اب بھی مغربی تعلیم کے دشمن ستانے اور پریشان کرنے سے باز نہیں آتے۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ تعلیم نسواں کے مسئلے کو چھیڑا جاتا۔ اس وقت عورتوں کی تعلیم پر زور دینے کے معنی یہ ہوتے کہ دیدہ و دانستہ ہزاروں آفتوں کو مول لیا جاتا اور جان بوجھ کر مردوں کی تعلیم کے مفید مطلب و اغراض کو خاک میں ملا دیا جاتا۔ پہلا فرض یہ تھا کہ پہلے مردوں کی تعلیم اور اصلاح کا انتظام کیا جائے، چنانچہ یہ سمجھ کر کہ مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں تو اپنے آپ تعلیم نسواں کا خاطر خواہ انتظام کریں گے۔ بغیر تعلیم نسواں زندگی مہمل رہے گی۔ مسلمان ہمیشہ اس اعلیٰ اور مہذب زندگی کے الطاف، مسرتوں اور برکتوں سے محروم رہیں گے جو تعلیم یافتہ عورتوں کی وجہ سے گھر میں موجود ہے۔ جو محسوس نہیں کرسکتا وہ اندازہ بھی نہیں کرسکتا کہ تعلیم کہ تعلیم نسواں کی بدولت قوم کی حالت میں کیسا مفید انقلاب ہوجائے گا اور یہ کونسی انسانیت ہے کہ عورتون کو تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ ان کو تعلیم نہ دینا ان پر ظلم کرنا ہے۔''......۳

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلم خواتین کی تعلیم کی راہ میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں لاہور کے سیشن میں شیخ خیرالدین نے ایک قرارداد پیش کی کہ اسلامی قوانین اور شریف خاندانوں کے اقدار اور روایات کے مطابق مسلمان لڑکیوں کے لئے بھی تعلیمی ادارے قائم کئے جانے چاہئیں جو بحث و مباحثے کے بعد منظور کرلی گئی۔ ۱۸۹۱ء سالانہ اجلاس میں ایک اور قرارداد خواجہ غلام الثقلین نے بیرسٹر سید کرامت حسین کی تائید کے ساتھ پیش کی جس کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے تا کہ آئندہ نسلوں کو ان کی تربیت سے فائدہ پہنچے۔ اسی کانفرنس میں سرسید احمد خان نے اس بات کی وضاحت کردی کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف نہیں۔ انہوں نے کہا:

''میرے دوست منشی سراج الدین صاحب نے کئی مرتبہ میرا نام لیا اور یہ بھی بیان کیا کہ میں تعلیم نسواں کا مخالف ہوں ان سب کو معلوم ہوجائے کہ یہ بات غلط ہے۔''

وہ آگے اپنے موقف کو یوں واضح کرتے ہیں:

''میرے صرف دو مطلب ہیں جن کو میں پھر بیان کرتا ہوں۔ اول یہ خیال کہ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہوں غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ ذریعہ عورتوں کی تعلیم کا سوائے اس کے اور نہیں ہے کہ مردوں کی تعلیم ہو اور اسی لئے میں کوشش کررہا ہوں کہ بچوں کی تعلیم ہو جب وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو اپنی بیویوں اور بچوں کو تعلیم سے آراستہ کریں گے۔''......۴

۱۸۹۶ء میں کلکتہ کی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے میں تعلیم نسواں کا علیحدہ سیکشن بنایا گیا اور سید کرامت حسین جو علی گڑھ میں ایم اے او(M A O) کالج کے قانون کے پروفیسر تھے اس کے سیکریٹری مقرر کئے گئے اس کے بعد ۱۸۹۹ء میں جسٹس سید امیر علی نے بھی اس امر کی اہمیت پر زور دار قرارداد پیش کی جس میں انہوں نے کہا کہ ملک کے ہر صوبے کے دارالخلافہ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایسے ادارے بنائے جائیں جن میں خواتین کو اسلامی اصولوں اور مسلمان شرفاء کی روایات کے مطابق تعلیم دی جائے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی اعانت اور ہمت افزائی سے خان بہادر شیخ عبداللہ اس کے خواتین سیکشن کے سیکریٹری منتخب کئے گئے اور بیگم عبداللہ نے اپنے گھر پر ایک میٹنگ بلائی جس میں عورتوں میں تعلیم عام کرنے کے سلسلے میں بہت سی قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱۹۰۵ء میں لکھنو میں ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ خواتین کا ایک اجلاس بلایا گیا جس میں یہ طے کیا گیا کہ علی گڑھ میں خواتین اساتذہ کی تربیت کے لئے ایک اسکول قائم کیا جائے۔ اس سے پہلے ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے بمبئی اجلاس میں خواتین میں اعتماد اور تنظیم کی نئی لہر پیدا ہوئی اور ان کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ پردے کے پیچھے سے کانفرنس میں شرکت کرسکتی ہیں۔ اس موقع پر مدارس کی نمائندہ چاند بیگم کا خواتین کی تعلیم پر لکھا ہوا مقالہ ایک پارسی خاتون نے پڑھا جس میں مصنفہ نے عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کی شدت سے مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ رجعت پسند، مولویوں نے خدا اور رسول کے احکامات کے خلاف عورتوں کو گھر کی چاردیواری کے اندر مقید کر رکھا ہے۔ اس کانفرنس میں ایک پارسی خاتون سوزی سہراب جی نے بھی خواتین کی تعلیم پر ایک پرزور مقالہ پڑھا۔

مسلمان خواتین کے تعلیمی ادارے اور انجمنیں:

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا آغاز سرسید احمد خان نے ۱۸۸۲ء میں کیا تھا۔ اسکی ایک شاخ ۱۸۹۰ء میں تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے قائم کی گئی۔ خان بہادر شیخ عبداللہ اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ وہ اور ان کی بیگم تعلیم نسواں کی تحریک کو بڑھانے میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے عورتوں کے لئے رسالہ ''خاتون'' جاری کیا۔

۱۹۰۶ء میں خان بہادر شیخ عبداللہ اور ان کی بیوی نے علی گڑھ میں ایک کرائے کی عمارت میں خواتین کا ایک اسکول قائم کیا جس کے قیام پر مس نذرالباقر نے لکھا ''اب تو ہمارے لئے جو کچھ بھی ہوگا علی گڑھ سے ہوگا''۔ یہ اسکول بعد میں ہائی اسکول بنادیا گیا۔ اس کی عمارت کا افتتاح بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم نے کیا جو بہت روشن دماغ

حکمراں تھیں اور خواتین کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی رکھتی تھیں۔ انہوں نے نہ صرف بھوپال بلکہ پورے ملک کی خواتین کی تعلیمی سرگرمیوں کی ہمت افزائی کی۔

بیگم بھوپال نے اپنی ریاست میں لڑکیوں کے لئے اسکول قائم کیا۔ شیخ عبداللہ کے قائم کردہ علیگڑھ اسکول کی مالی اعانت کی۔ وہ تعلیم نسواں کے میدان میں ہر اعتبار سے مددگار ثابت ہوئیں۔ انہوں نے تہذیب نسواں اور تربیت نسواں کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب خود لکھی اور ملک کے بڑے بڑے مصنفین کو خواتین کے لئے کتابیں لکھنے اور مرتب کرنے پر مامور کیا۔ مولانا حالی نے انہی کی تحریک پر ایک معیاری کتاب ''مجالس النساء'' لکھی جو عرصے تک لڑکیوں کے نصاب کا حصہ رہی۔ شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم نے انجمن خواتین اسلام کی بنیاد بھی رکھی۔ آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کے وجود میں آنے سے نہ صرف تعلیم نسواں کی تحریک کو فروغ ملا بلکہ ہندوستان کی پڑھی لکھی روشن خیال خواتین کو ایک ایسا پلیٹ فارم مل گیا جہاں وہ اپنی سرگرمیوں کے لئے ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کرسکیں اور ان پر عملدرآمد کے لئے متحدہ کوشش کرسکیں۔ ۱۹۰۸ء میں انجمن خواتین اسلام کی بنیاد رکھی گئی سرمحمد شفیع کی اہلیہ، اس کی صدر اور مولوی محبوب عالم ''ایڈیٹر پیسہ اخبار'' کی بیٹی فاطمہ بیگم اس کی سیکریٹری بنیں۔

'' فاطمہ بیگم زخ ش کی بڑی بہن احمدی بیگم نکہت کی سہیلی تھیں۔ احمدی بیگم اور زخ ش سے ان کی خط و کتابت بھی تھی اور ملاقاتیں بھی۔اس انجمن کے اجلاس منعقدہ یکم اپریل ۱۹۱۵ء میں اخفائے نام کے ساتھ زخ ش کی نظم ''مہذب بہنوں سے خطاب'' پڑھی گئی۔'' ۵

جسٹس سید کرامت حسین نے جن کی پرزور تائید سے ۱۸۹۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ نسائی تعلیم کے لئے کانفرنس کو فعال کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنے ذاتی سرمائے سے جو دولاکھ روپے تھی، لڑکیوں کے لئے اسکول قائم کیا۔ راجہ صاحب محمودآباد، سرمحمدعلی خان نے بھی انکی مدد کی اور لکھنو میں لڑکیوں کے لئے تھویٹ کراس گرلز اسکول قائم کیا۔ یہ ایک بڑے رقبے پر دومنزلہ عمارت تھی جس میں ہوسٹل بھی بنایا گیا۔ بعد میں اس کا نام بدل کر کرامت حسین مسلم گرلز کالج رکھ دیا گیا کراس تھویٹ اسکول جس کا نام صوبے کے گورنر کے نام پر تھا الہ آباد منتقل کردیا گیا۔

مسلمانوں میں تعلیم کا چرچا ہوا تو با اثر خواتین تعلیم کو عام کرنے میں متحرک ہوگئیں۔ انہوں نے اپنے اثاثے نسواں کے لئے وقف کردیئے۔

آگرہ میں ۱۹۱۲ء تک کوئی زنانہ اسکول نہیں تھا البتہ چند مکاتب تھے جن میں خواندہ بیبیاں اپنے شوق سے

پڑھاتی تھیں۔ یہاں مولوی سعید احمد زبیری کی کوشش سے ایک صغیر فاطمہ نسواں اسکول قائم ہوا۔ صغیر فاطمہ کا نوجوانی میں انتقال ہوا تھا۔ انکے والدین نے انکا زیور اور اثاثہ اس اسکول کے لئے مولوی سعید احمد کے سپرد کیا۔

بہار میں صغریٰ بیگم نے اپنی جائیداد صغریٰ وقف کے نام سے خواتین کی تعلیم کے لئے وقف کردی۔ نواب بیگم بھاولپور نے ''دارالعلوم ندوہ'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ بیگم صغریٰ ہمائیوں مرزا نے ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد دکن میں خواتین کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جس کی زمین اور عمارت کے تمام اخراجات انہوں نے خود برداشت کئے۔ انہوں نے تعلیم نسواں کے لئے اپنی پوری جائیداد سے جو ۴لاکھ روپے تھی ایک وقف قائم کیا۔ بمبئی میں ایک تاجر حاجی محمد اسمٰعیل کی کوششوں سے تعلیم کا چرچا ہوا جس کے اثرات اطراف کے علاقوں پر بھی پڑے وہاں عطیہ فیضی نے اپنی بہنوں زہرہ اور نازلی بیگم آف جنجیرہ کے ساتھ ایک اسکول قائم کیا جس میں فنونِ لطیفہ کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور نے ۱۸۸۴ء میں ہی مدارس نسواں کا اجراء کردیا تھا۔ ۱۸۹۴ء تک ان کی تعداد ۱۵ تھی جبکہ طالبات کی تعداد تقریباً ۵۰۰ تھی۔ ۱۹۲۳ء میں ان کا انتظام ایک زنانہ کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کردیا گیا۔ اس کمیٹی نے ۱۹۲۵ء میں ایک مدرسے کو مڈل اسکول تک ترقی دی اور انگریزی تعلیم بھی رائج کی۔

۱۹۱۳ء میں سید نذر محی الدین نے جو بٹالہ کے سجادہ نشیں تھے گجرانوالہ میں لڑکیوں کے لئے ایک اسکول بنایا، مولانا عبدالحق عباسی نے ۱۹۲۶ء میں جالندھر میں لڑکیوں کے لئے ''مدرسۃ البنات'' قائم کیا۔ بنگال میں سہروردی خاندان اپنی علمی روایات کے لئے نمایاں ہے خجستہ اختر سہروردی (بیگم شائستہ اکرام اللہ کی پھوپھی) پہلی مسلمان خاتون تھیں جنہوں نے کلکتہ سے سینئر کیمبرج امتحان پاس کیا۔ انہوں نے مدناپور اور کلکتہ میں مسلمان لڑکیوں کے لئے اسکول قائم کئے۔ مشنریوں کے قائم کردہ اسکولوں سے بھی بعض مسلمان بچیوں نے استفادہ کیا۔ ان میں لکھنو کا ازابیلا تھابرنو کالج جو ۱۸۷۰ء میں مسز ازابیلا تھابر نے ایک کمرے میں ابتدائی اسکول کی حیثیت سے کھولا تھا جس میں صرف چھ طالبات تھیں۔ ۱۸۸۶ء میں یہ کالج کے درجے تک پہنچ گیا۔ بعد میں اسکا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے ہوا اور جب لکھنو یونیورسٹی قائم ہوئی تو یہ اسکا زنانہ حصہ بن گیا۔ ۱۹۰۷ء میں پہلی مرتبہ دو کشمیری مسلمان طالبات اس میں داخل ہوئیں۔ ۱۹۲۷ء میں ۵۷ مسلمان طالبات نے اس میں داخلہ لیا جو ملک کے مختلف حصوں سے آئیں تھیں۔

خواتین کی تعلیمی بیداری کا یہ دور سیاسی بیداری کا دور بھی ہے۔ ۱۹۲۲ء کے دوران تحریکِ خلافت کی جدوجہد میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ آبادی بیگم جو بی اماں کے نام سے پہچانی گئیں اپنے دور اور آنے والے دور کے لئے ایک روشن مثال ثابت ہوئیں۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں جب علی برادران اپنے گھر میں نظربندی کی ایک طویل

مدت گزار رہے تھے اور انگریز حکومت نے ان کے خلاف اس قسم کے الزامات لگائے تھے جو اگر ثابت ہوجاتے تو انہیں سزائے موت ہوجاتی لیکن اس کے باوجود نہ تو بی اماں ڈریں نہ ان کے قدم ڈگمگائے۔ برطانوی ہوم آفس کا پیغام لے کر ایک مسلمان سرکاری افسران کے گھر آئے اور ان سے کہا کہ اگر علی برادران حکومت وقت کی مخالفت سے باز آجائیں اور اس سلسلے میں ایک تحریری ضمانت دیدیں تو انکو رہائی مل جائے گی۔ جب بی اماں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بے حد ناراض ہوئیں اور انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا:

''میں نے تمہاری پرورش اس لئے کی ہے کہ تم اسلام کے سپاہی بنو اس لئے نہیں کہ تم کم ہمتی دکھاؤ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی اور اگر تم نے اس تحریر پر دستخط کئے تو میں خود اپنے کمزور ہاتھوں سے تمہارے گلے گھونٹ دونگی۔''

۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی کے کانووکیشن کے موقع پر جس کی صدارت حکیم اجمل خان کررہے تھے، بی اماں نے کہا:

''میں نے لال قلعہ پر سے اپنا جھنڈا اتارا جاتے ہوئے دیکھا ہے، میری تمنا ہے کہ میں اس پر سے غیرملکی جھنڈا اترتے ہوئے دیکھوں۔''

بی اماں نہ صرف خود تحریک خلافت کے دوران باہر آکر میدانِ عمل میں سرگرم ہوئیں بلکہ اپنی نوجوان بہو امجدی بیگم، بانو بیگم مولانا محمد علی کو بھی ساتھ لانا شروع کیا جن سے مسلمان خواتین میں جدوجہد آزادی میں شرکت کا حوصلہ پیدا ہوا۔ زخ ش نے ان خواتین کی عظمت اور جرأت کا ذکر بار بار کیا ہے جن کی تفصیلات آئندہ ابواب میں آئے گی۔ یہی دور زخ ش کے فکری اظہار کے عروج کا تھا جب انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ وہ نظم و نثر دونوں اصناف میں اپنے خیالات کو دوسروں تک خصوصاً ہندوستان کی خواتین تک پہنچاتی رہیں۔

زخ ش نے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں بھرپور دلچسپی لی۔ ان کی منظوم اپیل جو یونیورسٹی کے چندے کے لئے لکھی تھی۔ ماہنامہ عصمت کے شمارے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔

اے فخر قوم بہنوں عصمت شعار بہنوں
مردوں کی ہو ازل سے تم غم گسار بہنوں

یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور دیگر رسائل و اخبارات نے بھی اسے اپنی اشاعت میں شامل کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں زخ ش کے قلمی و عملی معاونت کی تصویرکشی انیسہ خاتون شروانی یوں کرتی ہیں۔

’’جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس زمانے کے اہم قومی وسائل میں ایک معاملہ مسلم یونیورسٹی یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا بھی تھا جس کی پیچیدگیوں نے مسلم پبلک کو نہایت غیر مطمئن اور بے چین بنا رکھا تھا اس کا گورنمنٹ کی طرف سے جو کچھ فیصلہ ہوا (یعنی اجازت نامہ بشرط عدم الحاق و تبدیلی نام) وہ مسلمانوں کے لئے سراسر غیر خوشگوار تھا مگر اس کی قبولیت کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔زاہدہ خاتون نے اس سلسلے میں خاصی دلچسپی لی اور یونیورسٹی کیلئے ذاتی فراہمی چندا کے علاوہ زخ ش کے نام سے رسالہ خاتون علی گڑھ میں ملکی بہنوں کے نام ایک منظوم اپیل شائع کرائی جس کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی اور ملک کے متعدد اخبارات نے اس کی نقل شائع کی‘‘۔......[۲]

زخ ش نے منظوم اپیل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت پر اثر مضمون مسلم یونیورسٹی ضرور قائم ہونی چاہئے کہ عنوان سے لکھا جس میں خواتین کے مخاطب کر کے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس یونیورسٹی کے قیام میں رائے عامہ کا حصہ بنیں اس مضمون میں برصغیر کے مسلمانوں کے مسائل سے انکا سچا لگاؤ‘ اس کے حل میں پوری دیانت و ذہانت سے اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش اور خلوص نیت بہت واضح ہے۔ یہ مضمون دیکھئے۔

مسلم یونیورسٹی ضرور قائم ہونی چاہئے:

’’فی الحال مسلمانان ہند کے لئے سب سے زیادہ اہم‘ سب سے زیادہ قابل غور‘ سب سے زیادہ بحث طلب ’’محمڈن یونیورسٹی‘‘ کا مسئلہ ہے۔ جس کی اہمیت نے کل اہل الرائے کی توجہ کو گردو پیش سے ہٹا کر صرف اپنی طرف منعطف کرالیا ہے اور قومی اخبارات کے کالم گویا اپنے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ کوئی اخبار یونیورسٹی کے وجود کو اشد ضروری بتاتا ہے۔ کوئی بالکل فضول ۔لیکن ہم مستورات نے ایسے عظیم الشان مسئلہ پر کچھ نوٹس نہیں لیا۔ حالانکہ یہ بحث جس حد تک مردوں کے لئے ضروری ہے تقریباً اُتنی ہی ہمارے لیے ۔ اخبار تہذیب نسواں نے البتہ چند اڈیٹوریل نوٹس اور مراسلات اس کی نسبت سے شائع کیں۔ لیکن وہاں ایک طرفہ بحث ہورہی ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ دوسرے پہلو (فوائد یونیورسٹی) پر بھی کچھ روشنی ڈالوں۔

آج سے چند ماہ قبل کس کو یہ خیال آ سکتا تھا کہ جس سال کے پُر ارمان آغاز میں تمام مسلمان یونیورسٹی لینے پر اڑے ہوئے ہیں اور ’’یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید‘‘ کے مصداق ہیں حتیٰ کہ اس سرگرمی اور متفقہ جوش سے متاثر

ہوکرشمس العلما حافظ نذیر احمد مرحوم کی زبان پر بھی یہ الفاظ آ گئے۔

''کلمہ لاالٰہ اِلّااللہ محمدالرّسُول اللہ کے بعد میں نے تو مسلمانوں کو کسی بات پر اس عموم کے ساتھ متفق ہوتے دیکھا نہیں جیسا وہ آج کل اپنی یونیورسٹی بنانے کے لیے۔''

کل وہی مسلمان اسی سال کے پُرحرمان خاتمہ پر اس بات میں اختلاف کرنے لگیں گے کہ یونیورسٹی فنڈ کس کام میں خرچ کیا جائے؟

کون جان سکتا تھا کہ یہی اہل اسلام جو آج متفق اللفظ ہوکر ''مسلم یونیورسٹی پر حیات اسلام کا دارومدار ہے'' کی رٹ لگا رہے ہیں۔ صرف چند ماہ بعد ''اگر یونیورسٹی قبلہ ہوتو نماز نہ پڑھیں'' کہنے لگیں گے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

اس حیرت انگیز انقلاب کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت میں داخل ہے کہ بشاش اور بیگانہ غم دل ایک آدھ رنج و ناامیدی کو ہنسی خوشی برداشت کرلیتا ہے' لیکن ایک غم والم سے بھرا ہوا دل۔ ایک تفکرات سے پریشان دماغ کسی مزید اُفتاد کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

مسلمان' مظلوم' دل شکستہ' پے در پے مصائب سے تنگ آئے ہوئے مسلمان سیکرٹری آف اسٹیٹ کی اس تازہ عنات سے بالکل از خود رفتہ ہوگئے۔ مرتے کو مارے شاہ مدار۔

برق میرا آشیاں کب کا جلا کرلے گئی کچھ جو خاکستر بچا' آندھی اُڑا کر لے گئی

ہمارے زخم دل پر نمک پاشی کی گئی ہمارا جام مصائب لبریز ہوگیا۔ پس اگر فرط یاس سے دفعتہ ہمارے مونھ سے نکل گیا کہ ایسی محدود الاثر یونیورسٹی کو ہمارا دور سے سلام ہےتو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ ہمیں یکا یک اس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا جسکا سان وگمان تک نہ تھا۔ امید کے بعد ناامیدی نہایت دردناک چیز ہے۔ اگر سرکار حشمت مدار کا قصد مختص المقام اور اس پر بھی محدود الاثر یونیورسٹی دینے کا تھا تو ہمیں اس خوشگوار خواب سے چونکا کیوں نہ دیا کہ ہمیں ایک کامل الاختیار اور حق الحاق رکھنے والا دارالعلوم نہ ملے گا۔ گورنمنٹ نے نہ صرف ہمارے جوش وخروش کو خاموشی سے دیکھا بلکہ ہر موقعہ پر اپنے طرز عمل سے ہماری حوصلہ افزائی فرما کر ہمیں یقین دلا دیا کہ اس ہاتھ سے چندہ جمع کرو اور اُس ہاتھ سے مونھ مانگا چارٹر لو۔

آزیبل ممبر صیغۂ تعلیم کے وعدے (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دہلی کے موقع پر) اور 31 اگست کی چٹھی سے ہم سب کو یقین ہوگیا کہ اگر گورنمنٹ عالیہ ہم کو یونیورسٹی کے بارے میں گرانقدر امداد نہ دیگی تو کم از کم سنگ راہ بھی نہ ہوگی۔ ناگہاں پریس کمونیک نے ہمارے جوش کو سرد ہمارے حوصلہ کو پست' ہماری حسرتوں کو پامال کرڈالا' ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

لبرل اخبارات فریاد کرنے لگے کہ مسلمانوں جیسی وفادار (بلکہ جاں نثار رعایا) کے ساتھ یہ سلوک لازم نہ تھا اگر لارڈ کریو بہادر کا پہلے ہی سے ایسا قصد تھا تو ہماری امیدوں کو درجہ یقین حد تک پہونچا دینا کچھ زیادہ مناسب نہ ہوا۔

اس نازک موقع پر اس مقدس و محرم فرقہ کو (جسے علی گڑھ کے نام سے چڑ ہے) الزام دہی کا نادر موقع ہاتھ لگا۔ نزلہ گرا عضو ضعیف پر انہوں نے بلا کسی ادنی سی دلیل کے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ سارا کیا دھرا علی گڑھ والوں کا ہے جنہیں اچھی طرح علم تھا کہ سرکار الحانی یونیورسٹی دینے والی آسامی نہیں مگر انہوں نے دیدہ و دانستہ قوم کو مغالطہ میں رکھا۔

اس کے جواب میں اہل علیگڑھ صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

قیل ان الالٰہ ذو ولدٍ	قیل ان الرسول قد کھنا
کہا گیا کہ اللہ صاحب اولاد ہے	کہا گیا کہ رسول ساحر تھے
ما نجی اللہ والرسول معاً	من لسان الوریٰ فکیف انا

جب اللہ اور رسول نے زبان مخلوق سے نجات نہ پائی تو ہم کیونکر (پا سکتے ہیں)

اس جملہ معترضہ کے بعد اب پھر اصل مقصود کی طرف رجوع کرتی ہوں۔

معزز حضرات! آپ کی مایوسی بجا' آپ کا غصہ برمحل لیکن صرف اتنی عرض ہے کہ جس پاک مذہب کے آپ نام لیوا ہیں ذرا اس کی عدیم النظیر تعلیم اور اُس کی مفید الشان احکام کا بھی خیال رہے۔ کلام اللہ میں جا بجا خدا کی رحمت سے مایوس ہونا کا کس قدر جرم عظیم بتایا گیا ہے۔ اور احادیث صحیحہ میں "خدروتانی فے الامور" کی کتنی تاکید ہے۔

سال نہیں' دو سال نہیں' قریبا نصف صدی کے متفق علیہ مسلہ (محمڈن یونیورسٹی) سے یک لخت ہاتھ اٹھالینا' اور چند شرائط کے پیچھے ایک ایسی بے بہا چیز کو جسکے لیے سر بر آوردگان قوم نے خون اور پسینہ ایک کردیا' کھو بیٹھنا اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارنا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سرہارکورٹ بالقابہ نے مسلم وہندو یونیورسٹیز کو جن شرائط سے مشروط کیا ہے ان کی پابندی سے ہمیں ۳۰ سے ۳۵ لاکھ کے سرمایہ سے صرف یونیورسٹی آف علی گڑھ ملے گی جس پر کوہ کندن وکاہ برآور دن کی مثال یاد آجاتی ہے۔ جواباً عرض ہے۔

غیرالحاقی یونیورسٹی قلیل المنفعت ضرور ہے مگر نہ اتنی جتنی آپ نے سمجھ رکھی ہے ہماری یونیورسٹی علی گڑھ ہی میں محدود رہ کر وہ کام کرسکتی ہے۔ جس کے آپ الحاقی یونیورسٹی سے متوقع ہیں۔ ہاں اتنا حرج ضرور ہوگا کہ گھر بیٹھے نہیں بلکہ سفروسیرظفر کے ذریعہ سے ہم علی گڑھ ہی میں متعدد کالج قائم کرکے اطراف ہند کے طالبان علم کو مدعو کرسکتے ہیں۔

کیا کوئی صوبہ ایسا ہے جو ایم اے او کالج سے محروم الفیض رہا ہو۔ کیا وہ ایک مقامی درسگاہ نہیں؟

ولایت کے نہایت نام آور دارالعلوم آکسفورڈ یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی مختص المقام درسگاہیں ہیں۔ لیکن کیاں اُن کا چشمہ فیض دور دور کے تشنہ گان علم کو سیراب نہیں کرتا۔

علاوہ ازیں ہمیں قوی بلکہ کامل یقین ہے کہ اگر ہم بالاتفاق اسی بات پر اڑے رہے اور باقاعدہ ایجی ٹیشن (آئینی مجاہرہ) سے کام لیتے رہے کہ گورنمنٹ ان قیود سے ہمیں آزاد کردے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری پیاری اور عادل گورنمنٹ ہماری مسلسل مگر مودبانہ عرضداشتوں پر توجہ مبذول نہ فرمائیگی۔ اور کم از کم اسکولوں کے الحاق کا حق عطا نہ کرگی۔

تنسیخ تقسیم بنگالہ نے یہ امر روزروشن کی طرح ثابت کردیا ہے کہ ہماری لبرل اور حریت پسند گورنمنٹ ایجی ٹیشن سے کس قدر متاثر ہوتی ہے۔

رہا یہ امر کہ گورنمنٹ عالیہ مسلم و ہندو یونیورسٹیوں کو علیگڑھ بنارس ہی سے موسوم کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تجویز میں ہمارا عملی نقصان ذرہ برابر نہیں مثل مشہور ہی کے نام سے کیا کام؟ ہمیں پہلے ہی امید تھی کہ محمڈن یونیورسٹی کا نام خود بخود علی گڑھ یونیورسٹی پڑجائے گا جس طرح محمڈن کالج کا نام علی گڑھ کالج مشہور ہوگیا۔

بیشک ہمارے لیے یہ امر روح فرسا ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹی سے جان سے پیارا لفظ ''مسلم'' علیحدہ کریں۔ لیکن جب ہم حقیقت میں مسلم ہیں تو اس حسبی صدہا دلشکنیوں کا متحمل ہونا پڑیگا۔ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

میں اس موقع پر ہندو نیشن سے آفریں کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یونیورسٹی کے معاملہ میں اُن کی نچی تلی

روش اس قابل ہے کہ ہمارے اہل الرائے اسپر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ اگر ہمارے برادران وطن پالٹکس میں ہم سے بیس قدم آگے ہیں تو تعلیم میں چالیس قدم۔

انہوں نے سرکار کے فیصلہ کا ایک ایک حرف نہایت خاموشی، متانت اور تحمل سے سنا۔ اور ہر چہ از دوست میرسد نیکوست سمجھ کر اسپر سر تسلیم خم کیا۔ اگر اسکا ان پر کچھ اثرا ہوتو صرف یہ کہ پہلے سے دو چند تندہی سے چندہ جمع کرنے میں منہمک ہوگئے ۔وصولی زر کی رفتار پہلے سے دوگنی ہوگئی۔مسٹر مالوی اور مسز اینی بیسنٹ اطراف ہند میں اس کے لیے دورہ کرنے لگے۔ یہ عجیب وغریب خیال تو اتنی بڑی قوم کے کسی فرد کے دماغ میں نہ آیا کہ لو کہ چارٹر واپس کردو اور یونیورسٹی کا خیال ہی چھوڑ دو۔

اس وقت مایوسی نے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ اور ہمیں نیک و بد کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ لیکن جب تیر کمان سے چھوٹ جائیگا۔ جب ہندو یونیورسٹی ماشاء اللہ بصد آب و تاب اپنی قوم کی علمی تشنگی بجھارہی ہوگی۔ جب ہماری آئندہ نسل سرکاری قیود سے تنگ آ کر ''اسلامی یونیورسٹی، اسلامی یونیورسٹی'' کی صدا بلند کرے گی۔ اور جب ہمارے نوجوان ہماری پست ہمتی و کوتاہ بینی پر نفرین کرینگے جب ہماری بے حد جانفشانی کا سرمایہ برباد ہو چکا ہوگا جب یونیورسٹی قائم کرنے کا موقع ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل جا چکا ہوگا۔ اُس وقت آہ اس حسرت ناک وقت میں ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم نے کیا کیا اور کیا کرنا چاہیے تھا؟ لیکن مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خود باید زد۔

گر نہیں سنتے قول حالی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

اے عزیز قوم!!! آب رفتہ در جوئی آید۔ اٹھو بہتی گنگا میں ہاتھ موئنھ دھولو۔ ورنہ پھر اشک سے موئنھ دھویا تو کیا حاصل؟

مسلمانوں نے ہندوؤں سے بدرجہا زیادہ جوش اور فیاضی سے محمڈن یونیورسٹی کا خیر مقدم کیا تھا۔ لیکن مسٹر ٹیلر کی ایک چھٹی نے آں قدح بشکست و آں ساقی نماند کا سماں پیدا کردیا۔ ہائے کیا یونیورسٹی کا حشر بھی ہمارے ہاتھوں وہی ہوگا جو جنگ واٹلی ٹرکی سے نہیں نہیں ''اطالین ڈاکہ'' سے اظہار جوش کا ہوا کہ نہ اب وہ مظلوم ٹرکی کی مالی امداد ہے اور نہ اسکے حق میں دعائے خیر۔ نہ اٹلی کے ناپاک مال کا پائی کاٹ۔

پیاری قوم! میں حیران ہوں کہ تیرے جوش کو آب رواں کی لہریں کہوں یا ہانڈی کا اُبال؟ صابون کے جھاگوں سے تشبیہہ دوں یا سوڈا واٹر کے بلبلوں سے۔

اے قوم! اے بدنصیب قوم! تو کب تک اغیار کو ہم پر ہنسوائے گی'

میں اس مضمون کو اپنے ناچیز قطعہ تاریخ پر (جو میں نے مسلم یونیورسٹی کے حسرتناک خاتمہ پر موزوں کیا ہے ختم کرتی ہوں۔

قطعۂ تاریخ

چو یونیورسٹی را کرد محدود الاثر قیصر	دل اسلامیاں شد پرورش گاہ شکایت ہا
چہ ساز دیا جہاں یک ملت و صد گونہ آفتہا	جہاں دشمن' فلک بدخواہ' بخت قوم برگشتہ
خرد گفتہ بگوشم' سال ہم گو' خون حسرتہا	بصد حسرت چو گفتم خون حسرتہائے مسلم شد

......۷

زخ ش اپنے خطوط میں بھی تعلیم نسواں کی حمایت اور اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی رہیں کہ برصغیر کی جاہلانہ رسوم و رواج کی بنا پر انہیں باقاعدہ درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیلٰی بانو خواجہ بانو کو ایک خط میں اپنے والد کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''تعلیم نسواں کے تو وہ اس قدر زبردست حامی ہیں کہ شاید احرار کے گروہ میں بھی بہت کم ان کے ہم خیال ہوں گے۔ وہ تو عام قومی رائے کے برخلاف انگریزی کی انتہائی تعلیم کو بھی لڑکیوں کے لیے ناپسند نہیں کرتے۔ بس بات صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی پرانی خاندانی آن کو یکدم الٹا دینا پسند نہیں فرماتے اور نہ اہلِ خاندان کو ناراض کرنا قرین مصلحت سمجھتے ہیں۔

درحقیقت تعلیم نسواں (عام طور پر) رائج نہ ہونے کے باعث ہمارے باعث ریفارم اسکیم یا اصلاحی تدبیر جاری ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ سب سے پہلے اسکے خلاف جہاد کرنے کے لئے خود بیگمات ہی کمربستہ ہوں گی۔''......۸

اسی دور میں نسائی تعلیم کی تحریکوں کے زیر اثر خواتین کے رسائل کا اجراء بھی ہوا۔ ایسی ناولیں لکھی گئیں جن کے مصنفین نے پہلی مرتبہ برصغیر کی خواتین کو پیش نظر رکھا اور اس حقیقت کو عام کیا کہ خواتین کی بھی کتابوں تک رسائی ہونی چاہیئے۔

ابتدائی نسائی ناول

سرسید کے جن ہم عصروں نے خواتین کی بیداری اور تعلیمی ترقی کے لئے اپنے علم اور قلم کو ذریعہ بنایا اور ایسی کتابیں تحریر کیں جو خواتین کے فکری ارتقاء کی بنیاد بنیں ان میں ڈپٹی نذیر احمد سرفہرست ہیں۔ یہ کتابیں نہ صرف نسائی تعلیم کے محرک ثابت ہوئیں بلکہ ایسا نمونہ بھی بنیں جنہیں سامنے رکھ کر اُس زمانے میں لکھنے والیوں نے تحریر و تالیف کی ابتداء کی۔

کسی بھی دور کے سماجی، تہذیبی اور فکری رجحان کا اندازہ اس زمانے میں لکھے جانے والے ادب سے لگایا جاسکتا ہے۔ سرسید احمد خان کی جدید تعلیم کی تحریک کے نمایاں اثرات ان کے دور میں ناولوں کی تخلیق اور اشاعت کا باعث ہوئے۔ یہ ناول اس عہد کی تہذیبی معاشرت کے آئینہ دار بھی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اس کی نمایاں مثال ہیں۔

مراۃ العروس ۱۸۶۹ء:

یہ اردو کا پہلا ناول ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا ناول بھی ہے جو نسائی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔اس ناول کے دو مرکزی کردار اکبری اور اصغری ہیں۔ اکبری کے ذریعہ جہالت اور جہالت سے پیدا ہونے والی تنگ نظری، کم عقلی، پھوہڑپن اور نتیجتاً رونما ہونے والے نقصانات کو پیش کیا گیا ہے۔ اصغری کے ذریعہ جو اکبری کی چھوٹی بہن ہے، تعلیم کی خوبیوں اور اس سے پیدا ہونے والی سوجھ بوجھ، شائستگی اور سلیقہ، اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے فوائد کو پیش کیا گیا ہے۔ اگلی نسل میں علم کی منتقلی سے اصغری نہ صرف اپنے گھر اور خاندان کی اصلاح کرتی ہے بلکہ دوسری لڑکیوں کو بھی تعلیم دینے میں پیش پیش رہتی ہے۔ اس ناول میں ایک کردار حسن آراء کا بھی ہے۔ جس کی تعلیم و تربیت کے لئے اصغری کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ حسن آراء ہی ڈپٹی نذیر احمد کے دوسرے ناول بنات النعش کا مرکزی کردار ہے۔

بنات النعش ۱۸۷۳ء:

اس ناول کو دراصل مراۃ العروس کا تکملہ سمجھنا چاہیئے۔ حسن آراء جو امیر لیکن جاہل گھرانے کی بگڑی ہوئی لڑکی ہے اسے گھر کی ایک خاتون شاہ زمانی بیگم کے مشورے پر اصغری بیگم کی شاگردی میں دے دیا جاتا ہے تاکہ صحیح تعلیم و تربیت ہو سکے۔ اصغری بیگم کی توجہ حسن آراء پر خوشگوار اثر ڈالتی ہے اور وہ ایک تعلیم یافتہ سلیقہ شعار لڑکی کے روپ میں ڈھل جاتی ہے۔ بنات النعش میں ڈپٹی نذیر احمد نے عورتوں کی جہالت سے پیدا ہونے والے برے نتائج واضح کرنے کے ساتھ

ساتھ جدید علوم کے حصول کی ترغیب بھی دی ہے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کا گھر سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس ناول میں حسن آراء تعلیم کے لئے اصغری کے گھر بھیجنے پر آمادگی اس رویہ پر عملی تنقید ہے۔ مراۃ العروس اور بنات النعش ایک ہ مقصد کے تحت لکھے گئے ناول ہیں۔ ان میں لڑکیوں کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق تعلیم مہیا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ گھر اور معاشرے میں مثبت کردار ادا کرسکیں اور ان نقصانات سے محفوظ رہ سکیں جو لا علمی کی وجہ سے انہیں اور انکے خاندان کو پہنچتا ہے۔

توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء:

ڈپٹی نذیر احمد کا ایسا ناول ہے جو اپنے موضوع میں نسبتاً زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ اس میں تعلیم بھی ہے، اور نصیحت بھی۔ انہوں نے اس ناول کے ذریعے تعلیم و تربیت، اخلاق کی اصلاح اور رویوں میں اعتدال کی جانب توجہ دلائی۔

''سرسید نے یہ سچ کہا تھا کہ مرد جب تعلیم پالیں گے تو وہ عورتوں کی تعلیم کا خود انتظام کرلیں گے۔ ان ہی کے کالج کے پڑھے ہوئے طالبعلموں نے تحریک نسواں کو تقویت دی۔ چاہے وہ خواجہ غلام الثقلین ہو یا شیخ محمد عبداللہ ہوں''

جب ہم تعلیم نسواں اور نسائی بیداری کی تحریک کے ابتدائی ایام کا جائزہ لیتے ہیں تو الطاف حسین حالی، سرسید کے ان ساتھیوں میں نمایاں نظر آتے ہیں جو دل سے خواتین کی ترقی کے حامی تھے اور ہندوستانی عورتوں کی زبوں حالی کا پورا احساس رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

''ہمارا معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک ہماری عورتوں کی تعلیم نہیں ہوگی۔ سماج سے غلط رسوم کا خاتمہ بھی نہیں ہوسکتا ہے جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں اور وہ خود ان کو غلط نہ سمجھیں۔''

انہوں نے ''چپ کی داد'' اور ''بیوہ کی مناجات'' جیسی پر اثر نظمیں لکھیں۔ مولانا حالی کا ایک اہم کام مجالس النساء کی تصنیف بھی ہے۔

مجالس النساء ۱۸۷۴ء:

یہ کتاب مراۃ العروس کے ۵ سال کے بعد شائع ہوئی۔ اسے لڑکیوں کے نصاب میں شامل کرنے کے مقصد سے لکھا گیا تھا۔ حالی نے اس ناول کو دو حصوں اور ۹ مجلسوں (ابواب) میں تقسیم کیا ہے۔ مجالس النساء کے پہلے حصے

میں زبیدہ کی تعلیم و تربیت اور دوسرے حصے میں سید عباس کی تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دراصل حالی نے لڑکے اور لڑکی دونوں کی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ہر مجلس میں معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے کسی ایک مسئلہ کے متعلق جتنی اچھی باتیں عورتوں کو سکھائی جا سکتی تھیں، انہیں یکجا کر دیا ہے۔ یہ کتاب محکمہ تعلیم مغربی پنجاب کے تعلیمی بورڈ نے نصاب میں شامل کی اور اس کے کئی ایڈیشن یونائیٹڈ گورنمنٹ پبلشر انارکلی، لاہور نے شائع کیے۔

صورۃ الخیال ۱۸۷۶ء:

شاد عظیم آبادی کے لکھے ہوئے اس مقصدی ناول میں مسلمانوں کی تہذیبی، اخلاقی اور ثقافتی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ناول مرکزی کردار ''ولائتی'' کی آپ بیتی کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ جو نامسائد حالات کا مقابلہ بڑی ذہانت اور سمجھداری کے ساتھ کرتی ہے۔ ولائتی ان تمام خوبیوں کی مالک ہے جو اس زمانے کے مسلمان اپنی عورتوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس ناول میں سبق دیا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز سے خوش اسلوبی سے گزرنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ضروری ہے۔

فسانہ خورشیدی ۱۸۶۶ء:

افضل الدین کا لکھا ہوا یہ ناول جدید تعلیم کی اہمیت سمجھانے کی بھرپور شعوری کوشش ہے۔ اس ناول میں ایک انگریز عورت کے ذریعے بیٹیوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے اور بیوہ کے نکاح ثانی کی حمایت کی گئی ہے۔

اصلاح النساء ۱۸۸۱ء:

یہ ناول ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا مگر ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہ کسی خاتون کا لکھا ہوا پہلا ناول ہے جو مصنفہ کے بیٹے نے ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آنے کے بعد شائع کیا۔ ابتدائی ایڈیشن پر والدہ محمد سلیمان لکھا جاتا رہا۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ اب اس کا نیا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں مصنفہ کے اصل نام رشید النساء کے ساتھ چھپا ہے۔ جس میں دیباچہ اول جو خود مصنفہ نے ۱۸۹۳ء میں لکھا تھا کے ساتھ دیباچۂ دوم بیگم ثریا قرنی، دیباچہ ایڈیشن ۲۰۰۰ء سید تصرامام اور دو تفصیلی مضامین بالترتیب ادیب سہیل اور زاہدہ حنا کے لکھے ہوئے شامل ہیں۔ زاہدہ حنا مصنفہ کے تعارف میں لکھتی ہیں:

''رشید النساء جنگ آزادی سے چار برس پہلے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے مغل زوال کو اپنے کانوں سے سنا اور برطانوی عروج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کا خاندان برطانوی ہندوستان سے اقتدار سے جڑا رہا، کئی شمس العلماء، کئی خان بہادر اور کئی نائٹ ان کے بھائی، بھتیجے اور داماد تھے۔ جدید تہذیب کی روشنی ان کے خاندان کے زنان

خانے میں تو نہیں آئی لیکن اس کا عکس زنان خانے کے اندھیرے میں پو پھٹنے کا ملگجا اجالا ضرور پھیلاتا رہا۔

انہوں نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی، اس کے باوجود انہیں زنانہ مدرسہ کھولنے کا شوق بے حد و بے حساب تھا۔ اس شوق کو انہوں نے بیسویں صدی کی ابتداء میں پورا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے ایک زنانہ مدرسہ ''مدرسہ اسلامیہ'' قائم کیا جس کے معائنے کے لئے گورنر بنگال، لیڈی فریزر آئیں، پٹنہ والوں کے لئے زنانہ مدرسے کا قیام اور لیڈی فریزر کا اس کے معائنے کے لئے آنا ایک واقعہ تھا چنانچہ اس واقعے کا تذکرہ بہت دنوں تک شہر اور شہر والوں میں ہوتا رہا۔ یہ مدرسہ کئی برس تک چلتا رہا۔ ڈاکٹر آصفہ واسع کے بیان کے مطابق اس مدرسے کو بعد میں بادشاہ نواب رضوی نے بی این آر اسکول کا نام دیا اور اپنی جائیداد اس کے اخراجات کے لئے مختص کردی۔ مہارانی بیتیا نے اس اسکول کے لئے عمارت دی، اس وجہ سے یہ اسکول ''بیتیا ہاؤس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس اسکول میں ایک ہوسٹل بھی تھا جس کی نگرانی رشید النساء کی بڑی بیٹی نصیب النساء کے حصے میں آئی تھی۔''......۹

اصلاح النساء جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ ایک اصلاحی ناول ہے جو ڈپٹی نذیر احمد سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ مگر یہ ایک عورت کی تحریر ہے جو عورتوں کی معاشرت، درونِ خانہ مسائل سے پوری طرح واقف ہے۔ خود یہ ناول اس کے ذاتی تجربہ کا آئینہ دار بھی ہے۔ رشید النساء خود لکھتی ہیں ''اس کتاب کو پڑھنے سے عورتوں پر زیادہ اثر ہوگا۔ وہ سمجھیں گی کہ اس میں عورتوں کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھ دیکھی بات ہے''

اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ادیب سہیل نے لکھا ہے:

''اصلاح النساء تحریر کرتے ہوئے رشید النساء کے پیش نظر محض یہ مقصد نہیں رہا کہ ناول کے حوالے سے اخلاقی پند و نصائح بیان کر دیئے جائیں، بلکہ انہوں نے اپنے ناول کی اساس عورتوں میں روشن خیالی کے فروغ پر رکھی ہے، وہ عورت کے معاشرے کی ہر اعتبار سے تطہیر چاہتی ہیں، اس کا اظہار ناول میں کہیں متن کی سطح پر ہوتا ہے کہیں اس کے بین السطور اور کہیں کرداروں کی زبان سے''......۱۰

اصلاح النساء کی اشاعت میں 13 سال کی تاخیر پھر اس کے پہلے ایڈیشن پر لکھے ہوئے مصنفہ کے دیباچے میں ان کے سارے مردانہ رشتوں کے حوالے اور خود ان کا اپنا نام نہ ہونا اس زمانے کی مسلم رویوں کی مکمل آئینہ دار ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھنے والی رشید النساء ضعیف المعری میں بھی اپنے نام تک کو پردے میں رکھتی ہیں۔

مولوی نذیراحمد کے زیراثر معاشرتی اصلاحی ناول لکھنے کا ایک سلسلہ شروع ہوا جن کا بنیادی مقصد ان جاہلانہ رسوم و روایات کا خاتمہ تھا جو نسائی تعلیم و ترقی کی راہ میں حائل تھے ان ناولوں میں یہ ثابت کیا جاتا تھا کہ بدمزاج، پھوہڑ، بدتہذیب عورتوں کو صحیح تعلیم و تربیت سے اچھی شخصیت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ناولوں کی قابلِ ذکر مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

منیر بلگرامی کا ناول ''جوہر مقالات'' ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔

مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول، بدرالنساء ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔(یہ ناول پردے کے رواج کے خلاف ہے)

طاہرہ بیگم کا ناول ''نادر جہاں'' ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔

مولوی بشیرالدین نے اپنے والد ڈپٹی نذیراحمد کی تقلید میں کئی ناول لکھے جن میں ''اقبال دلہن'' ۱۹۰۸ء میں اور ''حسن معاشرت'' ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئے۔ مولوی بشیرالدین لکھتے ہیں:

''مجھے مدت سے یہ خیال تھا کہ اگر ہو سکے تو اس راستے پر چلو جس کی داغ بیل، ڈپٹی نذیراحمد، نے ڈالی تھی۔ چنانچہ اس طرز کی یہ کتاب ناظرین کے ملاحظہ کے لئے پیش ہے۔''

حسن معاشرت کے دیباچے میں مولوی بشیرالدین لکھتے ہیں۔

''عورت اور مرد دونوں اگر بالکل ہم رتبہ اور یکساں نہیں ہیں تو ان میں زمین و آسمان کا فرق بھی نہیں ہے۔ جو یہ سو وہ، جو وہ سو یہ، ہم نے کسی بات میں عورت کو ہیٹا نہیں پایا۔ کون سے بات میں وہ مردوں سے پیچھے رہ گئی۔ کیا کوئن وکٹوریہ بہترین از سلاطین یورپ نہیں ثابت ہوئیں، اگر کہو کہ وہ کدھر یورپ ہے، کدھر ہندوستان تو اچھا یہیں والئی بھوپال کو دیکھو ان کی بیدار مغزی، ان کے حسن انتظام ملک سے کس کو انکار ہے۔ قطع نظر اس کے وہ کون سا دروازہ ہے جو مردوں کے لئے کھلا ہے اور عورتوں کے لئے بند ہے۔ ڈاکٹری کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو حاصل، بیرسٹر یہ، حتیٰ کہ امریکہ میں جج بھی یہ۔ کون سی ڈگری ہے جو ان کو حاصل نہیں۔ پس ہمارے دیکھنے میں تو مردوں کو کسی طرح تو تفوق نہیں حاصل ہوا۔ اب رہا یہ سوال کہ ہندوستان کی عورتیں ایسی نہیں، وہ انہی کو سزاوار ہے تو ایسی حالت کیوں ہے۔ اس کے ذمہ دار مرد ہیں۔''

اردو کے یہ ابتدائی ناول اس دور کے مسلم معاشرے کی تعلیمی اور سماجی حالت کے آئینہ دار ہیں۔ ان ناولوں میں ان تحریکوں اور کوششوں کا ذکر بھی ہے جو نسائی تعلیم کے لئے کی گئیں اور ذہنیت اور جہانات کی تبدیلیوں کی شعوری

کوشش اس دور میں ناول کی تکنیک اور کہانی کے پلاٹ پر حاوی رہی۔ مسلمان گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم ہی نہیں ان کے نصاب تک کے سوالات ناولوں میں اٹھائے گئے۔ رشیدالنساء، افضل الدین، شاد عظیم الدین، صغرا ہمایوں اور سید احمد دہلوی نے لڑکیوں کے نساب پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ حالی نے مجالس النساء اسی مقصد کے تحت لکھی تھی کہ یہ نصاب میں شامل کی جائے۔ ان ناولوں نے مسلم معاشرے پر اثرات مرتب کئے۔ ان کے مطالعے سے مسلم گھرانوں میں روشن خیالی اور نسائی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ان ناولوں نے ایسی کتابوں کے ایک ایسے بڑے خلاء کو بھی پر کیا جو اس دور میں خواتین کے لئے کتاب کے موجود نہ ہونے کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اب خواتین کے پڑھنے کے لئے ایسا مواد موجود تھا جس پر اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔

زخ ش کے ذاتی کتب خانے میں بڑی تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔ انہیں اپنے والد کی لائبریری سے بھی استفادے کی اجازت تھی۔ انہوں نے خود بھی فرانسیسی ناول کے فارسی ترجمے سے اردو ترجمہ شروع کیا تھا۔ اس ناول کے ترجمے کی وجہ جو وہ لکھتی ہیں قابل توجہ ہے۔

''پیرلوتی Peirre Loti کی ایک مشہور تصنیف دیز ان شانتے Desenchantees کے ترجمے کا عرصے سے ارادہ تھا، مگر بعض ضروری نظموں کی مشغولیت نے موقع نہیں دیا۔ سردست اس طرف سے چھٹکارا ہے اس لیے آج ہی سے اپنی توجہ کا بیشتر حصہ اس پر صرف کرنا شروع کردیا۔ بھائی ہارون خان صاحب نے 14 فرنچ الفاظ کا حل کر کے میری بہت بڑی اصلاح کی ہے۔

میں نے اس ترجمے کا کیوں ارادہ کیا؟

اس لیئے کہ ادبی محاسن نے گرویدہ کرلیا۔ اس لیے کہ ناول کی ہیروئن میری طرح جاہلانہ ضوابط ورسوم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی گئی ہے۔ اس کے عمومی جذبات حیرت انگریز طور پر میرے احساسات سے ٹکرا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اسکا فرضی نام میرا حقیقی نام ہے۔ پھر بھی بعض مقامات زاہدہ خانم (ہیروئن) کے خیالات میں میرے ساتھ تناقص پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے باپ کو نفرین کرتی ہے۔ شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ ایندرے لیری (ہیرو) سے چوری چھپے ملتی ہے اور دل آزادی کے معنی ''یورپین تقلید'' قرار دیتی ہے۔

بھلا ان باتوں کا کیا ذکر؟......!!

اس ناول کا ترجمہ وہ اپنی نادقت موت کی وجہ سے مکمل نہ کرسکی۔ اُن کی ایک مکالماتی کہانی جو اُس زمانے کے ناولوں کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ رسالہ خاتون میں ۱۹۱۲ء میں چھپی۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک تعلیم یافتہ، خوش اخلاق

اور خوش سیرت خوب سیرت لڑکی حلیمہ ہے۔ اس کا شوہر جبار گریجویٹ ہونے کے باوجود بدمزاج اور بدتمیز ہے۔ جبار کا سلوک بیوی کے ساتھ ظالمانہ ہے وہ نہ صرف حلیمہ پر ظلم کرتا رہا بلکہ ایک نئی بیوی دلپسند نام کی بیاہ لا آیا جو حلیمہ کے گھر پر قابض ہوگئی۔ پھر اس نے حلیمہ کے بیٹے جمیل کو اس سے جدا کردیا اس صدمے سے بچہ سخت بیمار ہوگیا تو اسے واپس ماں کے پاس بھیجنا پڑا۔ دوسری بیوی دلپسند بدتمیز، جاہل اور بدزبان ثابت ہوئی۔ اس کے روز روز کے جھگڑے سے تنگ آکر جبار نے گھر سے باہر رہنا شروع کردیا۔ اس اثناء میں حلیمہ سخت بیمار ہوگئی۔ جبار کو اس کی خبر جمیل سے ملی تو وہ گھر واپس آیا، دلپسند گھر چھوڑ کر اپنی میراثن سہیلی کے پاس جا چکی تھی اور حلیمہ سخت بیمار اور کمزور بستر پر تھی۔ جبار کو اس وقت اپنی زیادتی اور حلیمہ کی قدر کا احساس ہوا اور اس نے لیڈی ڈاکٹر بلا کر اس کا علاج کروایا۔ اُس نے حلیمہ سے معافی مانگ لی۔ اس کہانی سے ایک اقتباس یہاں نقل کررہی ہوں۔

''امۃ الحلیم (حلیمہ) حلیم الطبع منکسر المزاج اور مطیع الفطرت لڑکی تھی سو قسمت سے اُسے اتنا ہی جبار، مغرور اور خودسر شوہر ملا تھا۔ حلیمہ کے سرپرستوں نے ذات، خاندان، دولت، تعلیم، صورت شکل، سب کچھ دیکھ کر داماد تلاش کیا تھا۔ لیکن قسمت کا کون ساتھی ہے؟ کیونکر گمان ہوسکتا تھا کہ ایسے خوشنما لفافہ میں اسقدر ردی خط نکلے گا۔ یعنی اس گندم نما جوفروش لڑکے کے عادات و اخلاق اس قدر مبتذل ہیں۔ وہی مثل ہوئی۔ خوان بڑا خوان پوش بڑا۔ کھول کے دیکھو تو آدھا بڑا۔ معلوم نہیں ناقدر شناس و ناسپاس عبدالجبار چاہتا کیا تھا؟ حلیمہ، بدنصیب حلیمہ، جس طرح حسن سیرت میں یگانہ تھی اسی طرح جمال صورت میں انتخاب زمانہ، نیک مزاج، خوش سلیقہ، خلیق، باحیا، دانشمند لیکن بے عیب خدا کی ذات ہے۔ چنانچہ ایک عیب، ایک ناقابل عفو عیب، اس میں بھی تھا یعنی اسنے گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعلیم پائی تھی، جس سے وہ آزاد طبع اور روشن خیال تھی۔ اسی گناہ کبیرہ نے اسے جبار کی نظروں سے گرادیا تھا۔ شادی کو چار سال ہونے کو آئے مگر جبار کو خدا نے اتنی توفیق نہ دی کہ کبھی اپنی حکم بردار بیوی سے حسن سلوک جائز رکھا ہو۔ لیکن حلیمہ کبھی بھول کر بھی کسی کے سامنے صرف شکوہ زبان پر نہ لائی نہ کبھی سفاک شوہر کے کسی حکم میں لیت ولعل کی۔ اُس نے اپنی تمام کوششیں اس خیال خام میں صرف کردیں کہ جبار کی پیشانی سے بل نکل جائیں۔ لیکن بے سود۔

خوے بد در طبیعتے کہ نشست

نرود تا بروزِ حشر از دست

آج جبار نے حکم دیا تھا کہ صادقہ نہایت آزاد و بے باک ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اُن سے اور تم سے کسی قسم کا تعلق رہے سنا ہے کہ انھوں نے آج اپنے شوہر سے بحث کی اور اس میں وہ جیت گئیں۔ حلیمہ کے جملہ اعزا و احبا اس سے پیشتر علیحدہ ہو چکے تھے۔ صرف صادقہ ہے اُس کی ہمدم و غمخوار تھی۔ یہ لڑکی اس کی ہم عمر اور کلاس فیلو سہیلی تھی۔ باہم حقیقی بہنوں جیسا تعلق تھا۔ ایک منٹ کا فراق شاق تھا۔ حسن اتفاق سے دونوں سہیلیوں کے شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ گریجویٹ تھے مگر

صادقہ کا شوہر نہایت آزاد خیال نوجوان تھا اور ہماری حلیمہ نے ایک بدگمان اور تاریک خیال رفیق حیات پایا تھا۔''......۱۲

اس کہانی کا انداز وہی ہے جو اس زمانے میں مروج تھا۔ ایک عورت بہت اچھی، ایک بہت بری۔ مگر ز خ ش نے اس میں ایسے مرد کا کردار پیش کیا ہے جو بیوی کی خوبی کو عیب سمجھتا ہے۔ بیوی کی تعلیم کی قدر کرنے کے بجائے اسے طعن و تشنیع کا موضوع بناتا ہے۔ اس کہانی کا عنوان ہے''احکم الحاکمین! کیا فریاد مظلوماں میں کچھ اثر نہیں؟'' اور یہ حالی کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

آتا ہے وقت انصاف کا، نزدیک ہے یوم الحساب
مردوں کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

جبکہ اختتام پر وہ لکھتی ہیں۔

''پیاری ناظرات! کب تک آپ کے بے بہا وقت کا خون اپنی گردن پر لوں۔ بہتر ہے کہ جبار کا یہ مصرعہ دہراتی ہوئی آپ سے خداحافظ کہوں۔

ایں کار از تو آید و نسواں چنیں کنند

راقمہ

ر خ ش''......۱۳

اس طرح انہوں نے اپنی صنف کو دعوت فکر دی ہے اور در پردہ، باعمل ہونے کی ہدایت کی ہے۔ اس میں مردوں کے لئے بھی نصیحت موجود ہے۔اُن کا یہ رویہ نظموں میں تو اُن کی پہچان بنا ہے لیکن اس طرح کی کہانی ایک ہی دستیاب ہے۔ اگرچہ انہوں نے روزنامچے میں کئی ایک اور خاتون کا ذکر کرتے ہوئے انکی بپتا کو داستانی انداز میں لکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مگر مختصر حیات نے انہیں نثر میں زیادہ کام کرنے کی مہلت نہ دی۔

حوالہ جات

۱۔ ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ۔ صفحہ نمبر ۵۶۔ ڈاکٹر ثمیس ثمر فضل
۲۔ داستان عہد گل۔ صفحہ نمبر ۵۳۔ قرۃ العین حیدر
۳۔ رسالہ خاتون ۱۹۰۹ء۔ صفحہ نمبر ۱۶ تا ۱۹
۴۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔ صفحہ نمبر ۱۵۱۔ مولوی محمد امین زبیری

۵۔ فردوس تخیل زخ ش۔صفحہ ۱۰۶۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۶۔ حیات زخ ش۔صفحہ نمبر ۴۹۔انیسہ خاتون شروانیہ

۷۔ ماہنامہ خاتون علی گڑھ۔شمارہ اکتوبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۔

۸۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۹۔ دیباچہ زاہدہ حنا۔ ناول اصلاح النساء۔ رشید النساء۔صفحہ نمبر ۹۸

۱۰۔ دیباچہ ادیب سہیل ۔ ناول اصلاح النساء۔ رشید النساء۔صفحہ نمبر ۳

۱۱۔ روزنامچہ زخ ش۔

۱۲۔ خاتون علیگڑھ اپریل ۱۹۱۲۔ صفحہ ۲۵۔۲۴

۱۳۔ خاتون علیگڑھ اپریل ۱۹۱۲۔ صفحہ ۴۵

باب سوم

ابتدائی نسائی اور دیگر رسائل و اخبارات جن میں زخ ش کی تحریریں شائع ہوئیں

اگر چہ برصغیر میں لکھنے والی خواتین ہر دور میں موجود تھیں مگر معاشرتی نظام اور سماجی رویے ایسے تھے کہ اُن کا منظر عام پر آنا تقریباً ناممکن تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے اوائل میں لکھنے والی خواتین کے چند نام سامنے آنے شروع ہوئے جن کی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کا سہرا اُن رسائل کے سر جاتا ہے جن کا اجراء نسائی تعلیمی تحریکوں کے زیر اثر ہوا۔ ان تعلیمی تحریکوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ ایسے رسائل شائع ہونے لگے جو خواتین کی تعلیم کے حامی تھے۔ ان کے شائع کرنے والے وہی چند گنے چنے روشن خیال افراد تھے جو نسائی تعلیم کی تحریک کو آگے بڑھانے کیلئے ان رسالوں کو موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں پہلی مرتبہ اُن خواتین کو اپنی تحریروں اور تخلیقات زنانہ رسائل بھیجنے کا حوصلہ ملا جنھوں نے تعلیم تو حاصل کر لی تھی مگر خط کتابت کی اجازت نہیں تھی۔ برصغیر کے معاشرے میں لڑکیوں کا غیر محرم فرد سے تحریری رابطہ ایسا شرمناک فعل سمجھا جاتا تھا جس سے خاندان کی عزت پر حرف آتا تھا۔ ان رسائل کے اجراء سے یہ ہوا کہ مسلم اشرافیہ کی وہ لڑکیاں اور خواتین جنھوں نے گھر کی چہار دیواری میں تعلیم حاصل کی تھی اپنے ناموں کو اخفاء میں رکھ کر تحریریں رسائل کو بھیجنے لگیں۔ ان میں سب سے اہم نام زخ ش کا ہے جن کی شاعری دس برس تک رسائل و اخبارات میں چھپتی رہی اور انہوں نے اپنا ایک مختصر مجموعہ ''آئینۂ حرم'' ۱۹۱۱ء میں شائع کیا جبکہ دوسرا وقیع مجموعہ ''فردوس تخیل'' اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا جو ان کی وفات کے بعد چھپا۔ اس دوران ان کے مضامین بھی رسائل میں شائع ہوئے اور مدیران جن میں مولوی ممتاز علی، خواجہ حسن نظامی، فاطمہ بیگم، لیلیٰ خواجہ بانو وغیرہ سے خط و کتابت بھی رہی۔ یہاں پر میں ابتدائی نسائی رسائل کا ایک جائزہ پیش کر رہی ہوں پھر ان دیگر اخبارات و رسائل کا ذکر بھی آئے گا جن میں زخ ش کی تخلیقات چھپتی رہیں۔

اخبار النساء ۱۸۸۴ء:

اخبار النساء برصغیر میں خواتین کا اردو کا پہلا اخبار تھا۔ جو ۱۸۸۴ء میں مولوی سید احمد دہلوی موئف فرہنگِ آصفیہ نے جاری کیا تھا۔ اس سے قبل اک اور پرچہ رفیق نسواں لکھنو سے ۱۸۸۴ء ہی میں چھپنا شروع ہوا تھا لیکن یہ عیسائی خواتین کے لیے ایک مخصوص پروپیگنڈہ اخبار تھا۔ اخبار النساء میں اس قسم کی قید نہیں تھی یہ ہر طبقے کی عورتوں کے لئے شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ اخبار النساء میں اس قسم کا اعلان چھپتا تھا۔ ''یہ پہلا اخبار ہندوستان میں عورتوں کو فائدہ پہنچانے والا اور طالب علموں کو۔''

''مولودی سید احمد دہلوی موئف ''فرہنگ آصفیہ'' کا شمار ان زعمائے ادب میں ہوتا ہے جنہوں نے، عورتوں

کی تعلیمی اور سماجی ترقی میں گہری دلچسپی لی اور ان مقاصد کے حصول کے لیے یکم اگست ۱۸۸۴ء کو رسالہ ''اخبارالنساء'' جاری کیا جسے خواتین کے لیے باقاعدہ رسالہ شمار کرنا چاہیے۔ یہ رسالہ مہینے میں تین بار شائع ہوتا تھا۔ضخامت سات صفحات تھی، مضامین میں عورتوں کی خانہ داری کے امور کے علاوہ ان کی تعلیمی حالت سدھارنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ''اخبارالنساء'' نے مشرقی تہذیب کی نگہداشت کی اور قدامت جہالت اور کم علمی کے اندھیروں کو دور کرنے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ ''اس میں عورتوں کے مضامین بھی ہوتے تھے'' اور انہیں تلقین کی جاتی تھی کہ وہ حیا اور شرافت کا دامن نہ چھوڑیں اور خانگی مناقشات سے بچیں۔ اس میں دلی کی زبان کو صحت اور صفائی سے پیش کیا جاتا تھا اور یہ سید احمد دہلوی کے منفرد ادبی اسلوب کا آئینہ دار تھا۔''......۱

رازق الخیری اپنے مضمون ''عصمت کے پچاس سال'' میں، عصمت سے پہلے شائع ہونے والے زنانہ پرچوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ ہوا دہلی میں عورتوں کے لئے ایک اخبار نکلا تھا، جس کا نام اخبار النساء تھا، اور مولوی سید احمد دہلوی فرہنگِ آصفیہ کے مشہور مولف اس کے ایڈیٹر تھے۔رازق الخیری کے مطابق اس زمانے میں اخبارالنساء پر اخباروں کی جورو کی پھبتی کسی گئی تھی۔''......۲

اخبارالنساء سے برصغیر میں نسائی صحافت کا آغاز ہوا مگر بہت ہم کم مدت کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ اخبارالنساء زخ ش کی پیدائش سے پہلے شائع ہوکر بند ہوگیا تھا۔

تہذیب نسواں ۱۸۹۸ء:

خواتین کا پہلا باقاعدہ رسالہ تہذیب نسواں تھا جو اکیاون برس تک، جاری رہا۔

''تہذیب نسواں نے کافی زندگی پائی۔ ۱۸۹۸ء میں نکلنے کے بعد ۵۱سال کی عمر پا کر ۱۹۴۹ء میں بند ہوا۔ اس رسالے نے عورتوں کی بہبودی اور اصلاح کی ناقابلِ فراموش تاریخی خدمات انجام دی ہیں۔اس کے بانی مولوی ممتاز علی صاحب تھے جن کا پنجاب کے مشہور صوفیوں میں شمار ہوتا تھا''۔ ۳

تہذیب نسواں ۱۸۹۸ء میں شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی نے لاہور سے جاری کیا۔ پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو منظر عام پر آیا۔تہذیب الاخلاق کے مشابہ نام ''تہذیب نسواں'' سرسید احمد خان نے تجویز کیا تھا۔ تہذیب نسواں کی ادارت مولوی سید ممتاز علی کی اہلیہ محمدی بیگم کے سپرد تھی۔ ۱۹۰۸ء میں ان کے انتقال کے بعد مولوی صاحب کی صاحبزادی وحیدہ بیگم نے رسالے کی ادارت کے فرائض سنبھالے۔ ۱۹۱۷ء میں یہ خاتون بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں تو کچھ

عرصے کے لئے مولوی صاحب کی بڑی بہو آصف جہاں اس کی مدیر رہیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب کے صاحبزادے، اردو کے نامور ادیب سید امتیاز علی تاج نے اس کی ادارت کے فرائض سنبھالے۔ انہیں دیگر علم دوست خواتین کے ساتھ اپنی صاحب طرز ادیب اہلیہ حجاب امتیاز علی تاج کا تعاون بھی حاصل رہا۔ سید امتیاز علی تاج اس مجلّے کے آخری ایڈیٹر تھے۔

اس رسالے کی غرض و غائت اور اس کی راہ میں پیش آنے والی دشواریوں کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جو مولوی سید ممتاز علی نے ۱۹۱۸ء میں جوبلی نمبر میں تحریر کیا۔

''بچپن سے میری تربیت ایسے حالات میں ہوئی اور اپنے خاندان میں پے در پے ایسے واقعات پیش آئے کہ اس زمانے ہی سے مجھے مظلوم مستورات کے لئے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ جب میری پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ۱۸۹۷ء کے آخر میں میرا عقد ثانی ہوا، اور بیوی پڑھی لکھی ذہین ملی تو جس شوق کی آگ میرے دل میں مدت سے دبی ہوئی سلگ رہی تھی وہ بھڑک اٹھی اور میں نے عقد کے چند گھنٹوں کے بعد اس امر کا فیصلہ کرلیا کہ مستورات میں بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک اخبار جاری کیا جائے اور اپنی اہلیہ کو اس کا ایڈیٹر بنایا جائے۔ چنانچہ عقد کو ابھی ایک مہینہ نہیں گزرا تھا کہ میں نے انہیں اس کام کے لئے تیار کرنا شروع کردیا اور ۱۸۵۸ء میں ہم مجوزہ اخبار کا نام تجویز کرنے لگے۔ دس بارہ نام ہم دونوں نے تجویز کئے اور اتنے ہی نام چند اور دوستوں نے۔ تجویز یہ ہوئی کہ سب نام سرسید صاحب کو بھیج دیئے جائیں، جو وہ پسند کریں وہی نام رکھ دیا جائے۔

میں چھ مہینے تک ہر ہفتے ایک ہزار اخبار چھپواتا اور سول لسٹ دیکھ کر معزز گھرانوں میں اخبار بھجواتا تھا، مگر چند اخباروں کے سوا سب اخبار انکاری ہوکر واپس آتے تھے۔ اس طرح تین مہینے گزر گئے مگر مجھے ساٹھ ستر خریداروں سے زیادہ نہ ملے۔

۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۰ء تک تین سال گزرنے کے بعد بھی ''تہذیب نسواں'' کے خریدار ۳۰۲ سے زیادہ نہ تھے۔ رات دن کی محنت سے میری بیوی کی صحت خراب ہوگئی اور وہ نومبر ۱۹۰۸ء کے آخر میں انتقال کرگئی۔''......۴

''تہذیب نسواں اس دور کی لکھنے والی خواتین کے لئے رہنما ثابت ہوا۔ اس رسالے نے ان کی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے پہلی سیڑھی کا کام دیا۔ اس کے صفحات سے نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، حجاب امتیاز علی، زبیدہ زریں، جمیلہ بیگم، سنجیدہ اشرف علی، سلطانہ آصف فیضی، صغریٰ ہمایوں جیسے متعدد نئے نام گزرے۔......۵

تہذیب نسواں کے مختلف شماروں میں زخ ش کی پانچ نظمیں شائع ہوئی ہیں جس کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	تاریخ اشاعت
۱۔	اپیل	۱۲اپریل ۱۹۱۳ء
۲۔	ماہ مبارک کے مناظر	۸ جون ۱۹۱۹ء۔
۳۔	خدا	۲ جنوری ۱۹۲۰ء
۴۔	بی بی آمنہ کا بستر مرگ	۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء
۵۔	واقعہ فاجعہ	۲۵ جنوری ۱۹۲۱ء

ز خ ش نہ صرف اس رسالے میں چھپتی رہیں بلکہ ہر طرح سے معاونت بھی کرتی رہیں۔ مولوی ممتاز علی نے اُن کی وفات پر اپنے مضمون میں لکھا۔

''میرا تعارف مرحومہ کے والد ماجد سے سرسید نے کرایا تھا جس کو چالیس سال سے زیادہ ہوئے مگر مرحومہ سے خط و کتابت کو چند سال ہی ہوئے تھے اور یہ دردِ قوم ہی تھا جس نے باوجود یکہ وہ ہندوستانی پردے کے ہر پہلو پر شدت سے حامل تھیں مجھ سے خط و کتابت پر مائل کیا اور جب اُن کی میری مکاتبت شروع ہوئی اُن کی ہمدردی میرے مقاصد سے روز بروز بڑھتی گئی۔ کاغذ کی گرانی کے ایام میں جبکہ میں اخبار کی مالی حالت کی فکر سے بہت پریشان تھا مرحومہ نے اپنی چیدہ چیدہ نظموں کا ایک مجموعہ ''آئینہ حرم'' اخبار کی مدد کیلئے مجھے عنایت کیا اور جب میں نے اُس کے چھپنے کے بعد اُس کے چالیس یا پچاس نسخے مرحومہ کی نذر کیے تو انہوں نے باوجود میرے اصرار کے وہ نذر قبول نہ کی اور میری درخواست نذر کے جواب میں ان نسخوں کی قیمت ہی نہیں بھیجی بلکہ اس کے علاوہ سوا سو روپے اور اس غرض سے بھیجے کہ اس کی قیمت سے نادار غریب بہنوں کو آئینہ حرم کے نسخے مفت دیئے جائیں۔

میں اپنی صحت کی متزلزل حالت پر غور کر کے بارہا یہ خیال کیا کرتا تھا کہ تہذیبی مقاصد کو جو میری علالت کی وجہ سے ادھورے رہتے نظر آتے ہیں وہی سنبھالیں گی اور ضرور ان کی تکمیل کی کوئی صورت نکالیں گی۔......٦

خاتون علی گڑھ ۱۹۰۴ء:

ماہنامہ خاتون ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ محمد عبداللہ تھے جن کی خدمات عورتوں کی تعلیم اور بیداری کے سلسلہ میں ناقابل فراموش ہیں۔ سرسید کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ تعلیم نسواں کی اشاعت کے لیے ۱۸۹۹ء میں قائم کی گئی۔ اس کے پہلے سیکریٹری شیخ عبداللہ تھے۔ انہوں نے اسی پلیٹ فارم سے تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھایا اور جولائی ۱۹۰۴ء میں عورتوں کے لیے ایک رسالہ جاری کیا گیا جس میں کانفرنس کی روداد بھی تفصیل سے شائع ہوئی تھی۔ شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم نے ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا پہلا اسکول علی گڑھ میں قائم کیا وہ خود بھی علی

گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اوران کی بیگم بھی ایک روشن خیال خاتون تھیں جوان کے ساتھ قدم ملا کر چلتی رہیں۔ شیخ عبداللہ نے برصغیر کی خواتین میں تعلیم کی ترقی کے لئے ہرذریعہ اپنایا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تعلیم نسواں شاخ سے آل انڈیا مسلم لیڈیز کے قیام تک انہوں نے نسائی تعلیم کی راہ میں حائل بہت سی دشواریوں کا سامنا کیا۔ رسالے خاتون کے اجراء کا مقصد بھی ان خیالات کی ترویج اور عملی اقدامات کی حمایت کے لئے رائے عامہ ہموار کرنا تھا۔

''خاتون' کیوں جاری کیا گیا، اسکی وجہ پہلے شمارے جولائی ۱۹۰۴ء میں درج کی گئی ہے۔ اس وقت مسلمان مردوں کی اصلاح وفلاح اور ترقی کے لئے تھوڑا بہت سامان موجود ہے لیکن مسلمان عورتوں کے لئے کوئی مستقل اور قابل وقعت انتظام نہیں ہے۔ بحیثیت انسان وہ ہماری توجہ اورغور کی مستحق ہیں، بحیثیت مسلمان وہ ہماری ہمدردی کی حقدار ہیں اور بحیثیت عورتوں کے یعنی ہماری شریکِ حال اور چولی دامن کا ساتھ ہونے کی حیثیت میں ان کا اور ہمارا معاملہ ایک ہے کچھ جدا نہیں جس قدر مردوں کی حالت پر توجہ کی ضرورت ہے اسی قدر عورتوں کی حالت پر ہم نے اس ضرورت کا لحاظ کرنا اپنا فرض سمجھا ہے اور ہم نے اپنے فرض ادا کرنے کی صورت خاتون کا جاری کرنا قرار دیا ہے۔ خاتون ایک ماہوار رسالہ ہوگا جس میں صرف عورتوں کے مضامین ہوا کریں گے۔ تعلیم نسواں کی ضرورت مختلف پیرایوں سے ثابت کرنے کے علاوہ ہماری بڑی کوشش یہ ہوگی کہ ہم عورتوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کی جوان کی ذات اور ان کی حالت کے مناسب ہوں گے اشاعت کریں ان میں صحیح مذاق پیدا کریں ان میں نفیس اور اعلیٰ قوتوں کو ترقی دیں جو ان سے مخصوص اور جو دنیا کے لئے نعمت اور ہماری قومی ترقی کے لیے بڑی ضروری ہیں۔''

رسالہ خاتون مین اس زمانے کے وہ تمام اہم لوگ جو خواتین کی تعلیم کے حامی تھے، چھپتے رہے۔ مثلاً مولانا حالی، مولوی کرامت حسین، محمد احسن اللہ، سید احمد دہلوی، اکبر میرٹھی، مس نصیرالدین حیدر، فاطمہ بیگم، رابعہ سلطانہ بیگم، بنتِ نذرالباقر (بعد میں نذرِ سجاد حیدر)۔ اس رسالے کے مزاج اور موقف کا اندازہ اس میں چھپنے والے چند مضامین کے عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے جو درجِ ذیل ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	تاریخ اشاعت
۱۔	مستورات کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے۔	(اکبر میرٹھی ۱۹۰۴ء)
۲۔	عورتوں کی تعلیم میں مردوں کی تعلیم ہے۔	(سید احمد دہلوی ۱۹۰۴ء)
۳۔	تعلیم میں مردوں اور عورتوں کا حق برابر ہے۔	(سید احمد دہلوی ۱۹۰۴ء)
۴۔	آزادئ نسواں۔	(محمد احسن اللہ ۱۹۰۶ء)
۵۔	عورتوں کی تعلیم کے طریقے پر اک نظر اور نارمل اسکول کی ضرورت۔	(عبدالحکیم ۱۹۰۶ء)
۶۔	عورتوں کی تعلیم۔	(ضیاء الحسن ۱۹۰۷ء)

اس رسالے نے کافی عرصہ تک عورتوں کی ترقی کی راہ ہموار کرنے میں ایک فعال کردار ادا کیا۔

رسالہ خاتون کی فائیلوں سے جو علیگڑھ گرلز کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ زخ ش کی پانچ نظمیں اس رسالے میں ملیں۔ ان میں مشہور مثنوی ''شہرآشوبِ اسلام'' بھی ہے۔ اس نظم کی تعریف میں ایک طویل اڈیٹوریل نوٹ شیخ عبداللہ نے لکھا ہے جس کا آخری پیراگراف یہاں نقل کر رہی ہوں۔

''اب اس تمہید کے بعد ہم اپنی لائقہ بہن زخ ش صاحبہ کا شہرآشوب اسلام درج کرتے ہیں۔ بہن موصوف کی نظمیں اور ان کے مضامین اس قدر اعلیٰ درجہ کے اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ ہماری یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ خاتون کے ہر نمبر میں سے بہن موصوفہ کی کوئی نظم یا ان کا کوئی مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔'' ۷

اس مثنوی کا تفصیلی ذکر شاعری کے باب میں آئے گا اس کے علاوہ مجموعے میں جو نظمیں شامل ہیں ان میں سے تین اہم نظمیں ،قیدفرنگ ۱۵جون ۱۹۱۲ء کے شمارے میں، گنج شہیداں جولائی ۱۹۱۳ء کے شمارے میں چھپی ہیں۔ ایک مثنوی رویائے صادقہ کے عنوان سے مجموعے میں شامل ہے یہی مثنوی خاتون علیگڑھ ۵ جنوری ۱۹۱۳ء کے شمارے میں عالمِ خواب کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس مثنوی پر ایک نوٹ بھی لکھا ہے جس میں انہوں نے مثنوی کو اپنی مضمون نگار بے حدعزیز سہیلی رابعہ سلطانہ بیگم کے نام معنون کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں۔

''اس ناچیز سچائی سے لبریز خواب کو نہایت محبت کے ساتھ اپنی معزز بہن رابعہ سلطانہ بیگم کے نامی پر (جس کی حب قوم اور دردِ اسلام اظہر من الشمس ہے) معنون کرنے کا فخر حاصل کرتی ہوں۔''......۸

ان کے علاوہ ایک دعائیہ نظم ''خدا سے استدعااور اس کے ساتھ ہی ایک دعا'' بھی خاتون جنوری ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

خاتون علیگڑھ میں ان کے مضامین بھی چھپتے رہے ہیں۔ ''ایک کہانی کیا فریادِ مظلومہ میں کچھ اثر نہیں'' اپریل ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے جو مکالماتی انداز میں ہے۔ ان کا ایک دلچسپ مضمون ''زنانہ حاضر جوابیاں'' بھی اسی رسالے میں چھپا ہے۔

پردہ نشیں آگرہ ۱۹۰۷ء:

خواتین کا یہ ماہنامہ ۱۹۰۷ء میں آگرہ سے جاری ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق اس رسالے کے آثار حیات ۱۹۱۵ء تک ملتے ہیں:

''۱۹۰۷ء کو آگرہ سے یہ نسوانی پرچہ جلوہ افروز ہوا۔ ۳۴ صفحات پر نکلتا تھا۔ مرتب مسز خاموش تھیں۔ سالانہ چندہ، ڈیڑھ روپیہ تھا۔ عزیزی پریس آگرہ سے چھپتا تھا۔ سرِورق پر یہ رباعی درج ہوتی تھی۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کے پردے کو کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

پردہ نشیں میں جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا عورتوں کے لکھے مضامین جگہ پاتے تھے۔ بحالت اشد ضروری مردوں کے مضامین چھپتے تھے۔''......۹

زخ ش کی اس رسالے میں فروری ۱۹۱۲ء میں نظم ''اپیل'' شائع ہوئی ہے۔

شریف بی بی لاہور ۱۹۰۹ء:

''لاہور سے خواتین کا ماہنامہ شریف بی بی ۱۹۰۹ء میں منشی محبوب عالم کی نگرانی میں جاری ہوا۔ اس رسالے میں بنتِ سید نذرالباقر، مسز عبدالقادر، اہلیہ بابو علی احمد، مس جے سی فلچر، بیگم عبدالستار نے خواتین کے موضوعات پر مضامین لکھے ہیں، تربیتِ اطفال، خواتین کا لباس، عورتوں کے توہمات، تعلیم کی ضرورت جیسے موضوعات پر سہل اور آسان زبان میں مضامین پیش کیے جاتے تھے۔ ہندوستان اور یورپ کی ممتاز عورتوں کے کارناموں کو یہ پرچہ اجاگر کرتا تھا، لیکن لہجہ خاصہ جذباتی ہوتا تھا جو عورتوں کو متاثر کرتا تھا۔''......۱۰

انہی محبوب عالم کی صاحبزادی فاطمہ بیگم اس دور کی مضمون نگار خواتین میں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں، فاطمہ بیگم، شریف بی بی کی مدیرہ بھی رہیں۔ یہ فاطمہ بیگم زخ ش اور انکی بہن احمدی بیگم نکہت سے خط و کتابت کا رابطہ رکھتی تھیں اور ان کے گھر بھی آئیں تھیں۔

''شریف بی بی اس زمانے کے بہت مشہور پیسہ اخبار کے دفتر سے مولوی محبوب عالم مرحوم نے جاری کیا تھا جس نے چند سال بعد ہی صاحب مرحوم کی صاحبزادی محترمہ فاطمہ بیگم منشی فاضل کی ادارت میں غیرمعمولی ترقی کی۔''......۱۱

امداد صابری لکھتے ہیں۔

''اس رسالے کی طباعت و کتابت نہایت پاکیزہ تھی، کاغذ بھی عمدہ تھا۔ اس میں عورتوں کی معلومات کے لئے اور اُن کی اصلاح کے لیے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔''......۱۲

زخ ش کے مجموعے کے مطابق شریف بی بی میں ان کی ۱۲نظمیں مختلف تاریخوں میں شائع ہوئی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

نمبرشمار	عنوان	تاریخ اشاعت
۱۔	اپیل	۲۸مارچ ۱۹۱۳ء
۲۔	تتلی	تاریخ نہیں دی گئی ہے۔
۳۔	ہے ہے شہہ یونان	۱۴اپریل ۱۹۱۳ء
۴۔	شادی	اگست ۱۹۱۳ء
۵۔	سہرا	۱۰اپریل ۱۹۱۴ء
۶۔	ارمغان	۲۲مئی ۱۹۱۴ء
۷۔	آہ گوکھلے	۱۴مئی ۱۹۱۵ء
۸۔	وائے حالی	۱۴جون ۱۹۱۵ء
۹۔	رخصت بلبل	۱۵نومبر ۱۹۱۵ء
۱۰۔	تصادم رواج وشرع	۳جنوری ۱۹۱۶ء
۱۱۔	حادثہ ہائلہ	۱۹۱۶ء
۱۲۔	ہائے شبلی	۱۳اپریل ۱۹۱۸ء

اس کے علاوہ اُن کا ایک مشہور مضمون جس کے حوالے اُن کی سوانح حیات میں آئیں گے۔ شریف بی بی میں ۲۲مئی ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان ہے ''میرا آخری مضمون'' اس مضمون کے ساتھ ایڈیٹر کا نوٹ بھی ہے جس میں انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ زخ ش نے مضمون نہ لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مولوی محبوب عالم لکھتے ہیں۔

''ہمیں یہ بات دیکھ کر سخت رنج ہوتا ہے کہ آج کل اس زمانے میں جب کہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کا چرچا بہت کچھ پھیل گیا ہے اور مسلمان لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ بعض مضامین نظم ونثر کو جو ذرا بھی غیرمعمولی قابلیت کے ساتھ لکھے ہوئے ہوں مردانہ تحریر سمجھا جاتا ہے اور لکھنے والی بی بی کو داد دینے کے بجائے ان کی محنت اور شوق کا بدگمانیوں کے ساتھ خون کردیا جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی ہی تعلیم پاکر اور تجربہ حاصل کرنے کے باوجود کوئی لڑکی ویسا

مضمون نہ لکھ سکے جیسا کہ مرد لکھ سکتے ہیں۔ یہ بدگمانی نہایت حوصلہ شکن اور خلاف تہذیب ہے۔'' ۱۳

بعد میں زخ ش نے نہ لکھنے کا فیصلہ ترک کر دیا تھا جبکہ اُن کی بہن احمدی بیگم نکہت نے مضامین نگاری بالکل چھوڑ دی تھی۔ یہ دونوں بہنیں فاطمہ بیگم بنت حاجی محبوب عالم سے گہرا تعلق اور خط و کتابت کرتی تھیں۔ زخ ش نے فاطمہ بیگم سے ملاقات پر نظم ''ارمغان'' فارسی میں لکھی تھی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ لیلیٰ بانو کو ان کے خطوط میں بھی بار بار فاطمہ بیگم کا ذکر آیا ہے۔ شاید اسی تعلق کی بنا پر شریف بی بی میں سب سے زیادہ تحریریں شائع ہوئی ہیں۔

عصمت ۱۹۰۸ء:

ابتدائی نسائی رسالوں میں سب سے طویل عمر پانے والا اور دورس اثرات مرتب کرنے والا پرچہ عصمت ہے، جو ۱۵ جون ۱۹۰۸ء کو دہلی سے جاری ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ رسالہ کراچی سے شائع ہونے لگا۔ رسالہ عصمت نے نسائی بیداری کی اس تحریک کو مقبولیت اور ترقی کی راہ پر گامزن رکھا جس کی ابتداء بے حد نامساعد حالت میں ہوئی تھی۔ عصمت کی مقبولیت اور طویل العمری کے پیچھے ایک مضبوط ادارتی ٹیم کے ساتھ ان نسائی رسالوں اور ناولوں کی سازگار کی ہوئی فضاء بھی تھی جو اس کی اشاعت سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ عصمت نکالنے کا مقصد خواتین میں تعلیمی اور تخلیقی شعور کی بیداری اور ایک ایسا معتبر رسالہ مہیا کرنا تھا جہاں خواتین کی تخلیقات چھپ سکے اور اس کے پلیٹ فارم سے ان کی تخلیقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ عصمت کی اشاعت اس دور کے مقبول رسالے ''مخزن'' کے دفتر سے شروع ہوئی جو ۱۹۰۷ء میں بیرسٹر عبدالقادر کے لاہور سے دہلی منتقلی کے ساتھ دہلی سے شائع ہونے لگا تھا۔ مخزن میں علامہ راشدالخیری کے مضامین اور افسانے چھپتے رہتے تھے جو خواتین میں بہت مقبول ہوئے اور ان کی طرف سے علیحدہ پرچے کی اشاعت کی فرمائشیں موصول ہوئیں۔

سر عبدالقادر مرحوم نے مضمون ''غمِ راشد'' میں لکھا تھا۔

''ان دنوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک رسالہ عورتوں کے فائدے کے لئے بھی جاری کیا جائے۔ مشورے سے یہ قرار پایا کہ مسز محمد اکرام اس رسالے کی ایڈیٹر ہوں اور مولانا راشدالخیری اس کے لئے مضامین لکھیں جو لڑکیوں کے لئے خاص طور پر موضوع ہوں۔ انہیں پڑھنے سے انہیں دلچسپی ہو اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔

شیخ محمد اکرام مرحوم کی پریس کے مہتمم شیخ عبدالقادر مخزن کی طرح عورتوں کا رسالہ خود نہ نکال سکتے تھے اور علامہ مغفور (راشدالخیری) سرکاری ملازم تھے۔ ان کا نام ایڈیٹری میں نہ پڑ سکتا تھا لہٰذا یہ طے ہوا کہ ایڈیٹر شیخ محمد اکرام مرحوم اور ان کی اہلیہ محترمہ کو ظاہر کیا جائے اور مضامین وغیرہ علامہ مغفور لکھیں۔ رسالے کا نام 'عصمت' تجویز کیا تھا۔ ان کے اصلاحی

معاشرتی اور اسلامی تاریخی ناول مختصر افسانے نظمیں مضامین غرض ان کا سارا لٹریچر عصمت ہی کی تو تفسیر ہے۔'' ۱۴

عصمت نکالنے کا مقصد اس کی پراسپیکٹس میں جو مخزن میں شائع ہوا تھا واضح کردیا گیا تھا۔ ان میں سے اہم مقاصد یہ ہیں۔

عالم نسواں کی ترقی، تعلیم نسواں کی حمایت، معلومات عامہ کی فراہمی، زنانہ لٹریچر کو وسعت دینا، عصمت کی مضمون نگار خواتین کے بارے میں بہت تفصیل سے ڈاکٹر شائستہ سہروردی اکرام اللہ نے ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا، جو اکتوبر ۱۹۹۸ء میں دوبارہ شائع کیا گیا۔

''عصمت کی دوراول کی مضمون نگار خواتین کے لئے عصمت گویا ان کے لئے باہر کی دنیا کو دیکھنے کا ایک جھروکہ تھا۔ مولانا راشدالخیری مرحوم، سرعبدالقادر، ناصرنذیرفراق اور شیخ محمد اکرام بھی اس کے دورِ اول کے مضمون نگاروں میں سے تھے۔ مولانا مرحوم کے مضامین سے عصمت کے پڑھنے والیوں کو اس کا علم اور احساس ہوا کہ اسلام نے ان کو کیا کیا حقوق عطا کئے ہیں اور رسم و رواج نے کس بے دردی سے ان کو محروم رکھا ہے۔ معاشرے میں کیا کیا خامیاں، کیسی کیسی کمزوریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ عصمت کے مضامین نے ان کو اس سے آگاہ کرنا شروع کیا، اور اس کے صفحات نے پڑھنے والیوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرسکیں۔ اصلاح کی صورتیں اور تجاویز پیش کرسکیں۔ پرانی باتیں مٹے ہوئے نقوش کی طرح اب بھی لوح ذہن پر محفوظ ہیں۔ بچپن کے پڑھے ہوئے مضامین بھی یاد ہیں اور مضامین نگاروں کے نام بھی، چند نام یہ ہیں۔

نذر سجاد حیدر، عباسی بیگم، مسز خدیوجنگ، فاطمہ بیگم، جمیلہ بیگم، عطیہ بیگم فیضی، صغریٰ ہمایوں، اشرف جہاں، ظفر جہاں، زاہدہ مرادآبادی، دوسرے اور تیسرے دور میں محترمہ و۔ا۔ صاحبہ، ظفر جہاں، امۃ الوحی صاحبہ، اے۔ آر۔ خاتون صاحبہ اور حجاب اسمٰعیل صاحبہ ہیں۔ عصمت کے دوراول کے مضمون نگار ہی نہیں بلکہ ان میں شاعرات بھی تھیں اور ان کے اشعار تک بندی نہیں بلکہ شعر کہلانے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ ز۔خ۔ش اور ان کی بہن نکہت شروانیہ، منجھو بیگم اور بخشی بیگم اور پھر تیسرے دور میں بلقیس جمال، رابعہ پنہاں، کنیز فاطمہ حیا، خورشید آرا بیگم اور صفیہ شمیم ملیح آبادی کی نظمیں اس کے صفحات کی زینت بنیں۔'' ۱۵

عصمت کے ابتدائی شماروں میں علامہ راشدالخیری نے سادہ و سلیس زبان میں خواتین کے مختلف ناموں سے خود مضامین لکھے ہیں۔ جس کا مقصد مضمون نگاری کی ترغیب دینا اور ایسے نمونے فراہم کرنا تھا، جو گھریلو تعلیم یافتہ خواتین کو بھی مضمون نگاری کی طرف مائل کرسکیں۔ ابتدائی دور میں جن خواتین نے مضامین اس پرچہ کے لئے لکھنا شروع کیا ان میں بنتِ نذرالباقر جو بعد میں نذر سجاد حیدر کے نام سے مشہور ہوئیں کا نام اور خدمات سب سے اہم ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے حقوق کی

حمایت میں مدلّل مضامین لکھے۔ ان کے دلچسپ افسانے عصمت میں شائع ہوئے انہوں نے علمی کام بھی کئے۔ مدرسے اور زنانہ کلب قائم کئے۔ مسلم یونیورسٹی کے لئے اور جنگ بلقان، جنگ طرابلس کے دنوں میں ترکی کی حمایت میں پرجوش مضامین لکھے اور چندہ بھی جمع کیا۔ محترمہ سلطانی بیگم منشی ذکاء اللہ کی بہو تھیں۔ محترمہ آبرو بیگم مولانا عبدالکلام آزاد کی بہن تھیں۔ ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

''عصمت کے دور اول میں نظمیں اکثر و بیشتر مردوں کی تھیں۔ شاعرات میں سب سے ممتاز نام محترمہ زاہدہ خاتون شروانیہ (ز خ ش) کا تھا۔ محمڈن یونیورسٹی کیلئے ۲۰ ہزار چندے کی اپیل کی گئی تھی جس کے سلسلے میں زاہدہ خاتون نے ایک نظم لکھی جو اکتوبر ۱۹۱۲ء کے پرچے میں طبع ہوئی۔

اے فخر قوم بہنو عصمت شعار بہنو
مردوں کی ہو ازل سے تم غمگسار بہنو

یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔

زخ ش کے مجموعے کے مطابق ان کی ایک اور نظم ''آنکھیں میری تجھ کو ڈھونڈتی'' ہیں۔ ستمبر ۱۹۱۲ء میں عصمت، میں شائع ہوئی تھی۔

استانی دہلی:

خواتین کے مندرجہ بالا رسائل کے علاوہ زخ ش کی تحریریں جس رسالے میں مسلسل چھپی ہیں اُن میں استانی بہت اہم ہے۔ اس رسالے کا ذکر کتابوں میں نہیں ملا۔ لیکن زخ ش کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ خواجہ حسن نظامی شائع کرتے تھے۔ اس کی ایڈیٹران کی اہلیہ لیلیٰ خواجہ بانو تھیں۔ لیلیٰ خواجہ بانو کا اصل نام محمودہ بیگم تھا، خواجہ صاحب کی دوسری بیوی تھیں۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد ۱۹۱۶ء میں ان سے شادی ہوئی تھی اور انہیں لیلیٰ بانو کا لقب خواجہ صاحب ہی نے دیا تھا۔ زخ ش کی ۱۹۱۶ء سے تا دم مرگ ان سے مسلسل خط و کتابت رہی۔ ان کے خطوط میں اس رسالے کو شائع کرنے کا ارادہ ۱۹۱۷ء میں ظاہر ہوتا ہے۔ زخ ش اپنی ۲۷ مئی ۱۹۱۷ء کے خط میں لیلیٰ بانو کو لکھتی ہیں۔

''مجھے بے انتہا مسرت ہے کہ آپ ایک اخبار جاری کرنا چاہتی ہیں۔ میں اپنی لیلیٰ کو پیاری ایڈیٹرس لکھ کر پھولی نہ ساؤں گی۔ لیکن اپنی ذاتی مسرت کو نظرانداز کرکے کامل غور کے بعد جو رائے قائم کی ہے، وہ لکھتی ہوں۔ نظر بحالت موجودہ ایک ایسے اخبار کا جسے اعلیٰ اصول پر چلایا جائے جاری کرنا تو آسان ہے لیکن نبھانا مشکل ہے اور یہ کام بہت زیادہ مستحکم مزاجی، ایثار اور تدبیر کا محتاج ہے۔ کاغذ کی گرانی اور کامیابی۔ تعلیم نسواں سے پبلک کی بے توجہی۔ اہل

قلم خواتین کی کمیابی اور لا پرواہی۔ زنانہ اخبارات سے عام برداشتہ خاطری اس کی سنگِ راہ ہیں۔ مگر آپ کو خاص طور پر کچھ آسانیاں ہوں گی۔ مثلاً خواجہ صاحب کے وسیع حلقہ احباب کی امداد اور خواجہ صاحب جیسے قابل اور کارآزمودہ مشیر و معاون کی سرپرستی۔ میرے نزدیک آپکا اخبار نکالنا ہمارے فرقے کی خوش نصیبی ہے۔ اور آپ ضرور اس کا عزم بالجزم کر لیجئے لیکن اس کا مناسب وقت میرے نزدیک ہنگامہ جدال و قتال کے فرد ہونے کے بعد ہے۔''......۱۶

استانی کب شائع ہونا شروع ہوا تاریخ نہیں ملتی تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۱۸ء کے اواخر میں شائع ہونے لگا تھا کیونکہ جنوری ۱۹۱۹ء میں زخ ش کی ایک نظم اس پرچے میں شائع ہوئی ہے اور اکتوبر میں اس کا نمبر آیا ہے۔جس کا پتہ بھی زخ ش کے خط سے ملتا ہے۔وہ لکھتی ہیں۔

''استانی کا پہلا نمبر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ امید موافق، دلفریب اور دیدہ زیب ہے، خدا کرے آئندہ ایام اس کی صوری رومانوی خوبیوں میں تنزل کے بجائے ترقی کرے اور بے ضابطگی اشاعت کے بدنماداغ سے اس کے دامن محفوظ رکھے۔''......۱۷

رسالہ استانی کی اشاعت کے ارادے سے لے کر اس کے جاری ہونے کے بعد بھی زخ ش کا مستقل اور مسلسل تعاون اس رسالے کے ساتھ رہا ہے جس کی وجہ خواجہ حسن نظامی سے اُن کے تعلقات اور ان کی بیگم سے مسلسل خط و کتابت اور گہری دوستی ہے۔ رسالہ استانی میں ان کے مجموعے کے مطابق مندرجہ ذیل ۴نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ گمان ہے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے تاہم جو شائع ہوئیں ان کی تفصیلات یوں ہے۔

نمبر شمار	عنوان	تاریخ اشاعت
۱۔	فریادِ الٰہی	جنوری ۱۹۱۹ء
۲۔	ترانہ اتحاد	ربیع الاول ۱۳۳۸ھ
۳۔	ترانہ ملت	جمادی الاول ۱۳۳۸ھ
۴۔	اے باپ	شعبان ۱۳۳۸ھ

خواتین کے مندرجہ بالا رسائل کے علاوہ زخ ش اس زمانے کے تمام قابل ذکر اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ ان رسائل و جرائد کا ذکر ان کے خطوط میں بھی ہے اور مجموعہ کلام فردوسِ تخیل میں بھی حاشیوں پر ان کے نام لکھے ہیں جس میں ان کی نظمیں شائع ہوئیں۔ ان جرائد کے ایڈیٹران اگرچہ مرد تھے لیکن وہ اپنی ایڈیٹر سہیلیوں، بھائی احمد اللہ خان اور داؤد خان، پھوپھی زاد بھائی مونس خان اور خصوصاً خواجہ حسن نظامی کے توسط سے ان اخباروں کو اپنی تحریریں ارسال کر دیتی تھیں لیکن پتے اور شناخت کا علم نہیں ہونے دیتی تھیں۔ رسالہ انقلاب کے حصول کے لئے انہوں نے جو

طریقہ اختیار کیا تھا وہ یہ ہے۔

''تمہارا خط انقلاب کے پرچوں کو لے کر یہاں پہنچا۔ اس اخبار کا ایک نمبر میرے پاس آیا تھا میں نے اسے مونس کے نام جاری کرایا ہے۔......۱۸

خواتین کے مسائل کے علاوہ جن جرائد میں ان کی نظمیں شائع ہوئی ہیں وہ ہیں 'مرشد دہلی'، 'نظام المشائخ دہلی'، ' کہکشاں'، 'خطیب دہلی'، 'زمیندار لاہور'، 'ستارۂ صبح لاہور' اور 'تمدن دہلی' یہاں ان جرائد کا مختصر تعارف پیش کر رہی ہوں۔

مرشد دہلی:

یہ ماہانہ رسالہ تھا جو دہلی سے ۵ مارچ ۱۹۱۸ء کو شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے چیف ایڈیٹر خواجہ حسن نظامی تھے۔ پہلے شمارے میں انہوں نے جو اغراض و مقاصد اس رسالے کے بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں۔

''یہ کاغذی مرشد ہے اس میں دین و دنیا کے عمل پر بشری رائے زنی ہے۔ اس زمانے نے کاغذ کی بھی ایک دنیا بسائی ہے جس میں بے شمار اخبارات، رسالے، کتابیں، گزشتہ زمانے سے نرالی زندگی بسر کرتے ہیں اور دنیا کو اپنی رائے پر چلانا چاہتے ہیں۔ یہ رسالہ اپنے کاغذوں کا کاغذی مرشد وہادی ہے۔ کوئی جانے یا نہ جانے اس کاغذی مرشد کا طرز عمل، طرز تحریر، طرز ہدایت خود بتادے گا ایسے رسالے کی دنیا کو خاص کر ہندوستانی اور علی الخصوص مسلمانوں کو جو کاغذی شکل رکھتے ہیں اشد ضرورت ہے۔ لہٰذا اس قسم کے پرچے کا جاری ہونا بہت مفید ہوگا۔''......۱۹

یہ رسالہ صرف ۶ مہینے جاری رہا اور اگست ۱۹۱۸ء میں اس کا آخری پرچہ چھپا، تاہم جتنے عرصے یہ نکلا بہت مقبول رہا۔ زخ ش کے خطوط میں مرشد کا بار بار ذکر بھی ہے۔ رسالہ بند ہونے پر لکھتی ہیں۔

''مرشد کے بند ہونے کا بہت ہی افسوس ہے۔ نظام المحبت (کذا) کا آغاز اسے راس نہ آیا اور بیچارے کا خاتمہ ہوگیا، خیر یہ تو فضول بات ہے اصل میں اردو کی قسمت ہی عمدہ اخبارات کے قابل نہیں۔ بے شک خواجہ صاحب تو کمزور آدمی ہیں کوئی قوی سے قوی شخص بھی تنہا اخبار نہیں چلا سکتا۔'' ۲۰

اس رسالے میں ان کی ایک نظم چھپی تفصیل یہ ہے۔

نمبر شمار	عنوان	تاریخ اشاعت
۱۔	جرم عشق	یکم جون ۱۹۱۸ء

نظام المشائخ دہلی:

نظام المشائخ کے بارے میں ملا واحدی صاحب لکھتے ہیں۔

''جولائی ۱۹۰۹ء میں، خواجہ حسن نظامی اور میں نے ماہنامہ نظام المشائخ کی بنیاد رکھی۔ خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب مصر و شام وحجاز کا سفر کر کے واپس آئے تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم میری عدم موجودگی میں نظام المشائخ کو سنبھال سکتے تھے تو میری موجودگی میں بھی سنبھال سکتے ہو۔ لہٰذا آج سے تم جانو اور نظام المشائخ جانے۔ تم ہی اس کے مالک اور اس کے ایڈیٹر ہو۔ میں نے خواجہ صاحب کا نام بحیثیت سرپرست لکھوادیا اور اپنا نام بحیثیت ایڈیٹر۔ آج کل میں نظام المشائخ کا صرف مجاور ہوں اور اپنے اور خواجہ صاحب کی یادگار سمجھ کر اسے سینے سے لگائے بیٹھا ہوں۔ دہلی میں منجھلا لڑکا سید علی مقتدا واحدی ایڈٹ کرتا تھا اور کراچی میں منجھلا لڑکا سید موسیٰ واحدی ایڈٹ کرتا ہے اور چھوٹا لڑکا عیسیٰ واحدی بھائی کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ نظام المشائخ ہر چاند کی ٹھیک ۶ تاریخ کو جو حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی کا یوم عرس ہے شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ تمام سلسلوں کے صوفیاء مشائخ کی دینی، دنیاوی اغراض کا حامی تھا اور حلقۂ نظام المشائخ کا ارگن تھا۔ اس میں اخلاقی، اصلاحی مضامین صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ تحریروں میں انشاء پردازی اور دیگر دلچسپیوں کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔

اس اخبار میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا روزنامچہ شائع ہوتا تھا۔ اس روزنامچے میں کافی تاریخی، ادبی معلومات اور اہم شخصیتوں کے حالات ہوتے تھے۔''......۲۱

نظام المشائخ طویل عرصے تک چھپتا رہا۔ زخ ش کے خطوط میں اس اخبار کا ذکر ہے۔ اُن کی ایک نظم اس رسالے میں چھپی جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	عنوان	تاریخ اشاعت
۱۔	ظہورِ امام	ذی الحج ۱۳۳۰ھ

کہکشاں لاہور:

''ستمبر ۱۹۱۸ء میں امتیاز علی تاج نے لاہور سے ماہنامہ کہکشاں جاری کیا۔''......۲۲

امتیاز علی تاج مولوی سید ممتاز علی کے صاحبزادے اور اردو کے ممتاز ادیب تھے۔ ڈرامہ انارکلی ان کی بڑی اعلیٰ ادبی یادگار ہے۔ زخ ش کے مجموعے 'آئینہ حرم' اور 'فردوس تخیل' کا پہلا ایڈیشن ان ہی کے ادارے دارالاشاعت کی

طرف سے شائع ہوا تھا۔اس رسالے میں زخ ش کی طویل فارسی نظم چیست یارانِ طریقت ! بعد ازیں تدبیر ما'جس کے تین حصے'استصوابِ عام'،'طبقہ انتہا پسند'اور'طبقہ اعتدال پسند' ہیں جو اس رسالے میں مارچ ۱۹۲۰ء چھپی۔

خطیب دہلی:

خطیب دہلی کے تعارف میں امداد صابری لکھتے ہیں۔

''دہلی کوچہ چیلان سے غالباً ۱۹۱۴ء کو یہ ہفتہ وار اخبار نمودار ہوا۔ 12 صفحوں پر مشتمل تھا۔ مالک و ایڈیٹر ملا واحدی صاحب تھے۔سالانہ چندہ دو روپے آٹھ آنے تھا۔ یہ دینی و علمی اخبار ظاہری و معنوی اعتبار سے ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے مضامین اکثر اس میں چھپتے تھے۔ واحدی صاحب اپنی تصنیف 'میرے زمانے کی دلی' میں خطیب کے بارے میں لکھتے ہیں۔'میرا ہفتہ وار رسالہ خطیب ۱۹۱۴ء میں جاری ہوا۔ اس کی نیاز صاحب قلمی مدد کیا کرتے تھے۔ اسکا ایک اشتہار انتہائی دلچسپ تھا جس کا عنوان تھا 'میدان جنگ میں مانگ خطیب و نظام المشائخ کی'۔ یہ اشتہار جولائی ۱۹۱۴ء کے شمارے میں چھپا تھا۔

'جہاں گولوں اور گولیوں کا مینہہ برستا ہے اور موت وخون کے باغ لہلہاتے ہیں، جہاں انسان اپنے ملک و بادشاہ کی عزت پر جانیں قربان کرتے ہیں، جہاں آدمی زندگی کی توقعات سے ہاتھ اٹھا کر جاتے ہیں۔ وہاں سوائے تیغ و تفنگ کے کوئی چیز یاد نہیں آتی۔ وہ ایسا مقام ہے جو ہر دلچسپی کو فراموش کردیتا ہے مگر مذہب ہر آدم زاد کو ایسا پیارا ہے کہ وہ اس خونی کارزار میں بھی اس کو یاد کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے پاس تمام جنگی میدانوں میں جہاں سے ہمارے ہندوستانی بھائی جنگ و جدل میں مصروف ہیں۔خطیب و نظام المشائخ کی مانگ آرہی ہے۔'

افسر اور سپاہی لکھتے ہیں کہ اس خونخوار مقام پر ہمارا دل کسی اخبار اور رسالہ میں نہیں لگتا، صرف اخبار خطیب و رسالہ نظام المشائخ کو پڑھنا چاہتے ہیں جن میں روحانی تسلی وتسکین کے پیام ہوتے ہیں جو ہم کو خدا اور رسول کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

اس حالت میں خیر خواہاں سرکار کا فرض ہے کہ وہ خطیب و نظام المشائخ کو زخمی سپاہیوں میں تقسیم فرمائیں، اس سے بڑھ کر سرکار اور اپنے دین کی کوئی خدمت نہیں ہوسکتی۔''......۲۳

زخ ش کے خط میں خطیب کو ایک مضمون بھیجنے کا ذکر یوں ہے۔

''ایک مضمون ارسال کرتی ہوں، مضمون کیا ہے جذبات محبت و غصہ وغم کا ایک اخف خفیف اظہار ہے۔

بشرطیکہ ثقلِ سماعت کا مرض اسے کانوں تک پہنچا سکے۔ خیر بہرحال ہمیں ادائے فرض ضرور ہے۔ آپ اسے دفتر خطیب میں بغرض اشاعت روانہ کر دیجئے، میں نے براہ راست آپ کو دردمند بنایا یا نہیں؟''.....۲۴

اس رسالے میں زخ ش کی تین نظمیں چھپی جن کی تفصیل درج ذیل ہیں۔

نمبر شمار	عنوان	تاریخ اشاعت
ا۔	تاراجیٔ چمن	فروری ۱۹۱۹ء
۲۔	زنانہ آواز	۲۲ مئی ۱۹۱۹ء
۳۔	کرنل ویجوڈ کا خیر مقدم	دسمبر ۱۹۲۰ء

زمیندار لاہور:

زمیندار منشی سراج الدین احمد نے لاہور سے جون ۱۹۰۳ء میں جاری کیا۔ سالانہ چندہ تین روپے تھا، زمیندار پریس لاہور میں چھپتا تھا۔ منشی سراج الدین احمد ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر تھے، علم و ادب سے شغف تھا۔ تہذیب الاخلاق میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے۔ ابتدا میں یہ اخبار زمینداروں، کاشتکاروں اور کسانوں کے فوائد کے لئے نکالا گیا تھا اور مالی مسائل کا شکار رہا جس کی وجہ سے اخبار کا دفتر لاہور سے وہ اپنے گاؤں کرم آباد، تحصیل وزیرآباد، ضلع گجرانوالہ لے گئے اور وہیں لکڑی کا چھوٹا سا پریس لگا کر چھاپنے لگے۔ اس اخبار کو چوہدری شہاب الدین مرحوم کی ایک پنجابی نظم سے بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی اشاعت ایک ہزار سے بڑھ کر دو ہزار ہو گئی۔

''نومبر ۱۹۰۹ء میں منشی سراج الدین کے انتقال کے بعد ان کے لائق فرزند مولانا ظفر علی خان نے اس کی ادارت سنبھالی اور اسے بامِ عروج پر پہنچایا لیکن ان کے زمانے کا زمیندار زمینداروں کے مسائل کے لئے مخصوص نہیں رہا۔''.....۲۵

''مولانا ظفر علی خان صاحب نے زمیندار کی ادارت سنبھالتے ہی اس میں زندگی کی نئی روح پھونک دی اس میں نئی نئی جدتیں پیدا کیں اور اس نیم سیاسی اخبار کو جلد ہی ایک سیاسی اخبار بنا دیا۔۔۔۔۔ زمیندار جس کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا تم خیر خواہِ دولتِ برطانیہ رہو اب وہ نہیں رہا تھا ایک ایسا اخبار جس نے نہ صرف پنجاب میں بلکہ ہندوستان بھر میں برطانوی استبدار کے خلاف عوام کے قلوب میں نفرت و حقارت کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔''.....۲۶

مولانا ظفر علی خان اس اخبار کو دوبارہ لاہور لے آئے اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے اس کا روزانہ ایڈیشن شروع کر دیا۔ خصوصاً جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کے دنوں میں اس اخبار کی مانگ، اس کے پرجوش مضامین اور تازہ خبروں کی وجہ سے بہت بڑھ گئی۔

زخ ش کو اس اخبار سے خصوصی لگاؤ تھا وہ اپنے خطوط اور ڈائری میں بار بار اخبار 'زمیندار' کا ذکر کرتی ہیں۔ ۱۷جنوری ۱۹۱۴ءکو انہوں نے انیسہ خاتون کو خط میں لکھا۔

''آج کل کی غیر معمولی پریشانی کا باعث وہ آفتِ ناگہانی ہے جو پیارے 'زمیندار' پر ضبطی پریس کی شکل میں نازل ہوئی ہے۔میں زمیندار کو بہت محبت کرتی تھی اور اس کو خاتون کی طرح خاص اپنا اخبار سمجھتی تھی اس لیے اس کی موت کا قلق ہونا ناگزیر تھا۔لیکن نہ اتنا قلق کے رات کو بار بار فرط غم سے آنکھ کھل کھل جائے اور پھر صبح تک نہ لگے۔۔۔۔۔ باوجود یہ کہ ''الہلال'' میری جان اور ''ہمدرد'' مجھے بہت عزیز ہے لیکن جو خصوصیت مجھے اس مرحوم اخبار (آہ مرحوم) سے تھی وہ کسی اور سے نہیں اور یہ تخصیص اس کی مظلومیت ومحسودیت کی وجہ سے تھی۔کوئی اخبار شاید دنیا بھر میں اس قدر محسود عالم نہیں ہوگا جیسا یہ میرا 'زمیندار' تھا۔ افسوس بھائی ظفر کے دل پر عالم غربت میں کیا گزرتی ہوگی۔بارہ ہزار نقد ضمانت کا قرض بھی ادانہیں ہوا تھا کہ تقریباً بیس ہزار کا یہ جھٹکا اور لگا۔کل 'پیسہ' نے یہ جدید خبر سنائی کہ زمیندار پریس بھی قرضے میں مکفول تھا اب دیکھنا ہے کہ وہ قرض خواہ اپنے فوائد کے لئے کیا کارروائی کرے۔''......۲۷

زخ ش کے مجموعہ فردوس تخیل کے مطابق زمیندار میں ان کی ۶نظمیں شائع ہوئی ہیں،جن کی تفصیلات یہ ہیں۔

نمبرشمار	عنوان	تاریخ اشاعت
۱۔	بصائر سیاسیہ	۵ اپریل ۱۹۱۳ء
۲۔	عالم نسواں کا انقلاب	میلاد نمبر ۱۳۳۴ھ
۳۔	تصادمِ رواج وشرع	یکم نومبر ۱۹۱۵ء
۴۔	فرشتوں کی محفل	۴جون ۱۹۲۰ء
۵۔	جلوۂ شب	۱۸جولائی ۱۹۲۰ء
۶۔	موصل کا تیل	یکم اگست ۱۹۲۰ء

زمیندار اخبار میں زیادہ نظمیں بھیجنے کی وجہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''زمیندار سے مجھے اس کے ابتدائی دورِ اول سے خصوصیت پسندیدگی رہی ہے اور اس نے بھی ازراہِ کرم میری نظموں سے بہت اعتناء کیا ہے۔نظموں کے علاوہ نہ تو میں نے مضمون نگاری کی اور نہ اسکے قابل ایڈیٹر سے ذاتی تبادلہ خیالات کیا۔ ایڈیٹر صاحب ممدوح کو یقیناً زخ ش کا پتہ تک نہیں معلوم۔ بلاوجہ عزیز بہن کا خطاب محض ان کی سادہ دلی اور کرم فرمائی کا نتیجہ ہے جسے پڑھ کر مجھے ہنسی آجاتی ہے، کیا حرج ہے رشتۂ اخوت اسلام سے میرے وہ بھائی ہیں۔......۲۸

ستارۂ صبح لاہور:

ستارۂ صبح کے تعارف میں انور سدید لکھتے ہیں۔

''اگست ۱۹۱۷ء میں کرم آباد سے ''ستارۂ صبح'' طلوع ہوا تو اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے مدیر مولانا ظفر علی خان تھے، جن کی تربیت علی گڑھ اور حیدرآباد کے علمی و ادبی گہواروں میں ہوئی تھی۔ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر اور بلند ظرف ادیب تھے، انہوں نے ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ ''افسانہ'' جاری کیا، ۱۹۰۴ء میں ''دکن ریویو'' کو ایک علمی و ادبی ماہنامے کی صورت دی، جو ۱۹۰۹ء تک اردو زبان کی خدمت کرتا رہا۔ دکن سے جبری اخراج ہوا تو ظفر علی خان نے کرم آباد آ کر ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی اور صحافت کو ادب کا ہم پایہ بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ''ستارۂ صبح'' میں سیاست کو عمل دخل سے خارج قرار دیا اور عوام کے علمی، ادبی اور تہذیبی ذوق کی ذمہ داری قبول کی۔ اس پرچے کے ادارہ تحریر میں وحید الدین سلیم، عبداللہ العمادی، وجاہت جھنجھانوی، خواجہ عبدالحی اور اختر علی خان شامل تھے۔ اس پرچے کے ذریعے صحافت سے بدمذاقی کے عناصر کو رفع کرنے اور علم و ادب کو فروغ دینے کی کامیاب سعی کی لیکن یہ پرچہ بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ ''ستارہ صبح'' ۱۹۱۸ء میں غروب ہوگیا۔''......۲۹

ستارۂ صبح میں ان کی مشہور نظم ''سپاسنامہ اردو'' چھپی تھی۔ اس اخبار کیلئے وہ اپنے خط میں لکھتی ہیں۔

''ستارۂ صبح کے نام پر ایک بات یاد آ گئی۔ محترم خواجہ صاحب سے یہ بڑی غلطی سرزد ہوگئی کہ انہوں نے مقتدائے ملت اولین علمبردار صداقت مولوی ظفر علی خان کو میدان صحافت سے بالفاظ ناصح روح کو جسم سے نور کو آگ سے اور دل کے پہلو سے جدا کر دیا۔

ستم کردی الٰہی زندہ باشی۔

میں ستارۂ صبح کا روزمرہ من اولہ الی آخر مطالعہ کرتی تھی۔ اس کے خراب چھاپے اور اپنی آنکھوں کی کمزوری کی بھی میں کچھ پرواہ نہ کرتی تھی۔ تصوف کے بارے میں پازید ایڈیٹر کا ہر حرف میں نے پڑھا، مگر میرے خیالات پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس لیے اخبار سے پیشتر میری جو رائے تھی آج بھی وہی ہے۔۔۔۔۔ مجھے افسوس تھا کہ کیوں زور بیان میں علامہ ظفر علی خان کے قلم سے اکابر اسلام کی شان میں کلمات ناروا نکل جاتے ہیں۔''......۳۰

تمدن دہلی:

ماہنامہ تمدن دہلی اپریل ۱۹۱۱ء کو شائع ہونا شروع ہوا۔ ۷۶ صفحات کا یہ رسالہ شیخ محمد اکرام اور راشد الخیری

ایڈٹ کرتے تھے۔ اس کی قیمت ساڑھے چار آنہ اور تمدن پریس میں چھپتا تھا جبکہ سالانہ چندہ ساڑھے تین روپے قسم اول اور ڈھائی روپے قسم دوم تھا۔ یہ رسالہ معاشرتی تمدنی، ادبی، فلسفی، اخلاقی، تاریخی اور علمی اور مضامین کا مخزن تھا۔

''تمدن کے مقاصد میں زبان اردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کانوں تک پہنچانا تھا اور نثر و نظم میں ایسے مضامین درج کرنا تھا جو خواتین کے مطالعے سے گزر سکیں۔۔۔۔تمدن جاری ہوا تو اس کا اپنا پریس تھا پانچ سو روپے ضمانت کے سرکاری خزانے میں داخل کر دیے گئے تھے جو پہلے سال ہی ضبط ہو گئے۔ اس زمانے میں ترکی سے اٹلی جنگ کر رہا تھا اور علامہ راشد الخیری کے کئی مضامین ترکوں کی حمایت میں شائع ہوئے تھے جس مضمون پر ضمانت ضبط کی گئی۔ اس کا عنوان تھا 'طرابلس کی ایک صدا'۔۔۔۔۔۱۹۱۳ء سے تمدن کی اشاعت میں بے قاعدگی پیدا ہونے لگی۔ تمدن حقوق نسواں پر زور دے رہا تھا اسی قدر اشاعت گر رہی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں خریدار سات سو کے قریب تھے۔ ۱۹۱۵ء میں تینسو سے بھی کم ہوئے۔ سوا چار سال جاری رہ کر تمدن بند کیا گیا۔ بعد میں علامہ راشد الخیری نے اپنے بچپن کے دوست قاری عباس حسین کو یہ پرچہ دیدیا جنہوں نے نومبر ۱۹۱۵ء میں یہ دوبارہ شروع کیا۔''......۳۱

زخ ش کی نظم ''ناشاد تماشائی'' تمدن دہلی کے اگست ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

زخ ش کو اپنی خداداد ذہانت و فراست کی بنا پر اخبار و رسائل کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کو جرائد تک پہنچانے اور ان جرائد کا ریکارڈ اپنے پاس رکھنے کیلئے سہیلیوں اور عزیزوں کو وسیلہ بنایا تھا۔ اگرچہ حالات و ماحول اس سلسلے میں سازگار نہیں تھے، تاہم ان کی تحریریں ان کے عہد کے تقریباً تمام اہم رسالوں اخبارات میں چھپتی رہیں، بلکہ ان کی اشاعت مکرر بھی ہوتی رہی۔ اپنے ایک خط میں وہ لیلیٰ خواجہ بانوں کو لکھتی ہیں۔

''ہمدم میں غزل شائع ہوگئی، خواجہ صاحب کے ہمت افزاء کلمات کا شکریہ ادا کرنا میرے احاطے قدرت سے خارج ہے۔ ہمدم، خطیب، مشرق، البشیر، ہندوستانی، دبدبہ سکندری، تہذیب، عصمت اور پردہ نشیں کے سوا کوئی اخبار میری نگاہ سے نہیں گزرتا۔ ان صحائف کے علاوہ کسی اور اخبار یا رسالے میں میری نظم شائع ہو تو مہربانی کر کے اس کا صفحہ کاٹ کر مجھے روانہ کرنا۔ لیکن تم ان کا فائل رکھتی ہو تو ہرگز ایسا ارادہ نہ کرنا بلکہ پورا اخبار بھیج دینا میں واپسی ڈاک اسے واپس کر دوں گی۔''......۳۲

اخباروں کی اہمیت کا بھی انہیں پوری طرح اندازہ تھا، ایک اور خط میں وہ لکھتی ہیں۔

''اس طرف سے تو اطمینان ہے کہ ہمارے محترم خواجہ صاحب کا قلم بے کار نہ رہے گا اور اس گلفشانیاں برابر جاری رہیں گی۔ میدان صحافت میں نہ سہی۔ صحرائے تصنیف میں سہی مگر زندگی کی ہر ایک منزل میں اخبار ہی کے ذریعے

رہنمائی ہو سکتی ہے۔ دنیائے تصنیف و تالیف اس قدر وسیع نہیں۔......۳۳

وہ اخبار و رسائل کی حتی الامکان اِمداد بھی کرتی رہیں۔ مرشد اور استانی کے لیے خریدار بنانے کا ذکر بھی ان کے خطوط میں ہے جبکہ خواتین کا ایک اخبار نکالنے کی تحریک بھی انہوں نے ہی لیلیٰ خواجہ بانو کو دی تھی۔ زمیندار کی پریس ایکٹ کی مخالفت کے سلسلے میں ضمانت ضبط ہوئی تو انہوں نے مالی اِمداد میں بھی حصہ لیا۔ اخبار و رسائل سے ان کا یہ فطری اور پرخلوص لگاؤ ہی تھا جو آنے والے وقتوں میں ان کی تخلیقات کے تحفظ کی بنیاد بن گیا اور جب انہوں نے اپنا مجموعہ فردوس تخیل مرتب کیا تو اس کے حاشیے پر ان رسائل کا نام اور تاریخ اشاعت لکھیں جن میں وہ شائع ہوئی تھیں۔

حوالہ جات

۱۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔ڈاکٹر انور سدید۔مطبوعہ، رمنا پرنٹرز اسلام آباد۔صفحہ نمبر۳۰۳۔۳۰۲

۲۔ رسالہ عصمت جلد ۱۰۱۔صفحہ نمبر ۴،۶

۳۔ روح صحافت اِمداد صابری۔صفحہ نمبر ۸۰

۴۔ منتخبات تہذیب نسواں ۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر۔صفحہ نمبر ۸

۵۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔داکٹر انور سدید۔مطبوعہ ،رمنا پرنٹرز اسلام آباد۔صفحہ نمبر ۳۰۴

۶۔ تہذیب نسواں ۔۱۸ فروری ۱۹۲۲ء

۷۔ خاتون علیگڑھ ۱۹ اپریل ۱۹۳۱ء

۸۔ خاتون علیگڑھ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء

۹۔ تاریخ صحافت اردو، جلد چہارم ۔ امداد صابری۔مطبوعہ، یونین پریس اردو بازار ۔صفحہ نمبر ۴۵۶

۱۰۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔داکٹر انور سدید۔مطبوعہ ،رمنا پرنٹرز اسلام آباد۔صفحہ نمبر ۳۰۵

۱۱۔ عصمت جلد ۱۰۱۔جولائی ۱۹۵۸ء۔ رازق الخیری۔صفحہ نمبر ۱۷

۱۲۔ تاریخ صحافت اردو،جلد چہارم ۔امداد صابری۔مطبوعہ، یونین پریس اردو بازار ۔صفحہ نمبر ۵۸۷

۱۳۔ شریف بی بی لاہور ۲۲ مئی ۱۹۱۴ء

۱۴۔ عصمت جلد ۱۰۱۔جولائی ۱۹۵۸ء۔ رازق الخیری۔صفحہ نمبر ۱۹

۱۵۔ عصمت اکتوبر ۱۹۹۸ء۔بیگم شائستہ اکرام اللہ۔صفحہ نمبر ۲۵

۱۶۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ بتاریخ ۲۷ مئی ۱۹۱۷ء ۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۷۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ بتاریخ ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۸۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ ۱۰ مارچ ۱۹۱۹ء غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۹۔ تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم۔ امداد صابری۔ مطبوعہ، جمال پریس دہلی۔ صفحہ نمبر ۵۲۸

۲۰۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ بتاریخ ۵ اگست ۱۹۱۸ء۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۲۱۔ تاریخ صحافت اردو، چہارم۔ امداد صابری۔ مطبوعہ، یونین پریس اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ صفحہ نمبر ۷۵۷

۲۲۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔ ڈاکٹر انور سدید۔ مطبوعہ، رمنا پرنٹرز اسلام آباد۔ صفحہ نمبر ۵۹

۲۳۔ تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم۔ امداد صابری۔ مطبوعہ، جمال پریس دہلی۔ صفحہ نمبر ۴۰۰

۲۴۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ بتاریخ ۱۴ نومبر ۱۹۱۸ء۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۲۵۔ اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ۔ تالیف مولوی محبوب عالم، مقدمہ و حواشی، طاہر مسعود
مطبوعہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور صفحہ نمبر ۲۰۶

۲۶۔ تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم۔ امداد صابری۔ مطبوعہ، جمال پریس دہلی۔ صفحہ نمبر ۳۲، ۳۳

۲۷۔ انیسہ خاتون شروانیہ کو خط۔ بتاریخ ۱۷ جنوری ۱۹۱۴ء۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۲۸۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۲۹۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔ ڈاکٹر انور سدید۔ مطبوعہ، رمنا پرنٹرز اسلام آباد۔ صفحہ نمبر ۵۸

۳۰۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۳۱۔ تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم۔ امداد صابری۔ صفحہ نمبر ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۳، ۱۴۴

۳۲۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ ۱۰ اگست ۱۹۱۹ء غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۳۳۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ ۱۵ اگست ۱۹۱۸ء غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

باب چہارم

زخ ش کا خاندانی پس منظر

زخ ش کا تعلق منرز اور معتبر خاندان سے تھا۔ شروانی خاندان سماجی اور علمی دونوں حوالوں سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس خاندان میں متعدد ایسے افراد گزرے ہیں جو اپنے دور میں ممتاز رہے یہی وجہ ہے کہ اس خاندان کی تاریخ ماضی بعید سے حال تک مرتب ہے۔ خصوصاً اس خاندان کے عباس خان شروانی نے جن کا شمار برصغیر کے ممتاز مورخوں میں ہوتا ہے پوری تفصیل سے شروانی نامہ میں خاندان کی تاریخ تحریر کی۔ شروانی نامہ کے سرپوش پر اس کتاب کی تفصیل اس طرح لکھی گئی ہے۔

شروانی نامہ

یعنی

بنگش اور شروانی خاندان (سلف وحال) موجودۂ ہندوستان

کے

تاریخی حالات اور شجرات

مرتبہٗ

حاجی عباس خاں شروانی۔ بی اے (علیگ)

ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر مؤلف "حیاتِ مسعودی" و "تاریخ التواریخ"

بعد

نظر ثانی و اہتمام ونگرانی مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی جرنلسٹ وپبلسٹ و مالک شروانی بک ڈپو

شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ

محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

ستمبر ۱۹۵۳ء

انہوں نے شروانی نامہ میں اپنے خاندان کی تاریخ اور شجرہ بڑی تحقیق وحوالوں کے ساتھ خاندان کے افراد کے تعاون سے مرتب کیا۔ شروانی نامہ زاہدہ خاتون شروانی کے خاندانی پس منظر پر ایک مکمل دستاویز ہے۔ اسی حوالے سے ہارون خان شروانی نے جو زخ ش کی پھوپھی زاد بھن اور گہری سہیلی کے شوہر ہونے کے ساتھ ان کے قریبی عزیز بھی تھے۔

ایک مختصر تاریخ پر مشتمل باب حیات ز خ ش پر بھی تحریر کیا ہے۔ مذکورہ کتابوں کے مطالعے سے جو حالات ز خ ش کے اسلاف اور خاندان کے سامنے آتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر میں خاندان شروانی نے عروج و زوال کے متعدد مراحل طے کئے۔ شروانی شروان یا سروان افغانستان سے برصغیر میں آئے جس کی وجہ سے یہ خاندان شروانی کہلایا۔ اگر چہ شروانی خاندان کے افراد کی برصغیر میں موجودگی کا پتہ غیاث الدین خلجی (۱۲۶۲ء سے ۱۲۸۶ء) اور سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء) کے عہد میں بھی ملتا ہے تاہم شروانیوں کو ہندوستان میں صحیح معنوں میں قدم جمانے اور ترقی حاصل کرنے کا موقع بہلول لودھی کے زمانے میں حاصل ہوا۔ پندرہویں صدی میں بہلول لودھی کی حکومت کے آغاز سے شروانیوں نے مشرقی پنجاب اور دہلی کے نواح میں جاگیریں حاصل کیں۔

''شروانی خاندان کے ایک عالم بزرگ نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر یار جنگ بہادر کے مطابق ہندوستان میں اس خاندان کے تین حقیقی بھائی علوی، لودھی اور شروانی آئے تھے۔''......۱

لودھیوں کے دور حکومت میں شروانیوں کو اصل عروج حاصل ہوا۔ اب تک دہلی کے اکثر سلاطین ترک نژاد تھے۔ بہلول خان افغان تھا اور شروانیوں سے اپنے آبائی تعلق کی بنا پر اسے اپنے قبیلے والوں کے ساتھ انہیں بھی مشرقی پنجاب اور دہلی کے نواح میں جاگیریں دیں۔ شروانیوں نے بہلول لودھی سے اپنی وفاداری نبھائی اور اس خاندان کے سکندر خان شروانی کو ان کی بہادری اور تدبر کی وجہ سے بہلول لودھی کا خصوصی اعتماد حاصل ہوا اور وہ اس کے دربار میں بہت بااثر تھے۔ بہلول کی مجلس شوریٰ میں بہت سے لودھی شامل تھے۔ عمر خان شروانی بہلول لودھی کے دور میں لاہور کے گورنر مقرر ہوئے۔ انہیں سلطان سکندر لودھی کی طرف سے خان اعظم کا خطاب اور ذاتی مصارف کے لئے سرہند شاد آباد اور مشرقی پنجاب میں جاگیر سے بھی نوازا گیا تھا۔ یہی عمر خان شروانی سکندر لودھی کی تخت نشینی کا باعث بنے تھے۔ بہلول لودھی کا انتقال ۱۴۸۸ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی جانشینی کا سوال اٹھا۔ شاہزادہ جلال لودھی کمسن تھا۔ اس کی ماں کی کوشش تھی کہ وہی تخت نشین ہو۔ اس سے بڑا بیٹا نظام خان ایک سنارن کے بطن سے تھا جس کی وجہ سے بہت سے امراء اس کی جانشینی کے خلاف تھے۔ عمر خان شروانی نے نظام خان کو سلطنت کیلئے موزوں سمجھا اور اپنی کوشش و تدبیر سے سلطان سکندر لودھی کے لقب سے تخت نشین کروایا۔ سکندر لودھی کو شروانیوں کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہا اور اس نے انہیں بڑے بڑے عہدوں سے نوازا اور دور دور سے شروانیوں کو بلا کر آباد کیا۔ ان میں ایک سیف خان شروانی دہلی کے نواح میں آباد ہوئے۔

لودھی خاندان کے آخری فرمانروا' ابراہیم لودھی نے عیسیٰ خاں شروانی کو آگرے کا حاکم مقرر کیا' اور عمر خاں کے منجھلے فرزند محمد خاں شروانی کو کول کی حکومت سپرد کی کول آنے پر محمد خاں نے محسوس کیا کہ شہر کا پرانا قلعہ اب اس

قابل نہیں رہا کہ اس سے ایسے اہم علاقے کی حفاظت ہو سکے اور اس کے چاروں اطراف آبادی کے پھیل جانے کی وجہ سے استحکام کی بجائے انتشار پیدا ہو گیا ہے' چنانچہ اس نے ۱۵۵۴ء میں ایک بڑا اور مستحکم قلعہ شہر سے دو میل شمال کی طرف تعمیر کیا اور اس کا نام محمد گڑھ رکھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جس کا نام مغلوں کے آخری عہد میں ثابت خاں نے ثابت گڑھ' جاٹوں نے رام گڑھ اور نجف خاں نے علی گڑھ رکھا' اور جس کی وجہ سے نہ صرف شہر کول بلکہ پورا نواح علی گڑھ کہلایا۔ ابراہیم لودھی سخت متلون مزاج اور کانوں کا کچا تھا' اور جب اس نے ان شروانیوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرنا شروع کیا جن پر اسے کبھی اعتماد تھا' اس نے خان اعظم ہیبت خاں شروانی کو قید کر دیا تو شروانیوں سے رہا نہ گیا اور بعض دوسرے امرا کی طرح وہ بھی اس کے مخالف ہو گئے۔ آنے والے سال ۱۵۲۶ء میں دولت خاں لودھی نے ظہیر الدین محمد بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی' اور پانی پت کے میدان میں لودھی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

مغلوں کی حکومت کو شروانیوں کے لیے ایک دورِ ابتلا سمجھنا چاہیے' لیکن یہی وہ دور تھا جس میں ان کو علی گڑھ اور ایٹہ کے ضلع میں گویا ایک مستقل وطن میسر آیا۔ بابر کی سلطنت قائم ہونے پر شروانیوں کے بظاہر دو گروہ بن گئے' ایک وہ جو اب بھی پٹھانوں کی حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے اور دوسرے وہ جو نئی حکومت کے طرف دار تھے۔ جب بابر نے سنگرام سنگھ عرف رانا سانگا کے خلاف یورش کی تو اس کی فوج میں راؤ خاں شروانی شریک تھا۔ بابر راؤ خاں شروانی کی بڑی عزت کرتا تھا' لکھا ہے کہ ایک مرتبہ تو ایسا ہُوا کہ بابر راؤخاں کے یہاں سکندر ے میں مہمان بھی رہا۔ بابر نے خانِ اعظم ہیبت خاں کے پوتے مظفرخاں کو خانِ جہاں کا خطاب دیا (یہی خان جہاں بھیکم پور میں زخ ش کے مورث اعلیٰ تھے) اور جب شیخ علی شروان نے' جو مشہور مورخ عباس خاں شروانی کے والد تھے' بابر کے دربار میں شریک ہونے کی خواہش کی تو بابر بہت خوش ہُوا اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ لیکن یہ دور بہت جلد ختم ہو گیا' اور ہمایوں ۱۵۳۰ء میں تخت نشیں ہوا ہے تو وہ گویا پہلے ہی دن سے شروانیوں سے مشتبہ ہو گیا۔ اس کے نزدیک شروانی لودھیوں سے کم خطرناک نہ تھے اس لیے کہ ایک تو وہ اور لودھی اپنے آپ کو ایک جدی تصور کرتے تھے اور دوسرے مسند عالی عیسیٰ خاں شروانی کی بیٹی سکندر لودھی کے بیٹے محمود خاں سے منسوب تھی۔ ہمایوں ان سے اس لیے بھی مشتبہ ہو گیا کہ ایک شروانی یعنی خانِ اعظم عمرخاں نے حسن خاں کو شیر خاں کی تعلیم و تربیت کیلئے اپنی جاگیر کا ایک حصہ دے دیا تھا' اور اب شیرخاں ہمایوں کا مد مقابل بن گیا تھا۔ جب شیرخاں نے قلعہ رہتاس گڑھ پر حملہ کیا تو اس کی فوج میں شروانیوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی اور اس کا سردار عیسیٰ خاں شروانی تھا' اور عیسیٰ خاں شروانی ہی کی ایما پر دسمبر ۱۵۳۹ء میں شیرخاں نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اب عیسیٰ خاں کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور شیر شاہ نے اسے نہ صرف سنبھل کا حاکم مقرر کیا بلکہ کچھ مدت بعد اسے حاجبِ خاص کے عہدے سے بھی سرفراز کیا۔

ہمایوں ہندوستان واپس آیا تو ملکی سیاست میں شروانیوں کا کوئی مقام باقی نہیں رہا تھا' اور جن شروانیوں نے دہلی کے قریب پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ دربار سے الگ تھلگ خاموشی سے اپنی زندگی بسر کریں۔ اکبر نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ان شروانیوں میں سے اکثر کو پنجاب چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اس قبیلے کے بعض سربرآوردہ اشخاص نے کول اور اس کے قرب وجوار کے علاقے میں اپنی بودوباش اختیار کر لی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور جہانگیر کے عہد میں ایدل خاں شروانی اور شاہ جہاں کے زمانہ میں سلیمان خاں شروانی کول آئے اور بھموری کے نواح میں اپنا گھر بنایا۔ شاہجہاں کے عہد میں بعض دوسرے شروانیوں کے نام ملتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے عہدوں پر مامور تھے' اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مغل فرمانروا شروانیوں سے مانوس ہوتے جا رہے تھے۔

شہنشاہِ عالمگیر کے انتقال کے بعد جو افراتفری پھیلی اس سے شروانی بھی محفوظ نہیں رہے اور ان کا مقبوضہ علاقہ کبھی فرخ آباد کے بنگشوں کے قبضے میں' اور کبھی روہیلوں کی دست برد میں چلا گیا۔ اس قبیلے کو سب سے بڑا دھکا اس وقت لگا جب بھرت پور کے جاٹ فرمانروا سورج مل' نے ۱۷۵۴ء میں کول پر قبضہ کیا۔ اس نواح کے ایک جاٹ ارجن سنگھ کی بیٹی کی شادی سورج مل کے ساتھ ہوئی تھی' اور ارجن سنگھ کو اب موقع مل گیا کہ وہ چھرے اور بھموری کو قلعہ بند کر کے شروانیوں کو بے دخل کرائے۔ اٹھارویں صدی کے وسط کے قریب کا زمانہ دتاولی اور بھیکن پور کے شروانیوں کیلئے نہایت مصیبت کا زمانہ تھا اس لیے کہ یہ سب اپنے اپنے ٹھکانوں سے' جہاں وہ تقریباً دوسو برس سے آباد تھے نکال دیئے گئے تھے۔

۱۷۵۹ء میں شاہِ عالم دہلی کے ڈگمگاتے ہوئے تخت پر بیٹھا۔ نواب نجف خاں نے جاٹوں کو کول سے باہر نکال دیا اور قلعہ پر قبضہ کر کے اس کا نام رام گڑھ کی بجائے علی گڑھ رکھ دیا۔ مگر بجائے اس کے شروانیوں کو اپنے سابقہ مقبوضہ علاقے پر قبضہ دلائے' اس نے یہ علاقہ گوشائیوں کو پٹے پر دے دیا اور گوشائیوں نے بھیکم پور کے بازخاں اور بعض دوسرے شروانیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جیسے مالک اپنی رعایا کے ساتھ کرتا ہے۔ اس نے اس پر بھی قناعت نہ کی اور آخر بازخاں کو بھیکم پور سے نکال دیا۔

''جب انگریزوں کا زمانہ آیا اور ۱۸۰۳ء میں علی گڑھ کے قلعہ پر انگریزی پرچم لہرانے لگا تو انگریز تقریباً پورے شمالی ہندوستان کے مالک بن گئے اس جدوجہد میں شروانیوں نے انگریزوں کی مخالفت نہیں کی تھی' جس کی وجہ سے حکومت نے انہیں ان کے سابقہ مقبوضہ مواضعات واپس دلادیے اس زمانے میں دتاولی کی ریاست کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ میاں مرادخاں نے بڈھانسی کا علاقہ خریدا اور ان کے بیٹے میاں عبدالرحمٰن نے ضلع بلند شہر کے انگریز زمینداروں' رسل Russel اور کلارک Clarke سے چالیس محال خرید لیے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے سلسلے میں

عبدالرحمٰن خان کے بیٹے نواب فیض احمد خاں بھی ماخوذ ہوئے اور جب بغاوت فرو ہوئی تو انہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے ماتحت رہنا پسند نہیں کیا۔ وہ ایک سو دس چھوٹے بڑے گاؤں کے زمیندار تھے اور جب انہوں نے ملکِ حجاز کو ہجرت کی ٹھان لی تو یہ پورا علاقہ محض ایک ہزار روپے ماہوار کے معاوضے میں اپنے ماموں عنایت اللہ خاں کو جو نواب سرمزمل اللہ خاں کے حقیقی چچا تھے ٹھیکے پر دے دیا۔''......۲

شروانی نامہ میں نواب حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ بہادر کی ایک تحریر بھی شامل ہے۔ نواب صدر یار جنگ خود بڑے عالم تھے ان کی متعدد تصانیف ایسی ہیں جو مقبول ہوئیں۔ ان میں علمائے سلف اور نابینا علماء شامل ہیں۔ وہ ''الندوہ'' لکھنو کے مدیر بھی رہے۔ نظام دکن نے انہیں ۱۹۱۸ء میں صدر امور مذہب کے عہدے پر فائز کیا اور ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ کے خطاب سے نوازا۔ انہیں جامعہ عثمانیہ کا پہلا وائس چانسلر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ تمام خطوط جو ان کے مجموعہ خطوط ''غبار خاطر'' میں شائع ہوئے ہیں۔ انہی کے نام لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے مقدمے میں محمد اجمل خان نے لکھا ہے۔

''اس مجموعے میں جس قدر مکتوبات ہیں وہ تمام تر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے تھے۔ چونکہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی اس لیے یہ مکاتب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔۔۔۔۔۔ نواب صاحب سے حضرت مولانا کا علاقہ بہت قدیم ہے۔ مولانا نے خود ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ پہلے پہل اُن سے ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ ایسے خوش قسمت اصحاب، جنہیں مولانا اپنے ''دوستوں'' میں تصور کرتے ہیں، خال خال ہیں اور صرف وہی ہیں جن سے علم و ذوق کے اشتراک اور رجحانِ طبیعت کے مناسبت نے انہیں وابستہ کر دیا ہے ایسے ہی خال خال حضرات میں ایک شخصیت نواب صدر یار جنگ کی ہے۔۔۔۔۔۔۔ نواب صدر یار جنگ ایک خاندانی رئیس ہیں۔ ملک کے سیاسی معاملات میں ان کا طرزِ عمل وہی رہتا آیا ہے جو عموماً ملک کے طبقہ رؤسا کا ہے یعنی سیاسی کش مکش کے میدانوں سے علیحدگی اور اپنے گوشۂ سکون و جمعیت پر قناعت۔ برخلاف اس کے مولانا کی پوری زندگی سیاسی جدوجہد کی جنگ آزمائی اور معرکہ آرائی کی زندگی ہے لیکن صورتحال کا یہ اختلاف بلکہ تضاد ایک لمحے کے لیے بھی ان کے باہمی علائق کی یگانگت و یکجہتی پر اثر نہیں ڈال سکتا۔''......۳

نواب صدر یار جنگ کی ایک تحریر بھی خاندان شروانی کے بارے میں شروانی نامہ میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''سن ۱۸۰۳ء میں اس نواح میں انگریزی عملداری قائم ہوئی۔ اس وقت بازخان رئیس بھیکم پور تھے۔ ضلع علی گڑھ کے مواضعات کنوبی، بھموری، سکندر راؤ میں بھی شروانی آباد ہوئے مگران میں بزرگ خاندان بازخاں ہی تھے، جو علاوہ دیگر اوصاف کے انتہائی دور اندیش تھے۔ انہوں نے برطانیہ کی قوت کا صحیح اندازہ کرکے بے تامل انگریزی حکومت کو تسلیم کرلیا تھا اور ہر طرح کی مدد برٹش حکومت کو دی تھی حالانکہ ان کے ایک سے زیادہ ہم عصر کوتاہ اندیشی کا شکار ہوئے۔ باز خاں کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے حاجی محمد داؤد خاں صاحب خاندان کے بزرگ ہوئے جو اپنی دینداری، فیاضی اور کنبہ پروری میں بہت مشہور تھے۔ ان کی دیانت کا اس درجہ شہرہ تھا کہ لارڈ ولیم بینٹنک گورنر جنرل ہند نے ان کو آگرہ کا صدرالصدور مقرر کیا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے یہ عہدہ معراج کمال تھا۔ کچھ عرصہ ملازمت کے بعد اس سے مستعفی ہوکر ۱۸۴۹ء میں ایک بڑے قافلہ کے ہمراہ منزل بمنزل سفر کرکے بیت اللہ تشریف لے گئے تھے۔ جب تک ملازمت کی کسی مسلمان پر مسلمان کے سود کی ڈگری نہیں کی۔ یوم جمعہ کو ہمیشہ بعد نماز جمعہ اجلاس پر تشریف لے جاتے تھے۔ آپ کے دو صاحبزادے ہوئے۔ ایک حاجی غلام احمد خاں صاحب والد ماجد نواب سرمحمد مزمل اللہ خاں دوسرے محمد عنایت اللہ خاں۔''

نواب سرمزمل اللہ خان زخ ش کے والد ماجد تھے وہ ایک نامی گرامی خاندان کے فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی حوالے سے بھی ممتاز ومعروف شخصیت تھے۔ نواب مزمل اللہ خان ۱۸۲۰ء میں بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے فارسی، عربی اور انگریزی علوم سیکھے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے وابستہ رہے اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں حصہ لیا۔ ۱۸۸۶ء میں ایم او کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۳ء کے عرصے کے دوران نواب وقارالملک بیماری کی وجہ سے اپنے فرائض سرانجام نہ دے سکے تو اس دوران ان کی جگہ سیکرٹری کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۱۸ء میں بورڈ آف ٹرسٹیز کے نائب صدر بنے۔ ۱۹۱۹ء میں ان کے فیصلہ کن ووٹ کی وجہ سے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ایم اے او کالج کے پرنسپل بنے تھے۔ ٹرسٹیوں کے اس اجلاس کی صدارت کی جس میں ادارے کی وفاداری کی پرانی پالیسی کو جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں سرشاہ محمد سلیمان کے ساتھ یوپی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شریک، صدر رہے۔ ۱۹۲۳ء میں یوپی کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی پر بات چیت کرنے کیلئے یوپی کے مسلمان رہنماؤں کے ایک وفد نے صوبائی گورنر سے ملاقات کی اور انہیں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے سلسلے میں تجاویز پیش کیں۔ اس وفد کی قیادت آپ نے کی تھی، پھر ۱۹۳۰ء میں یوپی پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹاوہ کے صدر بنے۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی وسماجی ترقی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

''انہوں نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ یوپی زمیندار ایسوسی ایشن کے سیکریٹری تھے۔ یکم

اکتوبر ۱۹۰۶ء کوشملہ کے مقام پر ہندوستان بھر کے زعماء کے وفد نے مسلمانوں کے حقوق کے سلسلے میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور ایک یادداشت پیش کی جس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ اس تاریخی یادداشت پر آپ کے بھی دستخط موجود تھے۔ پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس دسمبر ۱۹۰۶ء میں بھی شرکت کی اور اس کے بانی اراکین شامل ہوئے۔ اس تاسیسی اجلاس کے دوران آل انڈیا مسلم لیگ کی پروویژنل کمیٹی قائم ہوئی تو اس میں شامل کیے گئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا اجلاس مارچ ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا تو آپ اس اجلاس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ اپنے استقبالیہ خطبے میں مسلمانوں کے جداگانہ طرز انتخاب کی حمایت کی۔ اس اجلاس میں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کی سنٹرل کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ آپ ۱۹۱۷ء میں یوپی مسلم ڈیفنس ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں مسلم لیگ (ہدایت گروپ) کے تیئسویں اجلاس کے نائب صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۱۶ء میں یوپی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے اور ۱۹۱۹ء تک اس کے ممبر رہے۔ وائسرائے کی کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر بھی نامزد ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں ایک ضمنی انتخاب میں اس کونسل کے دوبارہ رکن منتخب ہوئے' پھر ۱۹۳۰ء میں بھی ممبر بنے اور دونوں مرتبہ کونسل میں ہوم ممبر رہے۔ آنریری مجسٹریٹ اور الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ ۱۹۰۳ء میں انہیں خان بہادر ۱۹۱۰ء میں نواب اور پھر سر کا خطاب ملا۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۸ء کو انتقال کیا۔''.....۳۴

نواب مزمل خان کے سرسید احمد خان سے گہرے مراسم تھے۔ وہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تمام اولاد کو بلا امتیاز تعلیم کے پورے مواقع مہیا کیے۔ سرسید احمد سے لگاؤ کی یہ انتہا تھی کہ انہوں نے اپنی بڑی بیٹی (زخ ش کی بڑی بہن) کا تاریخی نام عزیزہ خاتون بدل کر انہی کے نام پر احمدی بیگم رکھا۔ جنہوں نے بعد میں نکہت کے تخلص سے بہت اچھی شاعری کی۔ تاہم اس وقت کے رسوم و رواج کے مطابق وہ لڑکیوں کے پردے کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ احمدی بیگم نکہت تخلص کرتی تھیں مگر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو مخفی رکھتی تھیں۔ نام کی اس تبدیلی کے بارے میں احمدی بیگم نکہت ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''نظم اور اپنے کل مضامین عزیزہ خاتون علی گڑھ کے نام سے شائع کرانا چاہتی ہوں کیونکہ اس نام سے میری شناخت نہ کرسکیں گے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میرا اصلی نام یہی ہے۔ تین ساڑھے تین سال تک یہی میرا حقیقی نام قائم رہا لیکن میرے والد کے دوست اور محترم قوم اسلام سرسید احمد خان مجھے بہت پیار کرتے تھے اور گود میں لے کر گھنٹوں کھلاتے رہتے تھے۔ ایک روز فرمایا کہ مزمل اللہ خان صاحب اگر میں آپکی لڑکی کا نام تبدیل کروادوں تو مضائقہ تو نہ ہوگا آنجناب کی رضامندی پر سرسید مرحوم نے میرے اوپر دعا پڑھ کر دم کی اور اپنے نام پر میرا نام احمدی رکھ دیا۔ چنانچہ احمدی نام اسقدر مشہور ہوگیا کہ خاندان

غیر خاندان میں کوئی بھی میرے اصلی نام عزیزہ خاتون سے واقف نہیں۔''.....۵

زخ ش کی والدہ حجازی بیگم رئیس بوڑھ گاؤں حاجی محمد کریم اللہ کی صاحبزادی اور عنایت اللہ خان کی نواسی تھیں۔ محمد عنایت اللہ خان نواب مزمل اللہ خان کے حقیقی چچا بھی تھے۔ محمد عنایت اللہ خود بھی بڑے علم پرور اور سرسید احمد خان کے دوست و مددگار تھے۔ علی گڑھ میں ان کی بہت سی یادگار موجود ہیں۔ پکی بیرک کے کئی کمروں پر ان کا نام اسٹریچی ہال میں ایک تختی ،کالج کا بڑا کنواں اور ایک فوارہ ان کی نشانی ہے۔ نواب مزمل خان کی پرورش و تربیت بھی انہوں نے ہی کی تھی جس کی وجہ سے علم پروری ان کی سرشت میں شامل رہی۔

زخ ش کی بڑی بہن احمدی بیگم تعلیم و قابلیت میں اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیت تھیں۔ بہت اچھی شاعرہ اور نثر نگار تھیں۔ نگہت تخلص کرتی تھی اور اپنے دور کے ہر رسالے میں چھپتی تھیں۔ ان کی شادی ننھیالی عزیز عبدالمقیت خان سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد میں بڑی صاحبزادی ناجیہ خانم زوجہ نواب غلام اکرم خان شروانی کا کراچی میں ۱۹۹۸ء میں انتقال ہوا۔ ایک اور بہن رشدہ خانم بھارت دہرہ دون میں مقیم ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی اولاد میں مدیحہ خاتون شروانی اور نعیم اللہ خان شروانی حیات ہیں اور علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ نعیم اللہ خان شروانی شاعری کرتے ہیں۔ ان کے منتخب اشعار رائل اکیڈمی علی گڑھ نے کتابچے کی شکل میں شائع کئے ہیں۔ مدیحہ خاتون رسائل میں مضامین لکھتی ہیں۔ زخ ش کی شاعری پر ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

احمدی خاتون سے چھوٹے بھائی احمد اللہ خان حیران تخلص کرتے تھے۔ یہ بہنوں کے دست راست تھے۔ ان کی علمی ادبی سرگرمیوں میں حصہ دار رہتے تھے۔ خصوصاً زخ ش کو ان سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کے مجموعے میں کئی نظمیں، متعدد اشعار بھائی کے لئے موجود ہیں۔ خصوصاً ان کی وفات پر جو بائیس برس کی عمر میں اچانک ہوئی زخ ش نے جو نظمیں لکھیں ہیں بے حد تاثر انگیز ہیں۔ احمد اللہ خان حیران کیلئے انیسہ خاتون شیروانی لکھتی ہیں۔

''مرحوم اپنی بہن کی طرح سیاسی عقائد میں بڑے وطن دوست، قوم پرست آزاد خیال اور حریت پسند واقع ہوئے تھے، اور والد بزرگوار کے معتقدات سے پہلو بچاتے ہوئے حتی الامکان اس خصوص میں خوب خوب جوہر دکھاتے تھے، جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا ذکر آیا ہے۔ چونکہ اس گھرانے میں بچوں نے شعر و شاعری کا بچپن ہی سے چرچا دیکھا تھا اس لیے یہ ابتدائے عمر سے شعر کہنے لگے تھے، اور رفتہ رفتہ پُرگو اور قادر الکلام ہوتے جاتے تھے۔ زاہدہ خاتون بھائی کے اس شوق پر پھولی نہ سماتی تھیں اور بڑے ذوق و مسرت کے ساتھ ان کا کلام دیکھ کر اصلاح کرتیں اور ان کا ہر وقت دل بڑھاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی رفتہ رفتہ فانی الشعر ہو کر رہ گئے اور اپنے آخر زمانۂ حیات میں تو رات دن اشعار گوئی کے سوا کوئی

شغل ان کو محبوب نہ تھا۔ ہر وقت شعر کہتے اور لاکر بہنوں کو سناتے تھے۔ یوں بھی بھائی بہنوں میں غیر معمولی محبت تھی اس لیے زاہدہ خاتون کے کلام میں جا بجا ان کا ذکر آیا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ہمیشہ نواب صاحب بھائی بہنوں کے باہمی معاملات اور پیار و اخلاص سے دلچسپی رکھتے تھے اور اکثر زمانے میں اسی موضوع پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ دونوں بہنیں والد کے حسب الحکم اپنے بھائی سے انگریزی پڑھا کرتیں اور وہ اپنی چھوٹی بہن سے اصلاح کلام لیتے تھے۔ یہ باہمی روابط محبت روز افزوں ترقی پر تھے کہ اچانک صرف بائیس سال کی عمر میں ان کا سانحہ ارتحال ۱۹۱۶ء میں پیش آ گیا' اور اس طرح مرحوم کے نانا حاجی کریم اللہ خاں صاحب رئیس بوڑھ گاؤں ضلع علی گڑھ کا نام ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا۔ ان بزرگوار کے اپنا کوئی لڑکا نہ تھا' صرف دو بیٹیاں تھیں' ایک لاولد رہیں' دوسری کے اس واحد چشم و چراغ سے ان کا نام بھی بہ حیثیت نانا ہونے کے روشن تھا۔ یہ چراغ بھی ہمیشہ کیلئے عالم نامرادی میں دفعتاً خاموش ہوگیا۔ زاہدہ خاتون پر اس واقعہ کا جو اثر ہوا اس کا تفصیلی ذکر آ چکا ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں ایک شعر کہا تھا۔

''رہ کے دو چار گھڑی نوحہ کناں بھول گئے

اس قدر جلد مجھے اہلِ جہاں بھول گئے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کے ذاتی اوصاف و محاسن' خوش طبعی اور پاکیزہ اخلاق و اطوار دیکھنے والوں کے دلوں پر شاید عمر بھر نقش رہیں گے۔ چنانچہ زاہدہ خاتون نے اپنے اس بھائی کی یاد کو دمِ مرگ تک فراموش نہیں کیا۔''......۶

زخ ش کی والدہ حجازی بیگم کا انتقال شادی کے صرف پانچ برس کے بعد ۱۰ جنوری ۱۸۹۶ء میں چھوٹے لڑکے کی پیدائش پر ہوگیا تھا۔ اس وقت زخ ش کی عمر صرف تین برس تھی۔ نواب مزمل اللہ خان کی دوسری شادی ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ یہ بیوی صرف تین سال زندہ رہیں اور فرزند داؤد خان کی پیدائش پر ان کا انتقال ہوگیا۔ بچوں کی پرورش نواب مزمل اللہ خان نے خود کی۔ ۱۹۲۵ء میں جب احمدی بیگم کے علاوہ ان کی کوئی اولاد باقی نہ رہی تو ان کی تیسری شادی احمدی بیگم نے خود مولوی سمیع اللہ رئیس بلونہ علی گڑھ کی بیٹی سے کروائی۔ ان سے ایک فرزند رحمت اللہ خان حیات ہیں۔ علی گڑھ میں اپنے آبائی گھر مزمل منزل میں مقیم ہیں۔ وہ آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پرووائس چانسلر ہیں۔ علم و ادب سے خاص شغف رکھتے ہیں ان کے پاس نادر کتب کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں ۲۰ ہزار سے زائد کتابیں جن میں کتابوں کا پہلا ایڈیشن اور خطوط بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ اسکے علاوہ پرانے رسائل و اخبارات کا بھی وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ اس ریسرچ کے دوران میں نے نواب رحمت اللہ خان شروانی' صاحبزادہ نعیم اللہ خان شروانی اور مدحت اللہ خان شروانی سے خصوصی ملاقات کر کے زخ ش کی وہ تحریریں بھی حاصل کی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئیں۔ یہ افراد زخ ش کی شخصیت اور کام کو قابل فخر کہتے

ہیں اور اس ریسرچ میں انہوں نے بھرپور تعاون کیا ہے۔

اس ریسرچ میں میرا اہم ترین ذریعہ معلومات مدیحہ خانم شروانی ہیں جن کے پاس زخ ش کی غیرمطبوعہ تحریریں اور خطوط ہیں جن کی نقل انہوں نے مجھے فراہم کی ان کے ایک اور قریبی عزیز ارتضا علی خان ریحان شروانی جو احمدی بیگم نکہت کے نواسے اور مدیحہ خاتون کی بڑی بہن ناجیہ خانم کے صاحبزادے ہیں کراچی میں مقیم ہیں۔ ریحان شروانی نے شجرے کی فراہمی اور معلومات کی تصدیق میں بھرپور معاونت کی ہے۔

زخ ش کے بھائی رحمت اللہ خان شروانی نے بھی مکمل تعاون کیا اور اہم خاندانی معلومات مہیا کیں۔ ان کی خصوصی اجازت سے خواجہ حسن نظامی کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی نظامی نے ان خطوط کی نقل فراہم کی جو زخ ش نے ان کی والدہ لیلیٰ خواجہ بانو کو ۱۹۱۶ء سے تا حیات لکھے تھے۔ یہ خطوط نہ صرف غیرمطبوعہ تحریر کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ بہت سے واقعات کی تصدیق اور تاریخ ان سے مرتب ہوئی ہے۔ زخ ش کے حقیقی بھانجے نعمت اللہ خان شروانی نے بھی معلومات کے حصول میں معاونت کی اور اپنے نانا نواب مزمل اللہ خان سے زخ ش کے بارے میں سنے ہوئے کچھ حقائق کی تصدیق کی۔

زخ ش کی ایک اور قریبی عزیزہ راحیلہ خاتون شروانیہ کا جو ان کی سہیلی بھی تھیں، تحریک پاکستان کی نامور خواتین میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی والدہ مشرقی بیگم اور والد موسیٰ خان شروانی کے گھر مشرف منزل علی گڑھ میں مسلم لیگ کا مرکز تھا کیونکہ مسلم لیگ کی بنیاد اسی گھر میں ڈالی گئی تھی۔ راحیلہ خاتون ابتدائی عمر سے مسلم لیگ کی رکن تھی اور سماجی و سیاسی اعتبار سے متحرک شخصیت تھیں۔ انہی خاتون نے کراچی میں سرسید گرلز کالج بھی قائم کیا اور یہاں پر گراں بہاں تعلیمی و سماجی کام کیئے۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ زاہدہ خاتون شروانیہ کا خاندانی پس منظر علم و کمال سے مزین ہے اور انہیں علم و فضل کا خزانہ ورثے میں حاصل ہوا۔

حوالہ جات

۱۔ شروانی نامہ عباس خان شروانی' صفحہ نمبر۱۱ مطبوعہ شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ

۲۔ حیات زخ ش' انیسہ ہارون بیگم شروانی۔ صفحہ ۸۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۳۔ غبار خاطر، ابوالکلام آزاد۔ مطبوعہ مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، لاہور۔ صفحہ نمبر ۵، ۶، ۹

۴۔ انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان۔ اسد سلیم شیخ۔ صفحہ نمبر ۱۰۴۵

۵۔ احمدی بیگم نکہت کا خط لیلیٰ خواجہ بانو کو۔ بتاریخ ۲۰ اگست ۱۹۱۹ء۔ غیر مطبوعہ

۶۔ حیات زخ ش۔ انیسہ خاتون شروانیہ۔ صفحہ ۲۰۶۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

ز خ ش کا شجرہ

مورث اعلیٰ
جہاں خان
سرفراز خان
تاج خان
باز خان
محمد داؤد خان
زمان خان
غلام محمد خان
غلام احمد خان
عنایت اللہ خان
احمد سعید خان
نواب مزمل اللہ خان
احمدی بیگم
زاہدہ خاتون
ز۔خ۔ش
محمد احمد اللہ خان
نوزائیدہ فرزند
داؤد احمد خان
مراد میاں
محمدی بیگم
رحمت اللہ خان
تہمینہ نکہت
مدحت سعید خان
ناجیہ خانم
رشدہ خانم
مدیحہ خانم
نعمت اللہ خان
ندرت زیبا
ریحان شروانی

زخ ش کا سوانحی خاکہ

زخ ش ۱۸ دسمبر ۱۸۹۴ء بمطابق ۹ جمادی الآخر ۱۳۰۲ھ کو علی گڑھ کے قریب بھیکم پور میں اپنی آبائی حویلی ظفر منزل (جواب نیا قلعہ کہلاتی ہے) میں پیدا ہوئیں۔ وہ اپنے والدین نواب مزمل اللہ خان اور حجازی بیگم کی تیسری اولاد تھیں۔ ان سے بڑی بہن احمدی بیگم جو بعد میں نکہت تخلص کے ساتھ شاعری کی دنیا میں پہچانی گئیں اس وقت ڈیڑھ سال کی تھیں۔ احمدی بیگم سے پہلے پیدا ہونے والے لڑکے کا پیدائش کے وقت انتقال ہوگیا تھا۔ زخ ش کے بعد ایک اور بھائی احمد اللہ خان پیدا ہوئے جنہوں نے بعد میں حیران تخلص اختیار کیا۔ ابھی ان کی عمر تین سال بھی نہیں تھی کہ ۷ نومبر ۱۸۹۷ء کو زچگی کے دوران ان کی والدہ حجازی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح وہ کمسنی میں ماں کی محبت سے محروم ہوگئیں۔ ان کے والد نے ۱۹۰۱ء میں دوسری شادی کرلی جس سے ایک صاحبزادے داؤد خان پیدا ہوئے لیکن ان والدہ کا انتقال بھی تین سال ہی کے بعد ہوگیا۔ بچوں کی پرورش والد نواب مزمل اللہ خان نے اپنی نگرانی اور شفقتوں میں کی۔

زخ ش کا نام زاہدہ بیگم رکھا گیا۔ ان کے تایا حاجی احمد سعید خان نے ان کا تاریخی نام ''نادر خاتون'' نکالا۔ اپنی قلمی زندگی کے آغاز پر انہوں نے زاہدہ بیگم کے بجائے زاہدہ خاتون شروانیہ لکھنا شروع کیا جس کا مخفف زخ ش رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ شاعری میں انہوں نے پہلے گل اور پھر نزہت تخلص اختیار کیا۔

زخ ش کے والد نواب مزمل اللہ خان تعلیم یافتہ، روشن خیال اور علم و ادب سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اس وقت کے معروف فارسی شاعر آغا کمال الدین سنجر سے شعر وسخن میں مشورے کا تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ دی اور اس سلسلے میں بیٹے بیٹیوں میں کوئی تخصیص نہیں برتی۔ وہ سرسید احمد خان کے زیر اثر تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم کو بھرپور اہمیت دیتے تھے۔ ان کے بچپن کے واقعات میں سرسید احمد کی محبت اور شفقت کے حوالے ملتے ہیں۔ زخ ش نے چار سال کی عمر سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا۔ ابتدا میں انہیں قرآن شریف کی تعلیم حافظ احمد علی امام مسجد بوڑھ گاؤں سے حاصل ہوئی۔ ختم قرآن کے بعد اردو لکھنے اور پڑھنے کے لیے ایک استانی کو خصوصی طور پر مقرر کیا گیا۔ اس وقت ان کا خاندان بھیکم پور کی قدیم حویلی سے نئی تعمیر شدہ عمارت ظفر منزل میں منتقل ہوگیا تھا وہاں ایک کمرہ استانی کے قیام کیلئے مخصوص تھا۔ متھرا سے والدہ محمد شفیع کو تعلیم کیلئے بلایا گیا جو ملانی صاحبہ کہلاتی تھیں اور لکھنے پڑھنے کے علاوہ سینے پرونے کی تربیت بھی دیتی تھیں۔ یہ ملانی اپنی شاگرد کی غیر معمولی ذہانت کی ہمیشہ معترف رہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ان کے والد نے باقاعدہ اعلیٰ تعلیم کیلئے معلّمہ کی تلاش شروع کردی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب

لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا صرف قرآن کریم اور بنیادی دینی تعلیم کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ تاہم نواب مزمل اللہ خان نے اپنی بیٹیوں کیلئے اس زمانے کے مطابق اعلیٰ ترین تعلیم کے حصول کو ضروری سمجھا اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور توجہ دی۔ اس زمانے میں عربی، اردو کے ساتھ فارسی کا علم ضروری تھا۔ سرسید احمد خان کے زیر اثر انگریزی تعلیم بھی رائج ہورہی تھی۔ نواب مزمل اللہ خان نے اپنی لڑکیوں کیلئے ایک معلّمہ کی خدمات حاصل کیں جو طہران کے اعلیٰ تعلیم یافتہ شریف اور علم وادب کے حامل خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا اصلی نام رخشندہ خاتون تھا اور آغا کمال الدین سنجر کی رشتے میں بہن تھیں کسی وجہ سے ایرانی حکومت کی طرف سے معتوب ہوکر ہندوستان آ گئیں تھیں اور بھوپال میں قیام پذیر تھیں۔ انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے فرخندہ بیگم طہرانیہ اختیار کیا۔ انہیں فارسی زبان اور شاعری پر غیر معمولی دسترس تھی۔ طبیعت بے حد موزوں تھیں۔ منظوم خط و کتابت کرتی تھیں۔ چونکہ ان کی زبان فارسی تھی اس لئے وہ زاہدہ خاتون سے فارسی میں گفتگو کرتی تھیں۔ اس طرح زاہدہ خاتون نے کم عمری میں فارسی تقریر وتحریر پر عبور حاصل کرلیا اور صرف ۱۱برس کی عمر میں فارسی میں خط وکتابت کرنے لگیں۔ یہ خطوط وہ اپنی معلّمہ اور ان کے بھائی آغا سنجر کو لکھتی تھیں۔ انہیں کے زیر اثر زخ ش نے ۱۰سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کر دیئے۔

زخ ش کو صرف ونحو حساب اور فقہ کی تعلیم مولوی محمد یعقوب اسرائیلی نے دی جو اپنے علم وفضل اور مرتبے میں بہت اعلیٰ مقام رکھتے تھے جبکہ انہوں نے عربی کی اعلیٰ تعلیم مولوی سید احمد ولایتی سے حاصل کی جو ان کے بھائی احمد اللہ خان کے لئے مقرر کیے گئے تھے۔ زخ ش نے بڑی توجہ سے احادیث اور قرآنی تراجم کا بھی مطالعہ کیا۔

نواب مزمل اللہ خان نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اردو فارسی اور عربی کی ممکنہ اعلیٰ ترین تعلیم فراہم کرنے کیلئے انتظامات کے ساتھ اپنے صاحبزادے احمد اللہ خان کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ فرصت کے اوقات میں انہیں انگریزی پڑھائیں۔ وہ خود بھی علم کے دلدادہ اور شعروسخن سے شغف رکھتے تھے اس طرح گھر میں ادبی ماحول ہمہ وقت رہتا تھا۔ ایسے میں زخ ش کو ابتدائی عمر ہی سے علمی مشاغل اور قلمی استعداد بڑھانے کیلئے پورے مواقع میسر آئے۔ وہ ایرانی معلّمہ کی شاگردی میں بہت کمسنی میں اشعار کہنے لگی تھیں۔ دس سال کی عمر میں ایک چھوٹی سی پاکٹ بک پر انہوں نے خوشخط اپنے اشعار لکھے۔ اس پاکٹ بک کو انہوں نے کلیات کا عنوان دیا۔

۱۹۰۵ء سے ان کی نومشق شاعری کا آغاز ہوگیا تھا اس وقت وہ اشعار جو چھوٹی سی بیاض میں لکھے ہوئے تھے اگرچہ بہت پختہ نہیں لیکن ایک دس سالہ لڑکی کے بیحد روشن مستقبل کا پتہ دے رہے تھے۔ ان میں مستقبل کا عزم اور شاعری میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی خواہش موجود ہے۔ اشعار دیکھئے۔

دائم مری مدد پہ اگر کبریار ہے — دنیا میں ثانی بھی کوئی میرا بھلا رہے
ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو — سارا جہان نظم میری دیکھتا رہے
میں شاعری میں اتنی ہوں مشہور کبریا — سورج کی طرح نام چمکتا میرا رہے

اپنی بیاض کیلئے وہ خود اپنے مضمون میں لکھتی ہیں۔

''مجھے اپنی وہ ننھی منی پاکٹ بک بھی یاد آ گئی جو اس زمانے میں مجھے جان کے برابر عزیز تھی۔ اس پیار کا باعث لفظ کلیات تھا جو اس کے پہلے صفحے پر بڑی خوشخطی سے لکھا گیا ہے۔''......!

علم و ادب سے لگاؤ اور مطالعے نے انہیں کم عمری میں سیاسی و سماجی شعور عطا کر دیا۔ اس کا اظہار وہ اپنے خاندانی حلقے میں کرنے لگیں اُس وقت ان کی عمر بمشکل بارہ سال ہوگی۔ انہوں نے اپنے بھائی بہن اور قریبی رشتہ دار ہمسنوں سے مل کر انجمن بنائی جس کا ابتدائی نام انجمن معین نسواں رکھا۔ ابتداء میں یہ ان کے علاوہ ان کی سگی بہن محمدی بیگم نکہت اور دو پھوپھی زاد بہنوں انیسہ بیگم شروانیہ اور مونسہ بیگم شروانیہ پر مشتمل تھی۔ بعد میں دونوں گھروں سے بھائیوں کو شامل کر کے آٹھ ممبران ہو گئے۔ وہ عمر جو کھیل کود کی تھی اس میں زاہدہ خاتون نے ایسے مشاغل اپنائے جو اصلاح اور خصوصاً خواتین کی فلاح و بہبود سے متعلق تھے۔ انجمن معین نسواں کے آغاز کے دنوں میں انہوں نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو جو خط لکھا اس میں یہ اصرار تھا کہ خواہ دو ممبران ہی شامل ہوں اس کا اجلاس باقاعدگی سے ہوتے رہنا چاہئے کہ ابھی انجمن کی حیثیت مستحکم نہیں ہوئی ہے ایسے میں اجلاس روک دینا ان کے الفاظ میں ''زہر ہے''۔ اس انجمن کی سیکرٹری وہ خود تھیں جبکہ صدر بڑی بہن محمدی بیگم تھیں۔ بعد میں جب بھائیوں کو شامل کیا تو ان کے بھائی احمد اللہ خان حیران شروانی جوائنٹ سیکرٹری اور پھوپھی زاد بھائی انس احمد ابد شروانی جو علیگڑھ میں زیر تعلیم تھے اپنی بہنوں کے ساتھ متحرک ممبر رہے۔ انجمن کے سلسلے میں وہ اپنے پھوپھی زاد بہن بھائیوں سے مسلسل رابطہ رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی انیسہ شروانی کو جو ان کی ہم عمر بھی تھیں وہ تا عمر خط لکھتی رہیں یہ خطوط ان کے حالات زندگی اور فکر و تحریک سے آگاہی کا مستند ذریعہ ہیں۔ انجمن معین نسواں کا ممبری چندہ دو روپیہ ماہوار سالانہ آٹھ روپے تھا پھر تین فلاحی فنڈ انکی' دو پیسے اور ایک پیسہ فنڈ تھے۔ ہر خوشی کے موقع پر مثلاً عید اور دیگر تہوار' تقریبات' گڑیے گڈے کی شادی کے موقع پر اس فنڈ میں چندہ لیا جاتا تھا۔ اس طرح کھیل میں سماجی تربیت اور فلاح و بہبود کی صورت شامل تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ز خ ش نے انجمن معین نسواں کا نام تبدیل کر کے ینگ شروانیز لیگ رکھنے کی تجویز پیش کی۔ اس پر تمام ممبران میں بحث و مباحثہ ہوئے بعض کا خیال تھا کہ انگریزی نام نہ رکھا جائے لیکن اس نام پر ز خ ش کا جو استدلال تھا وہ اپنی جگہ ان کی ذہانت' بصیرت اور عمل کی قوت کا آئینہ دار ہے۔ وہ انیسہ خاتون کو اس سلسلے میں ایک خط

لکھتی ہیں اور اپنی بات پر مضبوط دلائل پیش کرتی ہیں یہ خط ۱۹۱۰ء میں ۱۴سال کی ایک ایسی لڑکی نے لکھا ہے جو مکمل پردے میں رہی ہے گھر کی چاردیواری کے باہر دنیا سے اس کا واسطہ صرف کتابوں اور رسائل کی حد تک رہا وہ بھی اس زمانے میں بہت کم دستیاب تھیں۔خط کے مندجات دیکھئے۔

''اب میں آپ لوگوں سے ایک استفسار کرتی ہوں۔ خاص کر برادر مکرم مولوی محمد انس خاں صاحب سے۔ آپ لوگوں کی رائے ہے کہ اُردو نام کو انگریزی پر ترجیح ہے۔ بلکہ برادر ممدوح الصدر نے تو فارسی کو بھی انگریزی سے بہتر گردانا ہے۔ خوب۔ آپ معاف کریں مجھے آپ کی اس رہبانیت و ربانیت (شاید تعصب کہنا سوء ادب میں داخل ہو) سے اختلافِ عظیم ہے۔ بلا سبب بلا وجہ انگریزیت سے نفرت کٹ ملائیت ہے۔ اگر سوچوتو خذ ماصفا دع ماکدر ایک زرین مقولہ ہے۔ میں سمجھ نہیں سکتی کہ اپنی سرکاری اور فی زمانہ نہایت ضروری زبان پر فارسی کو جو ایک غیر زبان ہے کیوں ترجیح دی جائے۔ رہا اُردو نام۔ اس پر ہم البتہ سنجیدگی سے بحث کرسکتے ہیں۔ لیکن اول تو اس کی ماہیت معلوم ہونی چاہئے۔ کیا''شروانیوں کی مجلس''یا''لڑکیوں کی انجمن'' پر اتفاق ہوسکتا ہے۔ یقیناً ایسے اچھوتے الفاظ بہت نامناسب ہوں گے۔ دوسرے ہم نے ابھی تک ٹھیٹ اُردو نام کسی مجلس کا نہیں سُنا۔''ہاں'' ''انجمن شروانیہ'' ضمیر ہے۔ انجمن یا مجلس کی طرف اس سے کارکنان مجلس کی تانیث ظاہر نہیں ہوتی۔ ''مجلس شروانیہ'' میں نصف اول فارسی ہے اور نصف آخر عربی۔ یہ گڈ مڈ ایں جناب کو پسند نہیں۔ انگریزی نام اکثر مجالس کے ہوتے ہی ہیں۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ فائدہ یہ بھی ہے کہ عمر بھی معلوم ہوسکتی ہے۔ جیسے ''ینگ'' گرلز۔ اس لیے ینگ شروانیز لیگ موزوں نام تھا۔ اگر یہی رہتا تو غالباً بُرا نہ ہوتا۔ پیاری بہن خفا ہونے کی بات نہیں۔ آج کل انگریزی محکوم رہ کر (کیونکہ ہماری ضروریات کا انحصار ہی انگریزی پر ہے) انگریزی سے نفرت اور اس سے احتراز دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر ہے۔ یا گُڑکھائیں اور گلگلوں سے پرہیز والا معاملہ ہے۔عربی نام ہمارے سرآنکھوں پر مگر یہ کچھ مذہبی مجالس ہی پر پھبتا ہے۔عربی ہو یا اُردو۔ فارسی ہو یا انگریزی بہرحال نام ایسا ہونا چاہئے کہ عمر خاندان سب کچھ آجائے۔ آخر انگریزی نام میں قباحت کیا ہے۔؟ ہماری موجودہ ذلیل حالت کا کیا باعث ہے؟۔ یقیناً تعصب۔ دیگر اقوامِ ہند کولو۔ ہندو برہمن پارسی سب خرمنِ یورپ کے خوشہ چین ہیں۔ قرونِ اولی میں جب ترقی اسلام کا آفتاب نصف النہار پر تھا ہم کو ہر فرقے کی عمدہ باتیں اختیار کرتے میں مطلق عار نہ تھا۔ تواریخ اسلام شاہد ہے اور عربی تعلیم (اگر اس کا اصل مطلب سمجھیں) تو بذات ایک اعلیٰ زبان ہے لیکن بدقسمتی سے آج کل اس سے تعصب اور تاریک خیالی کا اکتساب کیا جاتا ہے۔ یہ میرے دوستانہ ریمارکس ہیں۔ اگر ٹھنڈے دل سے آپ غور کریں۔ تو ضرور اس کی تائید کریں گے۔ والسلام علی من اتبع الھدی۔ نیز اپنے بھائی صاحب کو بھی اگر ہرج نہ ہو تو یہ خط دکھا دیجئے۔ میں بیتابی سے جواب کی منتظر رہوں گی۔''......۲

یہ خیالات ذہن کی پختگی، حالات پر گہری نظر، غیر معمولی ذہانت اور معاملہ فہمی کا آئینہ ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے زخ ش کو کیسی نادر صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اس طرح انہوں نے انجمن معین نسواں کا نام ینگ شروانیز لیگ کر دیا اگرچہ یہ ایک گھریلو انجمن چند نوجوان بہن بھائیوں پر مشتمل تھی لیکن اس کی باقاعدہ کارروائیاں تحریر میں لائی جاتی تھیں اور یہ تحریر و ترسیل زخ ش خود کرتی تھیں۔ انہوں نے بحث و مباحثے کے بعد انجمن کے مقاصد کے قواعد وضوابط بھی متعین کر دیے تھے۔ جن سے ان کی ذہانت اور تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہیں خواتین کی پسماندگی کا واضح شعور تھا۔ وہ ان کی حالت زار پر کڑھتی اور اس کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ ان کے روزنامچے میں جا بجا ان خواتین کا تفصیل سے ذکر ہے جن سے سماجی سطح پر ناانصافی ہوئی ہے۔اس سلسلے میں ان کی نظم آئینہ حرم بھی مشہور ہوئی جس کی تفصیل اوراق مابعد میں قلم بند ہوگی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ دو شعبوں میں اجتماعی بنیاد پر فلاح و بہبود کے کام کرنا چاہتی تھیں۔ ایک تو لڑکیوں کی تعلیم اور خواتین کی سماجی پسماندگی کو دور کرنا دوسرے برصغیر کے مسلمانوں اور اُردو زبان کی حمایت اس کا بے حد موثر اظہار انہوں نے شاعری میں بھی کیا ہے لیکن فکر و عمل کی بنیاد بچپن میں ہی پڑ گئی تھی۔ یہاں میں ان کی بنائی ہوئی ینگ شروانیز لیگ کے اغراض و مقاصد اور قواعد وضوابط جو خود انہوں نے تحریر کیے تھے نقل کر رہی ہوں جن سے اعلیٰ مقاصد کے عملی اقدامات کا پتہ چلتا ہے۔

اغراض و مقاصد انجمن

"

(۱) نہایت مفید اور ضروری کاموں میں فرقہ نسواں کے شریک اور اس کی مالی مدد کرنا

(۲) تبادلۂ خیالات۔

(۳) اُردوئے معلّٰی کی حمایت جو بذریعہ لیکچر اسپیچ وغیرہ کی جاتی ہے اور سب لیکچر سیکریٹری صاحبہ کے پاس بہ حفاظتِ تمام جمع رہتے ہیں۔

(۴) مستورات میں چھوٹے چھوٹے جلسوں میں شریک ہوتے ہوتے بڑے بڑے قومی اور ضروری جلسوں میں شریک ہونے کی قابلیت پیدا کرنا۔

(۵) بی بیوں کو ممبری پریسیڈنٹ شپ کے فرائض سکھانا۔

(۶) مستعدی اور گرم جوشی کی عادت دلانا۔

(۷) قومی کاموں میں دلچسپی لینے کا شوق دلانا۔

(۸) لائق اور گرم جوش ممبروں کی شہرت کر کے انہیں خدمتِ قوم کی زیادہ ترغیب دلانا۔

قواعد وضوابط ممبری

(۱) ہر ممبر کو دو ماہ کے اندر اندر چندۂ مقررہ تعین ادا کرنا ہوگا۔

(۲) ہر ممبر کو بوقت شمولیت انجمن کو قلمے، قدمے، درمے، سخنے مدد دینے کا عہد کرنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔''

اس انجمن کے تحت جو فنڈ قائم کیے گئے تھے اس سے بھیکم پور اور دتاولی میں بچوں کی تعلیم کیلئے ایک ایک معلم کی تقرری کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فنڈ سے بچوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور معلمین کی تنخواہ دینے کا جو فیصلہ ہوا اس میں یہ شرط رکھی گئی کہ بچیوں کو بھی تعلیم دی جائے۔ اس تعلیم گاہ کا نام شروانی اسکول رکھا گیا۔ انجمن کے تحت ٹائپ رائٹر خریدنے، رسالہ مرتب کرنے اور میٹنگ کے اختتام پر موضوعات پر لیکچر دینے کا سلسلہ بھی رکھا گیا۔ ایک جلسے میں جس کی صدارت انیسہ خاتون نے کی۔ حریت نسواں پر صدارتی تقریر کا اہتمام کیا گیا۔ ان تمام انتظامات میں زرخ ش پیش پیش رہیں بلکہ اصل محرک بھی وہیں تھیں۔ انجمن کی جانب سے دیگر تنظیموں کو بھی وقت ضرورت چندہ بھیجا جاتا تھا۔

اس انجمن سے متعلق انتظامی معاملات میں ان کے تیور دیکھیے۔ انیسہ خاتون کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''مائی ڈیئر جائنٹ سیکریٹری ایسوسی ایشن پچھلے ہفتے ایک خط خاکسار سیکریٹری نے آپ کو لکھا جو چند ضروری ہدایات پر مشتمل تھا۔ ہم اس کے جواب کے تحت منتظر تھے۔ مگر افسوس اور تعجب ہے کہ ہم کو اس انتظار میں ناکامی ہوئی۔ حالانکہ ہمارے جوشیلے ممبر احمد اللہ خان صاحب نے ایک خط ہمارے نئے ممبر محمد انس خان صاحب کے نام لکھا تھا جس کا جواب آج ملا۔ اگرچہ وہ میرے خط سے تین دن بعد بھیجا گیا تھا اور میں نے تم سے جلدی کی تاکید کی تھی۔۔۔۔۔۔ میں اب تم سے جواب طلب کرتی ہوں کہ اس غفلت شعاری کا باعث کیا ہے۔ براہ مہربانی اس خط کا جواب جلدی دیا جائے۔ محمد مونس خان و مونیسہ بیگم ممبران انجمن سے جواب طلب کیجئے کہ باوجود باقاعدہ دعوت شمولیت جلسہ آپ نے جواب کیوں نہیں دیا۔ اور میں دوبارہ لکھتی ہوں کہ ریزولیوشنز تحریری خاکسار کے پاس بھیج دیے جائیں دس رمضان کے جلسے میں یہ طے ہوجائے گا کہ کیا کیا تجاویز سالانہ جلسوں میں پیش ہوں گی اور یہ ضروری لکھیے اکنی فنڈ کی میزان کل کیا ہے اور عہدہ داران نے بحالت مجموعی اس میں کتنا حصہ لیا ہے۔ جو کام میں نے آپ کے سپرد کیا تھا یعنی مس محمد موسیٰ خان صاحب سے خط و کتابت وہ اگر آپ نہ کرسکتی تھیں تو صاف لکھ دیا ہوتا نہ کہ اور ضروری امور کی طرف سے بھی سپوت کیا۔ آپ ہی سوچیئے کیا یہی آپ کے عہدے کا فرض ہے۔

میں ہوں آپ کی سچی خیرخواہ

Z.B''......۳

اپنی صنف کے لیے حساسیت اور ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی جرأت ان میں اوائل عمر سے تھی، جس کا وہ اظہار کرتی رہتی تھیں۔ انیسہ خاتون کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''حیران صاحب نے سرمایہ لیگ میں یہ ایک اور شگوفہ چھوڑا کہ مردانہ چندے میں شامل ہوکر (میری معرفت) ترکی جائے۔ افسوس مردوں کی کوئی بات جھگڑے اور نفسانیت سے خالی ہوتی ہی نہیں۔ ایک تو لڑکیوں کی حق تلفی ہوئی کہ تقریباً مردانہ ہی کاموں میں سرمایہ صرف ہوا۔ دوسرے یہ ستم ہے کہ لڑکیوں کے ذریعے بھی نہ جائے ہماری (سیکریٹری و پریذیڈنٹ) کی تو یہی رائے ہے کہ انجمن خاتونان اسلام کے ذریعے نسوانی چندے میں شامل ہوتا جائے۔''......۴

تعلیم سے تربیت تربیت سے عمل اور عمل سے تحریر تک زخ ش نے جو چار دیواری میں پلی بڑھیں تھیں فکر وشعور کا حیرت انگیز سفر کم عمری میں طے کرلیا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے رسائل میں فکر انگیز مضامین اور نظمیں بھیجنی شروع کردیں۔ ۱۹۱۱ء سے ان کی تحریریں اس وقت کے رسائل اور اخبارات میں چھپنے لگیں۔ ۱۹۱۲ء میں زخ ش کے نام کی طرف پڑھنے والے متوجہ ہونے لگے اس وقت برصغیر اور بین الاقوامی سیاست میں غیر معمولی واقعات رونما ہورہے تھے۔ برصغیر میں مسلم یونیورسٹی کا قیام' بنگال کی تقسیم' مسجد کانپور کی شہادت' ہندو مسلم اتحاد جیسی تحریک بحث و مباحث کا حصہ تھے تو دوسری طرف جنگ طرابلس' جنگل بلقان اور جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی جس نے ساری دنیا کو متوجہ کیا ہوا تھا۔ زخ ش ان مباحث میں گھر والوں کے ساتھ حصہ لیتی اور اپنے خیالات کو خطوط کی شکل میں رشتہ داروں اور مضامین کی شکل میں عام قارئین تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ وقت ضرورت عملی امداد کی دعوت بھی دیتیں۔

زخ ش کو ۱۹۱۱ء میں نانی اور اس کے چند برس بعد ہی نانا کے انتقال کا صدمہ سہنا پڑا۔ والدہ کا انتقال بچپن میں ہوگیا تھا اس لیے نانی اور نانا سے قربت اور محبت میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ انہیں اپنے ننھیال سے گہرا لگاؤ تھا۔ اپنی خالہ سے بھی بہت محبت تھی جن کا ذکر وہ بار بار اپنے روزنامچے میں کرتی ہیں۔ وہ انہیں مظلوم سمجھتی تھیں کیونکہ ان کی خالہ کے شوہر ایک بیحد غیر ذمہ دار' لالچی اور عیار شخص تھے جنہوں نے اپنی بیوی کو زندگی بھر اذیت دی اور ان کی ایک لے پالک لڑکی سے دوسری شادی کرلی تھی۔ زخ ش اور ان کے والد خالہ کی بیماری میں علاج اور تمام معاملات کو ہمدردی اور محبت سے نبھاتے رہے ہیں۔ نانا نانی کے بعد جب خالہ کا انتقال بھی ہوگیا تو ان کے صدمے میں ننھیال کی آبائی حویلی سے ٹوٹنے والے تعلق کا دکھ بھی شامل ہوگیا۔ انہوں نے اس دکھ کا اظہار اپنے روزنامچے میں یوں کیا ہے۔'' ننھیال کی اس حویلی کا چپہ چپہ نہایت حسرت کے ساتھ آنکھوں میں گھوما کرتا ہے جس میں پہلے نانا نانی اور پھر خالہ کے زیر سایہ ہزاروں مسرت پاش لیل و نہار بسر کیے۔ آہ یہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہونے والی حویلی مجھے اماکن مقدسہ کے بعد دنیا کی ہر عمارت

سے زیادہ پیاری ہے۔''

زاہدہ خاتون کی پرورش وتربیت میں والد کی توجہ وشفقت کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے اس زمانے کے رسم و رواج سے ہٹ کر بیٹیوں کی اعلیٰ تعلیم کا تمام تر بندوبست کیا اور ان کے علمی مشاغل کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ حالات حاضرہ اور شعروسخن پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ شاعری وہ خود بھی کرتے تھے بچوں سے شاعری پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ مصرعے موزوں کرنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔ کھیل وکود میں وہ ایسے مشاغل کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جن سے ذہنی وسعت اور جمالیاتی احساس پیدا ہو۔ زاہدہ خاتون چونکہ چھوٹی تھیں اور جسمانی طور پر بھی وہ نازک تھیں اس لیے والد کی شفقت اور توجہ زیادہ ان کی جانب تھی۔ وہ انہیں گڑیا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ خود زاہدہ خاتون کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ والد انہیں زیادہ پیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے روزنامچے میں لکھتی ہیں۔''جس طرح میں ابویا (والد) کو زیادہ پیار کرتی ہوں اس طرح وہ بھی مجھے سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ یہ فیصلہ خیالی نہیں بلکہ جناب ممدوح کہ صریحی اقوال و برتاؤ پر مبنی ہے۔''

والد سے ان کی اس گہری محبت نے ایک طرف وہ اعتماد پیدا کیا جس نے ایک بڑی شاعرہ اور دانشور شخصیت کی تشکیل کی تو دوسری طرف ایک مسلسل کشمکش کا بھی شکار رکھا۔ اس کشمکش میں اس زمانے کے رواج کے مطابق اپنی شناخت کو چھپانا اور اظہار کو عام نہ ہونے دینا سرفہرست تھا۔ ایک طرف خیالات و اظہار کو عام کرنا تو کیا باہر کی دنیا سے کسی بھی قسم کا تعلق رکھنا خواتین کیلئے ممنوعہ فعل تھا۔ دوسری طرف والد سے سیاسی ونظریاتی اختلاف بھی شدید تھے بلکہ دونوں ہی بالکل جداگانہ راہ کے مسافر تھے۔ والد انگریزوں کے وفادار تھے۔ جنہیں سلطنت برطانیہ سے سر کا خطاب ملا ہوا تھا۔ دوسری طرف زخ ش نہ صرف مسلمانوں کی ہمدرد ومددگار تھیں بلکہ یورپ اور سلطنت انگلشیہ کی بہت بڑی نقاد بھی۔ عمر کے آخری مرحلے میں تو انہوں نے مہاتما گاندھی کی سودیشی تحریر سے متاثر ہوکر خود کھدر کے استعمال پر کاربند ہونے اور دوسروں کو اس کا مشورہ دینے کیلئے خطوط لکھے۔

انہوں نے اپنی شاعرانہ شناخت نہ صرف قارئین سے پوشیدہ رکھی بلکہ اپنی عزیز ترین ہستی والد سے بھی اس سلسلے میں گہرا پردہ قائم رکھا۔ انہیں ہمہ وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ خاندانی رسم ورواج کے خلاف یوں تحریر کا چھپنا والد کے علم میں آیا تو معیوب سمجھ کر آئندہ کے لیے لکھنے پر پابندی نہ عائد کردیں یا ناپسندیدگی کا اظہار کردیا تو ان کے حکم کیخلاف نہ جاسکیں گی۔ ان پابندیوں کا اندازہ ان کی بہن نکہت کے ایک خط سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے ایک مضمون جو مولانا ظفر علی خان کی حمایت میں تھا پرنکتہ چینی کے بعد لکھنا موقوف کردیا تھا۔ وہ لیلیٰ خواجہ بانو کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''لیلیٰ غور تو کرو اگر میں نے اپنے نام سے مضمون نگاری شروع کی ہوتی تو کس قدر غضب ہوجاتا۔ میرے والد کے اگر کان تک میں یہ بھنک پڑ جائے کہ کسی غیر مرد نے مجھے غیر مرد کے پیچھے گالیاں دی ہیں تو واللہ میرے لیے قیامت صغریٰ کا سامنا ہو۔ مضمون لکھنا تو کیا معنی دنیا بھر کا کوئی اخبار تک میرے ہاتھوں میں نہ دیا جائے اور نوکیلا خاندان علیحدہ زندگی سے بیزار کردے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ معاملہ خیریت سے گزر گیا ورنہ میرے لیے دنیا اندھیر ہوجاتی۔ زنانہ مضامین کی نگاری کے مخالفین رشتے دار میرا کلیجہ چھلنی کردیتے کہ اور لکھ۔ دیکھا انعام میں کیسی گالیاں ملی ہیں جبھی تو عورتوں کو لکھنے سے منع کرتے ہیں۔ تمام خاندان میں فقط میرے ایک رشتے کے ماموں عامر مصطفیٰ خان شروانی رئیس بوڑھ گاؤں (جو ہم دونوں کو حقیقی ماموں سے زیادہ چاہتے ہیں اور ہم دونوں بھی حقیقی ماموں نہ رکھنے کا باعث انہیں سگا ماموں سمجھ کر بے حد ان سے مانوس ہیں) ہماری مضمون نویسی اور اشاعت نام سے واقف ہیں۔''......۵

زخ ش کے لیے اپنی رواں طبیعت پر بند باندھنا ممکن نہ تھا۔ دوسری طرف نکتہ چینوں اور غیر ذمہ دارانہ باتیں بنانے والوں کا خوف انگشت کا نمائی خطرہ، سیاسی نظریات کا والد کی حیثیت پر اثر انداز ہونے کے اندیشے غرض ہر طرح سے حالات لکھنے کیلئے سازگار نہیں تھے۔ اس صورت حال میں بھی وہ نام بدل بدل کر جن میں زخ ش 'گل' نکہت' ایک مسلمان خاتون آف علیگڑھ' ایک سخن گو خاتون' نادر خاتون وغیرہ شامل ہیں لکھتی رہیں۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتی ہیں

''ہاں تو کہیئے۔؟ یہ کون صاب ہے جنکی نگاہ دور بین کو نادر خاتون کا سرمستور نظر آ گیا! ضرور ضرور براہ کرم لکھنا اور اس اخبار کا نام بھی تحریر کرنا جس نے اشعار نقل کیے تھے۔ نظم ''مافی الضمیر'' میں نادرخاتون کا نام اڑا کر ''ایک مسلمان خاتون علیگڑھ'' درج کرنے کے متعلق میری درخواست کا کچھ خیال کیا یا نہیں؟ امید ہے ضرور کیا ہوگا۔......۶

زخ ش نے کچھ عرصے تک نہ لکھنے کا فیصلہ بھی کیا لیکن اس پر کاربند نہ رہ سکیں تاہم والد نے کبھی بھی انہیں لکھنے سے منع نہیں کیا۔ ایک بار سرزنش ضرور کی اور کہا کہ ''تم ایکسٹریمسٹ ہوجاتی ہو اس معاملے پر بات کروں گا'' ان کا اشارہ انگریزوں کے خلاف لکھی جانے والی تحریروں کی طرف تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو اپنی ذات سے وابستہ ذمہ داریوں اور مجبوریوں کا حوالہ بھی دیا اور جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو اس سلسلے میں کسی بھی غیر ذمہ دارانہ اظہار سے روکا۔

اس کشمکش میں انہوں نے ۱۹۱۴ء میں اپنی تحریروں کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا ایک مضمون میرا آخری مضمون کے نام سے شریف بی بی کے ۲۲ مئی ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی علمی پیاس اور تخلیقی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے ان مسائل کا بھی ذکر کیا جو برصغیر کے سماج میں لکھنے والی خواتین کو سہنے پڑتے ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنے باطن کی تشنگی کو بھی بڑی خوبصورتی سے اظہار کیا ہے جس نے انہیں علم کے چشمے

تک پہنچایا پھر اس سیراب وجود میں مزید شادابی کی راہ تخلیقی میں تلاش کی پر اب یہ راستہ انہیں خود بند کرنا تھا۔ وہ لکھتی ہیں۔

''اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اپنے پرآشوب ایام حیات کے متعدد مناظر یکے بعد دیگرے سرعتِ برق کے ساتھ گزر گئے۔ سب سے پیشتر مجھے خیال آیا کہ آج سے ٹھیک ۱۸سال قبل جب ایک معمولی وجود نے اس خارزارہستی میں قدم رکھا تھا تو اس کے ساتھ ہی ایک غیرمعمولی وجود نے بھی جنم لیا۔ یہ غیرمعمولی وجود ایک قسم کی تشنگی تھی۔ ایک عجیب وغریب قسم کی تشنگی جوعلی العلوم اس تمام عمر میں واحد ساعتِ آرام و بےفکری میں نہیں ہوا کرتی۔ اس کے بعد مجھے یاد آیا کہ اس شے نے جو اس وقت بالکل غیرمحسوس تھی اس قدر جلد لباسِ محسوسات زیب تن کرلیا اور پھر اس پیاس نے ابتدائی تعلیم کے جرعۂ آب کو اس قدر حیرت انگیز جلدی سے وسیلہ صحت بنالیا۔ پھر اس وقت کی پرلطف مسرت میرے ذہن میں تازہ ہوگئی کہ جب میرے بدنصیب وجود نے منازل حیات کی دوسری منزل یعنی لڑکپن میں قدم رکھا تو کیسی روحانی مسرت کے ساتھ اپنی محدود استعدادعلم کے موافق ادب اردو کے چھوٹے سے چشمے کو بحر ناپیدا کنارسمجھ کر اپنی علمی پیاس کو قدرے فرد کیا تو اب میں سمجھ رہی تھی کہ اس مرض کا نام علمی پیاس ہے۔

آگے وہ اپنے شعری سفر مراحل بتاتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''کیسے کیسے نقصانات عظیم اس سودے نے مجھے پہنچائے وہ دل جو تمام اصناف علوم کا شائق و طالب تھا اسی کا ہورہا اور وہ وقت جس کا ایک ایک منٹ ایک سیکنڈ خزائن السموات والارض سے زیادہ قیمتی ہے۔ ایک حدتک اسی کی نظر ہوگیا۔

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ حرف تمنا ہوا چاہتا ہے

دماغ میں جوکمبخت جو اور باتوں میں بہت جلدلڑ جاتا ہے لے دے کر اس کی ایک یہ وجہ تراشی کہ اس شکلِ لطیف سے منفعت عامہ کی امید ہے۔ لیکن وائے قسمت کہ یہ مقصود بھی پورا نہ ہوا۔ یہ آرزو بھی بر نہ آئی اور کیا خاک برآتی' شاعری نہ آئی صرف تک بندی آ گئی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں تین سال قبل کا وہ زمانہ بھی یاد آ گیا جب سہیلیوں کے مشورے سے اور اپنے اس خیال سے کہ یہ خاموشی اور سکوت میرے اس واحد آئیڈیل (پبلک کی نفع رسانی) کو بالکل مفقود کیے دیتی ہے۔ میں نے ہچکچاتے اور کانپتے ہوئے دل سے اب پبلک میں آنے کی جرأت کی اور آخر کار بسم اللہ کہہ کر اپنے برے بھلے خیالات پیش کر دیئے۔

اس کام کو روشن خیال لیڈیز نہایت معمولی اور ناقابل تذکرہ واقعہ سمجھیں گی۔لیکن اگر ایک گنبدِ بسم اللہ میں پرورش یافتہ کے نقطۂ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں۔ میری جرأت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گی۔ اگر عجائبات قدرت کے کسی محیرالعقول کرشمے کے دیکھنے سے استجاب لازمی عمل ہے تو اپنی ہیچدانی وہیچمبرزی کے کامل احساس کی وجہ ہے۔ یہ نظارا بھی قدرتی طور پر میرے لیے باعث تحیر تھا کہ اردو لٹریچر میں اعلیٰ ذخیرہ نظم و نثر کے باوجود میری لاشئے محض تحریرات کو مقبولیت کا سرٹیفکیٹ اور شہرت کا تمغہ ملا۔ کیا آپ باور کرسکتیں ہے کہ اگر میں کہوں کہ اس عام پسندیدگی نے جو پبلک اور پرائیویٹ طور پر مجھ سے ظاہر کی گئی اور جس کا باخدا مجھے سوسوکوس بھی وہم وگمان بھی نہ تھا مجھ خاکسار بدنصیب کو اپنے ہونٹوں پر گوند لگانے پر مجبور کردیا۔ یقیناً نہیں اور میرے خیال میں آپ مجبور بھی ہیں۔''اس طویل مضمون کے آخر میں وہ لکھتی ہیں۔''قلم کو استعمال کرنے کا خبط جو میرا سیکنڈ نیچر (طبیعت ثانیہ) بن گیا ہے۔ میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ کیونکہ اس کو تو مقدر میں مرتے دم تک میرا ساتھ دینا لکھا ہے۔لیکن یہ تو کم از کم ہمارے بس میں ہے کہ اس خط کو علی الاعلان نہ کرے۔ حسب سابق خود ہی کہیں خود ہی سنے ۔ آپ ہی صاد کریں اور آپ ہی اصلاح کریں۔ پھر آپ ہی کاپی میں لکھ کر جزودان میں باندھ دیں اور آخر میں آپ ہی سپرد خدا کہہ کر اسے الماری میں ہمیشہ کیلئے مقفل کردیں۔''......ے

اس مضمون کے ساتھ ایڈیٹر کی تحریر بھی موجود ہے جس میں ان کے اس فیصلے پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ''اگر کسی اور ملک میں اور قوم میں ایسی شاعرہ بی بی پیدا ہوجاتیں تو وہ لوگ اسے اپنی خوش نصیبی خیال کرتے اور ایک ایک لفظ کی قدر کرکے اس کے پاکیزہ کلام کو سرآنکھوں پر جگہ دیتے۔ زخ ش کے قابلانہ نظمیں اور مضامین اکثر رسالہ خاتون اور پردہ نشین میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں اور مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ ان کی خاموشی کی کمی کو محسوس کیا جائے گا بلکہ افسوس کی نظر سے بھی دیکھا جائے گا۔''

زاہدہ خاتون نے ان پابندیوں اور نادیدہ جکڑ بندیوں کو محسوس کیا ہے۔ان کے خیالات پر اخبارات اور مسلمان سیاستدانوں کے اثرات تھے۔ سب بہن بھائی گورنمنٹ کے خلاف نکتہ چینی میں پیش پیش رہتے تھے اور اپنے والد کی وفادارانہ پالیسی سے متفق نہیں تھے۔

زاہدہ خاتون نے والد سے تمام تر قربت کے باوجود اپنی تحریری مشاغل میں ایک پردہ داری کا رویہ پوری کوششوں سے برقرار رکھا دوسری طرف والد نے بھی اس موضوع پر لب کشائی نہیں کی اور ایک تجاہل عارفانہ سے کام لیا تاہم اگر انہیں والد کی طرف سے تحریری معاملات میں حوصلہ افزائی یا صرف آزادی کا عندیہ مل جاتا تو دیگر آسانیوں کے ساتھ ساتھ اندرونی کشمکش سے بھی نجات مل جاتی جو اس ذہین اور طبع رواں رکھنے والی ذات کو مسلسل مضطرب رکھتی تھی۔ انہیں

مسلسل خوف رہتا تھا کہ وہ والد کی مرضی کے خلاف لکھ رہی ہیں اور اس سلسلے میں اگر انہوں نے کسی وقت بھی ناگواری کا اظہار کر دیا تو وہ اپنا تحریری سفر جاری نہ رکھ سکیں گی۔ اس رازداری میں بطور شاعرہ اور ادیبہ اپنی کامیابیوں پر بھی خوش ہونے کے بجائے اندیشوں میں اضافہ کرلیتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب انہیں خواجہ حسن نظامی کی طرف سے ۱۹۱۷ء میں فضائل بانو کا لقب دیا گیا جو اس فہرست میں شامل تھا جن میں دیگر اہل علم و مشاہر کو خطابات سے نوازا گیا تھا تو انہیں اس پر خوش ہونے کے بجائے فکر لاحق ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کی بیگم لیلیٰ خواجہ بانو سے زخ ش کی مسلسل خط و کتابت تھی اور ان کے مضامین خواجہ صاحب کے رسالوں استانی' شریف بی بی وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ خواجہ صاحب اپنے مریدوں کے علاوہ لکھنے والوں کو بھی خطاب سے نوازتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں جو فہرست شائع ہوئی اس میں زخ ش کا نام بھی تھا اس فہرست کو دیکھ کر وہ انیسہ خاتون کو لکھتی ہیں۔

''تم نے سنا ہمارے مہربان خواجہ صاحب نے کیا ستم کیا ہے مجھے فضائل بانو کا لقب دے کر فہرست خطابات میں شائع کیا ہے پھر طرہ یہ کہ اسی جگہ حضور والد ماجد کا نام علم الدولہ کے خطاب کے ساتھ درج ہے۔ یہ فہرست معہ خط کے مجھے بھی بھیجی ہے اور ممدوح کو بھی۔ لیکن آنجناب نے کسی طرز عمل سے مطلق اشارتاً و کنایتاً کسی قسم کا اظہار ناپسندیدگی نہیں ہوا۔ واقعی ممتاز ترین اکابر قوم مسز بیسنٹ اور مسز نائیڈو کے ساتھ اپنا نام دیکھ کر مجھے بڑی شرم آئی۔۔۔۔۔ غنیمت ہے انہوں نے صرف دختر نواب صاحب لکھا ہے۔لفظ خرد نہیں لکھا میں نہایت خوش ہوں کہ اس شہرت غیر مرغوب میں آپا جان بھی شریک ہیں۔'' ۸

جب لیلیٰ خواجہ بانو اور خواجہ حسن نظامی کا ان کے گھر آنے کا پروگرام بنا تو انہوں نے خوشی کے اظہار کے ساتھ ایک خط میں لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھا۔

'' فضلِ باری سے ملاقات کی ساعت منتظر قریب ہے۔ اب جو کہنا ہے زبانی کہیں گے۔ یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است۔ ہاں ایک چھوٹی سی بات اور لکھے دیتی ہوں۔ ابویا سے اگر خواجہ صاحب میرے مضامین وغیرہ کی بابت نہ فرمائیں تو بہتر ہے۔ اس کے متعلق آپ سے صراحت زبانی بیان کروں گی۔......۹

زخ ش کی تمام تر ادبی و سماجی زندگی گھر کے دائرے میں محدود تھی جو بھیکم پور کی آبائی حویلی پھرنئ قیام گاہ ظفر منزل اور بوڑھ گاؤں میں نانا حاجی کریم اللہ کی حویلی کی حدوں تک رہی۔ گھر کی چہار دیواری میں بند اس باشعور لڑکی کی زندگی شدید احساسِ تنہائی کا شکار تھی۔ وہ علمی و ادبی مشاغل سے اس تنہائی کا مداوا کررہی تھیں۔ انیسہ خاتون کو بار بار خط لکھنا اور جواب نہ آنے پر ناراضگی کا اظہار کرنا۔ رابعہ خاتون اور لیلیٰ خواجہ بانو سے طویل مراسلت ان کی تنہائی

کا مداوا نہیں ہوسکتی تھی۔تاہم ذہنی تشنگی کو سیراب کرنے کی کوشش تھی۔ اپنی اس تنہائی کی شکایت انیسہ خاتون کو لکھے ہوئے ایک خط میں یوں کرتی ہیں۔

''ابویا اور ہردو برادران با مقام کڑوا مصروف شکار ہیں اور ہم دو بہنیں اس صید مظلوم کی طرح ہیں جو ۔دردام ماندہا باشد۔صیاد رفتہ باشد۔ تنہا پڑے گھبرا رہے ہیں۔ سب اعزاء ماشاءاللہ اپنے رفقاء کے ساتھ لطف زیست اٹھا رہے ہیں اور ہم تنہائی کے لئے پیدا کیے گئے ہیں۔ کسی کو کیا غرض پڑی ہے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہماری تنہائی رفا کرنے کے لیے آ پڑے۔شکر ہے کہ ہم دو بہنیں ہیں اگر خدانخواستہ ایک ہوتی تو کب تک مر کر قبرستان پہنچ گئی ہوتی۔''......۱۰

ان کے مشاغل میں حصہ دار بڑی بہن احمدی خاتون نکہت' بھائی احمد اللہ خان حیران' پھوپھی زاد بہن اور سہیلی انیسہ خاتون' پھوپھی زاد بھائی انس خان عبد تھے۔ اپنے بھائی احمد اللہ خان سے وہ خصوصی قربت رکھتی تھیں کیونکہ وہ ان کے مشاغل میں ہم خیال اور باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ تھے۔ چونکہ تعلیم و تربیت ساتھ ساتھ ہوئی تھی اس لیے آپس میں محبت اور خیالات میں ہم آہنگی تھی۔ احمد اللہ خان تعلیم میں نمایاں اور اس زمانے کے فنون میں ماہر تھے۔ شاعری پر بھی قدرت حاصل تھی۔ حیران تخلص کرتے تھے' سماجی اور ادبی سرگرمیوں میں بہنوں کے مشیر و معاون تھے۔ والد کے حکم پر بہنوں کو انگریزی بھی پڑھایا کرتے تھے۔زاہدہ خاتون کو اپنے بھائی سے ایسی قربت تھی کہ وہ انہیں اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتی تھیں۔ اس قربت میں ذہنی رویے کا بھی بڑا دخل تھا وہ واحد شخصیت تھے جن سے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر کھل کر گفتگو ہوسکتی تھی اور ان کے خیالات وفکر سے متاثر بھی تھیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں متعدد بار بھائی کا تذکرہ کیا ہے، ہر جگہ محبت کے جذبات نمایاں ہیں۔ اسی طرح خطوط میں بھی جابجا ان کا ذکر ایک ساتھی کی حیثیت سے ملتا ہے۔ زاہدہ خاتون زندگی کے عظیم ترین صدمے سے اس وقت دوچار ہوئیں جب احمد اللہ خان حیران شروانی ۱۹ اپریل ۱۹۱۶ء کو ایک ہفتہ ٹائیفائیڈ میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کے اچانک انتقال نے جہاں پورے گھر کی فضاء سوگوار کردی وہاں زاہدہ خاتون کی ذات کو دکھوں کی آماجگاہ بنادیا۔ وہ جو ایک پرجوش' خوش کلام اور حوصلہ مند شاعرہ تھیں جن کے دکھ ذاتی نہیں بلکہ قومی اور بین الاقوامی حادثات سے متعلق تھے۔ جنہیں قوم کی زبوں حالی پر افسوس ہوتا تھا اور خصوصا خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر کڑھتی تھیں اب ایسے ذاتی دکھ میں مبتلا ہوئیں جس کا مداوا ممکن نہیں تھا۔ وہ لکھتی ہیں۔

''ہماری عمروں کا بڑا حصہ تنہائی میں ہی گزرا ہے مگر دراصل میں صرف اس مرتبہ اپنے تئیں تنہا ہوں۔ اف وہ بھولی صورت روز بروز آنکھوں کے سامنے زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ اب تو دفور غم سے بعض وقت چلا اٹھتی ہوں کہ اے پیاری صورت دل سے نکل جا۔خدا اپنے اور اپنے حبیب پاک کے سوا دنیا میں کسی کی محبت مجھے اب نہ دے۔

جو میں ایسا جانتی کہ پیت کرے دکھ ہوئے
جگت ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نہ کوئے''

۱۱......

اس سانحہ کا اثر ان کی شاعری اور نثری تحریروں پر بھی پڑا۔ ان کی زندگی میں قنوطیت داخل ہوگئی۔ اپنے خطوں میں نام سے پہلے ناکام محبت' خوں کردہ حسرت' برادر گم کردہ' حقیقی معنوں میں بے دل وغیرہ لکھنے لگیں۔ کچھ عرصہ بھائی کے غم میں گذارنے کے بعد انہیں خیال آیا کہ ان کے کلام کا جائزہ لے کر مرتب کیا جائے۔ یہ کام مشکل تھا کیونکہ احمد اللہ خان کو زندگی نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ اپنی شاعری کو مرتب کرتے۔ دوسرے شروانی خاندان کا دستور تھا کہ مرحومین کا سامان کمرے میں مقفل کردیا جاتا تھا۔ وہ اس رواج کے خلاف اپنے روزنامچے میں لکھتی ہیں۔

''ہمارے یہاں کیسی بری رسم ہے کہ مردہ کا منحوس اسباب حقیقی مصرف یعنی خیرات کے بجائے اینٹ پتھر کی دیواروں میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ اگر خدا نے موقع دیا تو اپنے کثیر المقدار سامان کو (جس سے الحمد للہ بیزار رہتی ہوں) اپنے ہاتھ سے یا وصیت کے ذریعے ٹھکانے لگادوں گی۔''......۱۲

مندرجہ بالا تحریر تو بعد کی ہے لیکن انہوں نے بھائی کے جتنے کاغذات ممکن تھے کسی طرح حاصل کر لیے ویسے بھی شعری مشاغل میں وہ بھائی کی مشیر تھیں اور پہلے بھی ان کے کلام کی نوک پلک درست کرتی رہتی تھیں۔ اب ان کی خواہش یہ ہوتی کہ مرحوم کا کلام یکجا کرکے شائع کیا جائے۔ والد سے وہ تحریر و اشاعت پر گفتگو نہیں کرسکتی تھیں۔ انس خان ابدشروانی جو احمد اللہ خان حیران کے بچپن کے ساتھی تھے۔ ان سے اس سلسلے میں مشاورت اور مدد حاصل کی۔ ایک مسدس جو اس زمانے کے مطابق قومی نوعیت کا تھا منتخب کرکے آبد کے ذریعے اکبر الہٰ آبادی تک پہنچادیا تاکہ ان سے اصلاح اور مشورے حاصل کیے جاسکیں۔ اکبر الہٰ آبادی نے نہ صرف اصلاح دی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس مسدس کی اشاعت کے لیے دونوں بہنوں اور ابد شروانی میں مشورے جاری تھے کہ قدرت کی طرف سے ایک اور سانحہ پیش آیا جو اس حساس شاعرہ کے مستقبل کی تمام امیدوں اور امنگوں کو پامال کر گیا۔ ان کے بچپن کے ساتھی پھوپھی زاد بھائی اور تمام مشاغل میں ان کے شریک انس خان ابد نومبر ۱۹۱۸ء میں بخار میں مبتلا ہوکر انتقال کر گئے۔ انیسہ خاتون جن کے وہ سگے بھائی تھے لکھتی ہیں۔

''مرحوم کی رحلت کا سب سے زیادہ حسرت ناک پہلو یہ تھا کہ زاہدہ خاتون کیلئے جس ہستی سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کا جانبین کے بزرگ تہیہ کرچکے تھے (مگر بعض وجوہ سے عمل درآمد کی ہنوز نوبت نہ آئی تھی) اس کا خاتمہ ہوگیا اور اب خاندان شروانی میں کم از کم اس خاتون کے پائے کا کوئی جوڑ موجود نہ تھا۔ خاندان شروانی کے قدیم الخیال

بزرگوار ابھی تک خود اپنے ہی خاندان میں رشتے داریاں کر رہے تھے اور غیر لوگوں سے رشتہ قائم کرنے پر پوری طرح سے آمادہ نہ ہوئے تھے۔''......۱۳

زخ ش جو پہلے ہی پیارے بھائی کی اچانک موت کے صدمے سے دوچار تھیں اور جن کی اپنی صحت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ان سے اس خبر کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی تاہم یہ ایسا حادثہ نہیں تھا جسے چھپایا جا سکتا۔ ان کو آخر کار اس کی اطلاع مل گئی۔ جتنا صدمہ ان کو پہنچا ہے اور جو حالت اس وقت ہوئی اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو ۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ء کو انہوں نے انیسہ خاتون کو لکھا ہے۔ اس خط میں پہلی مرتبہ جذبات کے بہاؤ میں آ کر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر گئی ہیں ورنہ دیگر خطوط نپے تلے انداز میں خاندانی 'سماجی اور سیاسی موضوعات پر ہوتے تھے۔ان میں سے اکثر ان کی معاون لڑکی بانو کی تحریر میں ہوتے تھے یہ لڑکی گیتی بانو عرف بانو ان کی کھلائی کی لڑکی تھی جس کو پڑھا لکھا کر انہوں نے اپنے علمی مشاغل میں معاون بنایا تھا چونکہ وہ تمام عمر آنکھوں کی بیماری میں مبتلا رہیں یہ لڑکی ان کے مسودے اور خطوط نقل کرتی تھی۔ وہ خط جو انہوں نے اس جانکاہ خبر کو سن کر لکھا ہے خود ان کی تحریر میں طویل اور رواں ہے۔ اس میں جذبات کی روانی ہے ایک شدید کیفیت ہے اور اس دکھ کا بے ساختہ اظہار ہے جو ان کی آنے والی زندگی پر سایا کیے رہا جس خط سے اس شاعرہ کی زندگی کے آلام کا پتہ چلتا ہے اس لیے یہ خط تمام وکمال پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''میری جان سے پیاری انیسہ خاتون!

السلام علیکم!

صبح سے شام اور شام سے صبح اس سوچ بچار میں ہو جاتی ہے کہ اب خط لکھوں، اب لکھوں مگر ساعت تحریر آ ہی نہیں چکتی۔

آخر آج اپنی مجروح اور آب ریز آنکھوں سے زبردستی کام لے کر کچھ لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

لکھوں کیا خاک۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا ہائے انیسہ خاتون میری پیاری! کیا لکھوں اور کس دل سے لکھوں سر چکرا رہا ہے' ہاتھ کانپ رہے ہیں' دل بے قابو ہے' اف مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ حصول صحت پر پہلا دستی خط ''ماتمی'' ہوگا۔ ہائے ماتمی اور ماتم بھی کیسا ماتم اور کس کا ماتم ؟۔۔۔۔دیکھو بہن یاد کرو تین سال پہلے سخت علالت سے جانبر ہونے کے بعد میں نے کیسا عظیم انسانی صدمہ اٹھایا تھا۔ خدا کی شان دیکھو اس دفعہ بھی وہی نتیجہ ظہور پذیر ہوا ہے۔

اٹھے تھے بستر سے اس دن کے لئے۔

شفایابی کے بعد تمہاری اس غیر متوقع خاموشی سے میں سراپا تحیر تھی کہ الٰہی یہ کیسی سرد مہری ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ خواہ دلِ بے قرار کا کچھ ہی حال کیوں نہ ہو مگر میں اقدام کتابت کا قصد نہ کروں گی۔ آہ میں کیا جانتی تھی کہ میری غریب بہن کس مصیبت میں پھنسی ہے۔ اور مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میرے پیارے اقرباء کے دلوں پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ ہاں میری روح البتہ ایک اضطراب محسوس کر رہی تھی میرا دل البتہ بے چین ہو رہا تھا ذرا سی بات میں آنسو البتہ بہنے لگتے تھے۔ مگر میں اسے از راہِ حماقت اور خارجی اخبار کی ناگواری کا نتیجہ سمجھا کی۔ میں نے کنایتاً وصراحتاً لوگوں سے اس کی مزاج پرسی کی جس کی دنیاوی تکالیف وعلل کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مگر ظالموں نے اس صفائی اور بے غمی سے شفائے کلی کا مژدہ دیا کہ مجھے شک وشبہہ کا کوئی موقع نہ مل سکا۔

۱۱ نومبر کی شام کو لیلیٰ کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ دتاولی کی نسبت سے ایک بہت بری خبر فلاں شخص نے آکر بیان کی۔ مگر آپ کے خط سے فرداً فرداً سب کی خیریت معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ میرے کان کھڑے ہوئے اور نام لے کر سب کی خیر وعافیت پوچھنے لگی۔ خالہ جی نے افسردگی کے ساتھ سب کی خیریت بیان کی۔ پر میں نے لرزتے ہوئے دل اور ٹوٹے ہوئے لفظوں میں آپا جان سے باقی ماندہ کا حال دریافت کیا۔ ان کی آنکھیں پرنم ہوگئیں مگر جواب وہی تھا جو خالہ جی نے دیا۔

اب میں نے بانو سے تخلیے میں قسم دے کر استفسارِ حال کیا تو اس نے گنتی کے دو لفظ کہہ دیے۔

اُف! کس جادو میں بھرے ہوئے دو لفظ تھے جنہوں نے میری حالت میں دیکھتے ہی دیکھتے زمین وآسمان کا فرق کر دیا اور مجھے عالم ہوش وحواس سے نکال کر۔ صحرائے خود فراموشی میں پہنچا دیا۔ اب اس واقعے کو تین دن گزر چکے ہیں اور آج ۱۴ نومبر ہے ان تین دنوں سے پہلے میں بالکل تندرست تھی اور خوب چلتی پھرتی تھی مگر آج پوری بیمار ہوں۔ سر کے درد کا۔ چکر آنے کا بے خوابی کا' تبخیر وسوء ہضم کا علاج کیا جا رہا ہے۔ دہلی سے حکیم بھی آنے والے ہیں۔ مگر اس سعی لاحاصل کے خیال سے ایک تلخ تبسم میرے لبوں پر نمودار ہو جاتا ہے اور بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے۔

ع۔ از سر بالینِ من برخیز اے نادان طبیب۔

انیسہ خاتون تم اس سے واقف ہو اور اب جب کہ تمام معاملات خاک درخاک ہوگئے ہیں تو مجھے خود بھی کہہ دینے میں باک نہیں کہ میں اپنے اس مرحوم بھائی سے قلبی محبت رکھتی تھی اور کیوں نہ رکھتی وہ میری پھوپھی کا فرزند تھا۔ علاوہ ازیں اوائل عمر سے میں نے اس کی کتابِ زیست کا مطالعہ ایک خاص اور گہری نظر سے کیا تھا۔ ہاں میں صاف ہی

کیوں نہ کہہ دوں میں نے چشم تصور سے زمانہ استقبال میں اس کی زندگی سے اپنی زندگی کو وابستہ دیکھا تھا۔ ان سب پر طرہ یہ کہ خود اس کی طرف سے میری بابت جس متجاوزالحد مہر و وفا کا اظہار ہوا۔ وہ میرے متاثر کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ تھا۔ ان تمام امور پر غور کیا جائے تو میری محبت ایک نیچرل بات ثابت ہوگی۔

مگر آہ آج میں اس محبت کا یہ کیا انجام دیکھ رہی ہوں! یہ کیسی خبر ہے جو میرے کانوں کو سنائی گئی ہے کیا سالہا سال تک شبانہ روز دیکھے جانے والے خواب کی تعبیر آناً فاناً میں برعکس ثابت ہوگئی۔؟

اب میں مجبوراً تسلیم کیے لیتی ہوں کہ سب کچھ ایک دھوکا تھا۔ جس طبیعت کی بابت مستحکم الوفا ہونے کا مجھے یقین دلایا جاتا تھا۔ ناپائیدار سے زیادہ ناپائیدار تھی۔ اگر یہ بات ہوتی تو اس دیرینہ تمنا سے خود بہ خود دست کش ہوجانا آسان امر نہ تھا جسکے بر آنے کی صورت میں دوامی ترک وطن کا اعلان کیا جاتا تھا۔ آہ ایک بے وفا۔ پیمان شکن کی یاد ابھی دل سے کم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک اور بھائی نے تازہ داغ دیا۔

میں یہ نہیں کہتی کہ اس عزیز بھائی کا صدمہ احمد کے داغ مفارقت سے زیادہ گراں ہے۔ نہیں ۔اس سے کم ہے کیونکہ احمد سے مجھے عشق تھا اور ابد سے گہری محبت ۔ مگر پھر بھی یہ آخری زخم میرے دل صدپارہ کیلئے نہایت کاری ہے۔

علاوہ صدمہ عظیم کے تازہ حادثہ نے میرے دل میں ندامت وانفعال بھی کچھ کم پیدا نہیں کیا۔ آہ میرا نفس مجھے ملامت کے تیروں سے زخمی کرڈالتا ہے جب خیال آتا ہے کہ میں نے اس مہمان چند روز کے ساتھ کیا مغائرانہ برتاؤ رواں رکھا۔ خدا غارت کرے اس خوف بدنامی کو اور آگ لگے اس ہندوستانی شرم و حیا میں جس نے مجھ مبتلائے خواب خرگوش کو برادرانہ سلام کا جواب دینے کی بھی اجازت نہ دی۔

آہ میں اس روح مطہر سے شرمندہ ہوں اور حد سے زیادہ شرمندہ آہ کاش زمانہ ماضی کا ایک گھنٹہ صرف ایک گھنٹہ مجھے واپس۔۔۔۔۔۔

آہ خدا جانے عالم بیخودی میں میرے قلم سے کیا نکل رہا ہے۔ مجھے اس وقت صرف یہ معلوم ہے کہ ہاتھ میں قلم اور دل میں یہ خیال کہ دوامی سکوت اختیار کرلینے سے قبل اپنی عزیز جان بہن کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں غم کا اظہار حتی الوسع کم ہو اور جذبات کا بیان زیادہ۔ خیر یہ تو ہولیا۔ مگر اس اندوہ کا ابھی تک کچھ ذکر نہ ہوسکا جو تمہاری حالت کے تصور سے میرے دل میں ہر وقت چٹکیاں لیتا ہے۔

ہائے پیاری۔ یہ تکلیف دہ خیال بھی کچھ کم عافیت سوز نہیں کہ خدا جانے میری کمزور دل و دماغ۔ تمہارا دل

مجھ سے زیادہ راجع ہے۔ضرور تم نے ممکن حد تک صبر و رضا سے کام لیا ہوگا۔

آہ میں بھی کس قدر حسرت نصیب ہوں افسوس میں اپنی پیاری بہن اپنی وفادار دوست کی اس وقت بد میں شریک حال نہ ہوسکی اور اپنی ناچیز کوششیں اس کے بارغم کو ہلکا کرنے میں صرف نہ کرسکی۔ اب اگر گئی بھی تو کیا حاصل! جو وقت سب سے زیادہ نازک اور کٹھن تھا وہ تو گزر ہی گیا۔

بیشک یہ سچ ہے کہ قضائے الہٰی کے سامنے دوستوں کی دوستی اور غمخواروں کی غمخواری نہیں چل سکتی۔ اور یہ غم ایسے نہیں جو بانٹنے سے بٹ سکے مگر پھر بھی اہل محبت کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔

اس غم نامے کا جواب میں طلب نہیں کرتی مگر یہ عرض ضرور ہے کہ دو حرف اپنے قلم سے لکھ کر رسید بھیج دو۔تمہارے دستی حروف دیکھ کر میرے مضطرب بیقرار دل کو ایک قسم کا چین آجائے گا۔

آہ پیاری تم کیا جان سکتی ہو کہ تمہاری حالت کے تصور نے مجھے کیسا بے چین کر رکھا ہے۔ اپنی مریض دل عمہ محترمہ کیلئے بھی میں کچھ کم بے قرار نہیں مگر کیا کیا جائے۔شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔

اس خط کو ذرا غور سے پڑھنا کیونکہ بہت ہی خستہ خراب حالت میں لکھا ہے اور خدا گواہ ہے کہ کبھی مدت العمر اس مصیبت سے کوئی تحریر نہیں لکھی گئی اور اب فرط نقاہت سے ایک بخار سا چڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس لیے بصد حسرت و افسوس خدا حافظ کہتی ہوں۔تم سے ملنے کیلئے بیتاب۔''

زاہدہ.....۱۴

اس سانحے سے قبل ہی ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی جس کا ذکر ان کے خطوط میں ملتا ہے۔لیکن دو قریب ترین ہستیوں کی اموات نے انہیں شدید جسمانی اور ذہنی اذیت میں مبتلا کردیا تھا۔ اب وہ جس کرب سے گزر رہی تھیں اس میں تنہائی کی شدت بے تحاشہ بڑھ گئی تھی۔ ایک طرف عزیز ترین ہستی کو کھونے کا دکھ تھا دوسری طرف ابد شروانی سے جو تعلق خاطر تھا اس کا ان کی زندگی میں اظہار نہ کرنا ان کی نادقت موت کے بعد پشیمانی میں تبدیل ہوگیا۔ اس دور کے رسم و رواج کے مطابق انہوں نے نسبت طے ہونے کی وجہ سے عمومی خط و کتابت کا ربط بھی نہ رکھا تھا۔ کچھ رسم و رواج کا بندھن تھا تو کچھ شرم و حیا مانع تھی۔ زخ ش جیسی شخصیت جنہیں اظہار پر مکمل قدرت حاصل تھی اگر اپنے جذبات قلم بند کرتیں تو دفتر کے دفتر سیاہ کردیتیں۔ ابد کے خطوط کے جواب اس لیے نہیں دے سکتیں تھیں کہ وہ ان سے منسوب تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان میں اپنے اس رویے پر پشیمانی اور پچھتاوے کا احساس پیدا ہوا جس کا اظہار انہوں نے انیسہ خانم کے

علاوہ اپنی سہیلی خواجہ حسن نظامی کی بیگم لیلیٰ بانو کو لکھے ہوئے خط میں بھی کیا۔ لیلیٰ بانو سے ان کی مستقل خط و کتابت تھی۔ ان کو لکھے جانے والے خطوط پر ڈاکٹر شان الحق حقی نے ایک مضمون ''زخ ش کی شخصیت ،خطوط کے آئینے میں'' لکھا ہے۔اس مضمون میں جو خط لیلیٰ بانو کے نام لکھا گیا ہے۔ اس میں وہ لکھتی ہیں۔

''ابھی ابھی میں اسی مرحوم بھائی ابد شروانی کے وہ مہذبانہ اور شریفانہ مکاتب اکھٹے کر کے یادگار نادرو نایاب کے طور پر صندوقچے میں رکھ رہی تھی جو متفرق اوقات میں بہ امید جواب مجھے لکھے گئے تھے............ افسوس لیلیٰ اس وقت خیال مصلحت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی اور میں نے ایک ایسے وجود کی جو پہلے ہی جوش وخروش کی انتہائی حد کو پہنچا ہوا تھا اپنی طرف سے کسی قسم کی حوصلہ افزائی مناسب خیال نہ کی۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا میں کیا جان سکتی تھی ۔ شباب اور قوت کے مجسمے اس قدر جلد اور یوں آناً فاناً نابود ہوسکتے ہیں........... پیاری لیلیٰ میں باقتضائے دوستی تمہیں ایک نصیحت کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ کبھی کسی انسان فانی کا دل یہ سمجھ کر چھوٹا نہ کرنا کہ بہت جلد تلافی مافات کردی جائے گی۔ یہ بڑی غلطی افسوس صد افسوس کہ بہت بڑی غلطی ہے جو لوگ اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ چشم زدن میں دگرگوں ہوجانے والی دنیا کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور آخر الاول ان کا چہرہ اشک ندامت سے گل رنگ اور تربتر ہوجاتا ہے۔''......۱۵

اس خط میں انہوں نے واضح طور پر لکھا کہ بھائی کی موت کے بعد اگر انہیں سہارا تھا تو ابد کی اپنی زندگی میں موجودگی کا۔ وہ لکھتی ہیں

''اگرچہ میری زندگی بے لطف ہوگئی اور ولولہ ہائے شوق کا زمانہ ختم ہوا مگر پھر بھی میں نے کبھی اپنے مذاق وخیال سے تمام اجزاء کو بری و بیگانہ نہیں سمجھا کیونکہ ابھی میرے ذرات سخن کو آفتاب خیال کرنے والا وجود میرے پیش نظر تھا۔''......۱۶

بھائی اور منگیتر کے صدمات نے اگرچہ ان کی جسمانی صحت پر برا اثر ڈالا تھا مگر لکھنے پڑھنے سے بے نیاز نہیں ہوئیں تھیں۔ خصوصاً زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے باقاعدگی سے روزنامچہ لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بیماری اور تکالیف کے باوجود تحریر و اشاعت کی سرگرمیوں کو ترک نہیں کیا تھا۔ ان کے روزنامچے اور لیلیٰ خواجہ بانو کے نام خطوط میں زندگی کے آخری ایام پوری طرح تحریر ہیں۔ ان ایام میں ان کی اپنی بیماری اور قریبی عزیزوں اور دکھوں پریشانیوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا لیکن جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ ان حالات میں بھی وہ تحریر و اشاعت سے بے نیاز نہیں ہیں۔ شاعری ان کی زندگی کا لازمی جزو تھی اگر انہیں اپنی تخلیقات کے لیے سازگار ماحول ملتا۔ اشاعت و اظہار کی آزادی ہوتی تو شاید زندگی کا دورانیہ بھی طویل ہوجاتا۔ تاہم کم عرصے میں انہوں نے بہت کچھ لکھا اور ایک معیار بھی قائم رکھا۔ ۱۹۲۰ء میں

انہیں رسالہ تہذیب نسواں کی جانب سے مضمون نگاری کا سالانہ انعام ۱۵روپے دینے کا اعلان کیا گیا وہ انہوں نے اسی رسالے کو عطیہ کردیا۔ اسی طرح انہوں نے رسالے کی مالی مشکلات کا تذکرہ پڑھا تو اپنی مشہور مسدس آئینہ حرم اور چند منتخب نظمیں کتابی شکل میں شائع کرنے کے حقوق ایڈیٹر تہذیب نسواں سید ممتاز علی کو دیدیئے۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوئی۔ ز خ ش نے اپنی جانب سے ۱۲۵روپے جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑی رقم تھی ادا کرکے اس کی کاپیاں غریب مگر پڑھنے کی شوقین خواتین کو بھیجنے کی تاکید کی۔ انہوں نے اسی دور میں اپنا مجموعہ کلام ''فردوس تخیل'' اور غزلوں کا دیوان ''نزہت الخیال'' ترتیب دیا۔ آخری ایام میں انہوں نے فرانسیسی مصنف پیرلوتی(Pier Loti) کے ناول ڈیزان شانتے (Desenchantees) کے فارسی ترجمے ''پری رویان ناکام'' کا اردو ترجمہ بھی شروع کیا جس میں انہوں نے انیسہ خاتون کے شوہر اور اپنے عزیز پرویز ہارون خان شروانی سے جو فرانسیسی زبان جانتے تھے تبادلہ خیال کیا اور بذریعہ خط کچھ الفاظ کے صحیح معنی دریافت کیے۔ ان کے روزنامچے میں اس ناول پر تبصرہ بھی موجود ہے اور وہ خط بھی جو انہوں نے پروفیسر ہارون خان شروانی کو اس سلسلے میں لکھا ہے، دستیاب ہے۔

مختلف ذرائع سے آپ کی فرانسیسی دانی کا شہرہ میرے کانوں تک پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ آج کل مجھے اس زبانِ شیریں کے بعض لغات کا اردو ترجمہ درکار ہے اس لیے آپ سے استفسار و استمتاع کی جرأت کرتی ہوں۔ کیا آپ میری اس بے تکلفانہ تکلیف دہی کو معاف فرما کر اپنے علم کی وسیع خرمن سے خوشہ چینی کا موقع مرحمت کریں گے۔ اس ضرورت خاص جس نے مجھے مخلصانہ درخواست پر آمادہ کیا ہے، یہ ہے کہ میں پی یرلوتی Pierre Loti کی بہترین تصنیف ڈیزان شانتے (Desenchantees) کو زبان اردو میں منتقل کرنا چاہتی ہوں۔ چونکہ میں فرنچ سے اتنی ہی واقف ہوں جتنی پیرلوتی اردو سے۔ اس لیے کتاب مذکور کے ایک نفیس فارسی ترجمہ مطبوعہ قسطنطنیہ کو پیش نظر رکھ کر کاربراری کا ارادہ کیا ہے۔۔۔۔جس وقت آپ سے حل لغات میں مدد مل جائے گی اس وقت بشرط عافیت ترجمہ شروع ہو جائے گا''......۱۷

آخری ایام میں جہاں وہ اپنی بیماری کا ذکر کرتی ہیں وہاں ان کی تین عزیز ہستیوں کا بھی بار بار ذکر آتا ہے جو نا قابل علاج بیماریوں میں مبتلا تھے اور جن کی وجہ سے وہ مسلسل فکرمند رہتی ہیں۔ ان میں ایک ان کے تایا محمد احمد سعید خان رئیس ناہ تھے جو بھائی کے ساتھ ہی مقیم تھے۔ ز خ ش کے والد کو اپنے بڑے بھائی سے جنھیں خاندان کے بزرگ ہونے کی حیثیت حاصل تھی بہت محبت تھی ان کی زندگی بھی اپنے بھائی اور ان کے بچوں سے وابستہ تھی۔ ز خ ش انہیں اباجی کہتی تھیں۔ یہ تایا سرطان کے مرض میں مبتلا تھے۔ دوسری شخصیت جو بستر مرگ پر تھیں وہ ان کی شفیق خالہ جن سے انہیں ماں کی محبت ملی تھی۔ نانا نانی کی وفات کے بعد ننھیال میں خالہ کا واحد وجود تھا اور وہ اپنے بھانجیوں اور بہنوئی سے بہت

قربت رکھتی تھیں۔ یہ خالہ بیماری کے ساتھ شوہر کے تکلیف دہ رویے سے بھی پریشان تھی۔ زرخ ش نے اپنے روزنامچے میں بار بار ان کی حالتِ زار کا ذکر کیا ہے۔ تیسری عزیز شخصیت گیتی بانو تھی یہ ان کی کھلائی کی لڑکی تھی جس کو تعلیم و تربیت دے کر انہوں نے اتنا قابل کر دیا تھا کہ وہ ان کی کتابوں کی دیکھ بھال اور ان کے مضامین کی نقل کرتی تھی۔ بانو ایک طرح سے ان کی دستِ راست تھی۔ یہ لڑکی ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوگئی جو اس زمانے میں ناقابلِ علاج تھا۔ بانو کی بیماری اور تیمارداری کا ذکر بھی ان کے روزنامچے میں موجود ہے۔

۱۲۸ کتوبر ۱۹۲۱ء کو اپنے روزنامچے میں لکھتی ہیں ''ابا جی کی فکر اور بیحد فکر۔ خالہ جی سے ملاقات اور ان کی افسوسناک حالت کا ملال۔'' ۲۹ اکتوبر کو علی الصبح ان کے تایا کا انتقال ہوگیا۔اس وقت بھی وہ شدید بیمار تھیں لیکن اس حالت میں جو صدمہ گزرا ہے اس کا ذکر دیکھئے۔

''اس مصیبت عظمیٰ کا میرے زخمی دل پر جو اثر ہوا وہ ظاہر ہے۔ میں ضرور سیل اشک کو چشم میں محفوظ رکھتی اگر دفعتاً گھر چیخنے اور درد ناک بین کرنے والے عزاداروں سے بھر نہ جاتا۔ شرع اسلام کے یہ ناموس ریا خود گناہگار ہوتے ہیں اور دوسروں کے صبر کو بھی متزلزل کرتے ہیں۔ وقت جس طرح کٹا اس کی یاد جان گسل ہے۔ حادثہ مذکور کو چار پانچ گھنٹے گذر چکے ہیں مگر ابھی تک دل قابو میں نہیں آیا۔

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمر دراز
سینہ ایک گنجینہ داغ عزیزاں ہوگیا

تایا کا جب انتقال ہوا ایک اور عزیز ترین ہستی خالہ بھی بستر مرگ پر تھیں اور اپنے گھر پر جہاں وہ بیماری کے باوجود عیادت کے لئے جاتی تھیں۔۹ نومبر ۱۹۲۱ء (۸ ربیع الاول) کو رات آٹھ بجے اس شفیق خالہ کا انتقال بھی ہوگیا جن کی وہ مسلسل خبر گیری اپنی بیماری کے باوجود کرتیں رہیں اس خالہ کی وفات کے دن جو روزنامچہ انہوں نے لکھا ہے اس میں ان کی اپنی بیماری اور خالہ کی اذیت دونوں کا ذکر ہے۔

''تمام رات بلاشبہ تمام رات بیٹھی رہی مگر عمہ محترمہ (پھوپھی والدہ انیسہ خاتون) کے چونکنے کے ڈر سے آواز نہ نکالی چار بجے صبح مجبوراً ڈاکٹر بسرجی کو (جو میرے علاج کیلئے آئے ہوئے ہیں) بلایا مگر ان کی گہری توجہ اور جلد جلد دوا تبدیل کرنے سے کچھ افاقہ نہ ہوا۔اس زحمت میں بھی مجھے اس عزیز از جان خاتون ہی کا خیال تھا اور ہر آنسو اسی کے غم کا سیال مجسمہ تھا۔ اس قلم فرسائی کے بعد معلوم ہوا کہ ۸۔۷ ربیع الاول کی درمیانی رات کو آٹھ بجے کے وقت میری نہایت ہی پیاری خالہ حاجیہ قدسیہ بیگم نے اس دکھ بھری دنیا سے کوچ کیا۔اس خاتون کے مصائب اور صبر دونوں لاثانی ہیں اور ان

اطراف کا بچہ بچہ اس خونیں سرگزشت سے واقف ہے۔ مرحومہ کی مصیبتوں کا پہلا دن ان کی شادی کا دن تھا۔ گویا میکے سے رخصت ہونا خوشیوں سے رخصت ہونا تھا۔ رفیق زندگی نے (جن کی عیاشیاں کنوار پن میں شہرآفاق ہوچکی تھیں) پہلی ملاقات میں ہی کم التفاقی کا ثبوت دیا۔ کچھ دن تک برائے نام توجہ رہی بیاہ کے دوسال بعد ایک لڑکا ہوا جو جاتا رہا۔ اس کے بعد میاں بیوی میں قطعی علیحدگی ہوگئی۔ اگر کچھ علاقہ تھا تو بیوی کو جلانے ستانے سے تھا اس طویل روداد کا قلمبند کرنا بے سود ہے۔ مختصراً لکھتی ہوں کہ دنیا کا کوئی ظلم میاں نے اٹھانہیں رکھا۔ مگر ان کی زندگی کا مدارعمل اسی شعر پر رہا۔

جوروجفاپہ دوست کے مت تو نگاہ کر
اپنی طرف سے ہوئے جہاں تک نباہ کر

بیچاری اپنے والدین اورخسر کی زندگی تک کھانے پینے سے تنگ نہ ہوئیں مگر ان تینوں حضرات کے بعد یہ مصیبت بھی آپڑی ۔ ان کی اصلی اورعظیم الشان ریاست تو میاں کے قبضہ اقتدار میں تھی۔ تھوڑی سی مزید جائداد جوباپ کی وصیت کی رو سے ملی تھی۔ ان کی دریا دلی اور وسیع اخراجات کے لحاظ سے سیر میں چھٹانک بھی نہ تھی۔ اگر ابو یا ان کی نیلی کوٹھی چلانے، مال فروخت کرانے اور ان کے عام مفاد کی دیکھ بھال اپنے ذمہ نہ لیتے تو خدا جانے یہ خاندانی رئیسہ اور نازوں پلی خاتون کن؟ دہاڑوں کو پہنچ جاتی؟ اگرچہ ابو یا ان کے علاج وسرکاری معاملات اور خانگی مشکلات کی نہایت دلسوزی سے نگرانی رکھتے تھے۔ مگر پھر بھی ''لاوارثی'' کے سبب صدہا دشواریاں واقع ہوتی رہتی تھیں۔ رہے شوہر صاحب ۔ ان کا بس یہی کام تھا کہ بیوی کی رہی سہی عافیت میں خلل ڈالتے رہیں کسی سے ملنے جلنے راہ ورسم پیدا کرنے نہ دیں۔ بدگمانیوں اور بد زبانیوں سے زخموں پرنمک افشاں ہوں۔ علاج میں طرح طرح کی کھنڈت ڈالیں۔ عمداً ایسی باتیں کہیں جن سے مرض میں زیادتی ہوں۔ پرہیز نہ کرنے دیں۔ اگر کوئی خدا ترس (کوئی کون؟ وہی ابو یا) سرپرستی کرے تو اسے اپنی بساط بھر ذلیل کرنے میں کسر نہ چھوڑیں۔

یہاں تمثیلاً ایک چھوٹا سا قصہ لکھ دیتی ہوں۔ خالہ جی کی ایک رضاعی بھتیجی تھی محفوظن نام۔ اسکی انہوں نے حسب عادت نہایت مہربانی اورشفقت سے پرورش کی۔ جواں ہونے پرنہایت شرمناک طریقہ سے خالو جی نے اسے بیوی کی سوکن بنادیا اور وہ ناخداترس خوشی خوشی بن بیٹھی۔ دونوں ملکر خالہ جی ہی کی دولت سے گلچھڑے ازانے لگے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان مظالم کے باوجود میری فرشتہ سیرت خالہ کی پیشانی پرکبھی بل نہ آیا۔ کبھی میاں کے سامنے اف نہ کی کبھی ان کی اطاعت سے منحرف نہ ہوئیں۔ العظمۃ اللہ۔ وفا اسکا نام ہے۔ محبت اسکو کہتے ہیں۔'' ۱۸

خالہ ان کے لیے ماں کی جگہ تھیں کیونکہ وہ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی والدہ کی آغوش سے محروم ہوچکی

تھیں۔ بڑی بہن بھی صرف ڈیڑھ سال بڑی تھیں اور یہ فرق ایسا نہیں تھا کہ وہ جذباتی اور ذہنی آسودگی حاصل ہو سکے جو ماں کی کمی کا کسی حد تک مداوا ہو۔دونوں بہنیں ایک جیسے حالات میں بالکل ہم عمر سہیلیوں کی طرح پلی تھیں۔دونوں کی سہیلیاں بھی مشترک۔دونوں کے مسائل یکساں تھے۔ دونوں کیلئے خالہ ہی ماں تھیں۔ خالہ کے آخری ایام میں دونوں بہنیں ہی ان کی مزاج پرسی کرتی رہیں۔ بڑی بہن نکہت کی شادی خالہ کی زندگی میں ان کے ننھیالی عزیز خان بہادرعبدالمقیت خان شروانی رئیس بوڑھا گاؤں سے ہوئی تھی۔ شادی کے وقت ان کے بھائی حیران کا انتقال ہو چکا تھااور انتظامات کی ساری ذمہ داری زخ ش پر تھی۔ وہ اور ان کے والد اس بات پر متفق تھے کہ جہیز وغیرہ کی فضول رسم اور بکھیڑوں میں الجھنے کے بجائے دلہن کو نقد رقم دے دی جائے جس سے وہ آئندہ زندگی میں جو کچھ بنانا چاہیں خود بنائیں۔ مگر خالہ اور پھوپھی تمام رسوم و رواج پورے کرنے پر مصر تھیں۔ تایا سعید خان بھی جہیز دینے کے حق میں تھے۔ زخ ش نے مجبوراً بزرگوں کی بات مانتے ہوئے اپنی نگرانی میں جہیز کا تمام انتظام خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ گھر میں مہر کی رقم پر بھی بزرگوں میں دو رائے پیدا ہوگئی تھی۔ زخ ش نے اس موقع پر بڑی دانشمندی اور جرأت سے کام لے کر تایا کو جنہیں بزرگ ہونے کے ناطے فیصلے کا کامل اختیار تھا اس بات پر آمادہ کرلیا کہ مہر کی رقم دسہزار سے بڑھا کر پچیسہزار روپے رکھی جائے جو دیگر لوگوں کی رائے تھی۔ انہوں نے بے حد مستعدی اور خوشی سے بہن کی شادی کے تمام انتظامات نپٹائے۔ یہ ایک واحد خوشی تھی جو ان کی مختصر زندگی میں کچھ دنوں کے لیے آئی۔ اس کے فوراً ہی بعد ان کے تایا احمد سعید خان سرطان میں مبتلا ہوئے اور تکلیف دہ علالت سہتے ہوئے انتقال کر گئے۔ بیمار خالہ کا بھی انتقال ہوا بہن احمدی بیگم حمل کی تکالیف میں مبتلا ہوئیں۔ پھوپھی زاد بہن اور رازدار سہیلی انیسہ خاتون بھی حمل اور زچگی کی تکالیف میں مبتلا رہیں۔ ان کے ہاں آپریشن سے بچی پیدا ہوئی۔ زخ ش اپنے روزنامچے میں احمدی بیگم اور انیسہ خاتون دونوں کی حالت پر بار بار فکر کا اظہار کرتیں رہیں اور ان تفکرات کو وہ بالکل تنہا برداشت کررہی تھیں۔اپنی ڈائری میں لکھتی ہیں۔

''آج یہ خبر سن کر کہ انیسہ کی بچی عمل جراحی کے ذریعے دنیا میں آئی دیر تک سناٹا رہا۔ خدا نے بڑی خیر کی۔ ابویا نے آپا جان کی دہشت اندوزی کے خوف سے یہ خبر مخفی رکھی تھی کہ وہ ماشاء اللہ کچھ مہینے پیچھے ماں بننے والی ہے۔ مگر شکر ہے کہ ان کی لاابالی طبیعت نے اسے کچھ اہمیت نہیں دی۔'' ۱۹

یہ وہ عرصہ ہے جب خود زخ ش مسلسل اور سخت علیل تھیں آئے دن جاڑا دے کر بخار آتا' زکام اور اسہال کی بھی شکایت رہتی تھی۔۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو روزنامچے میں لکھتی ہیں کہ انہوں نے والد کے کتب خانے سے ایک طبی کتاب لے کر اس کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ آگے لکھے جانے والے جملوں میں ایک لطیف حسِ مزاح نظر آتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''آئے دن کی بیماری نے مجھے فنِ طب کی طرف مائل کر دیا ہے۔ مگر چونکہ میری آزردہ طبیعت تندرستی کی پابند نہیں اس لیے بیش قیمت کتابی ہدایات مخولیا ہی تک موثر ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے کھانے کے بعد دماغی کام کو مضر بتانے والی کتاب کھانا کھا کر شروع کی۔ اثنائے مطالعے میں کسل دردظہور پذیر ہو کر مصنف کے الفاظ کو مصدق کر گئے مگر میں نے کتاب کو پورے غور کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھ کر دم لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معلومات کی نسبت پشیمانی اور مقدار میں حاصل ہوئی۔''

ایک اور جگہ اپنی بیماری کا ذکر اسی ہلکے پھلکے انداز میں کرتی ہیں۔

''رات بھر نزلے نے بے کل رکھا۔ مرض کی سختی ''وہم'' سے مل کر اور بھی ناقابل برداشت ہوگئی۔ مہینے بھر سے نزلے کی شکار ہوں قریباً ہر وقت زکام کی سی ریزش رہتی ہے مگر گھر میں کسی کو اس کا پورا علم نہیں۔ ابویا کو بھی نہیں جو اعماقِ قلب سے میری علالت اور صحت کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں خود بھی آج رات سے پہلے قطعی لاپروا تھی اور شکر ہے کہ رات گزرنے کے بعد پھر لاپرواہی عود کر آئی۔''

وہ اپنی بیماریوں کا ذکر ہلکی سی شوخی کیساتھ کرتیں تھیں جیسے خود کو دلاسے دے رہی ہوں۔ اپنے لکھنے والے وجود کو کارآمد بنائے رکھنا چاہتی ہوں۔ ایک جگہ اور تفکرات اور بیماریوں کی تشویش سے آزاد اور ان سے فرار کی کوشش کا یوں ذکر کرتی ہیں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء کا روزنامچہ

''انیسہ کی طرف سے وحشت۔ خالہ جی کی طرف سے وحشت۔ خود اپنی بیماری کی وحشت۔ لکھنا پڑھنا چھوٹ جانے کی وحشت۔ دماغ نے اس روحانی بیماری (وحشت) کے دو علاج تجویز کیے ہیں۔ پیاری بھانجی عفیفہ کیلئے گڑیاں بنانا اور بانو سے پریم چند کے مختصر افسانے سننا)۔''

عزیزوں کے علاوہ اس حساس شاعرہ نے قریبی دوستوں۔ زیر پرورش لڑکیوں اور ان لکھنے والوں کے صدمے بھی اٹھائے جن سے وہ ذہنی قربت رکھتی تھیں۔ رابعہ سلطان حیدرآباد دکن کی ایک معروف نثر نگار تھیں جن کے مضامین تہذیب نسواں میں چھپتے رہتے تھے۔ ان سے زاہدہ خاتون کا خط و کتابت کا رابطہ ۱۹۱۰ء میں ہوا اور خیالات کی ہم آہنگی نے اتنی قربت پیدا کردی کہ دونوں کو ایک دوسرے کے خط کا انتظار رہتا اگرچہ دونوں کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ رابعہ خاتون علی گڑھ آئیں اور زخ ش سے ملاقات کیلئے پیغام بھی بھیجا مگر وہ انہیں اپنے گھر سے گاڑی نہ بھجوا سکیں۔

زخ ش کو اس ملاقات کے نہ ہونے کا شدید افسوس ہوا۔ رابعہ خاتون طویل بیماری میں مبتلا رہ کر ۱۹۱۸ء میں انتقال کر گئیں۔ وہ ایک سال تک شدید بیمار رہیں اور خطوں میں زخ ش سے اصرار کرتی رہیں کہ وہ ان سے ملنے آئیں۔ زخ ش پہلے ہی صدمات سے دوچار تھیں۔ ان کی صحت کی طرف سے متفکر اور پریشان رہیں۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار وہ یوں کرتی ہیں۔

''عرصے سے میری پیاری رابعہ کا خط نہیں آیا۔ دن رات ان کی طرف سے پریشانی اور خفقان لاحق رہتا ہے۔ اصل میں یہ میری ہی شامت اعمال کا قصور ہے کہ جس سے میں محبت کرتی ہوں وہی مبتلائے مصائب و آفات رہتا ہے چونکہ مجھے رابعہ سے محبت ہی نہیں بلکہ اس سے بھی سوا کچھ ہے اس لیے وہ بے چاری اور بھی زیادہ تکالیف وصعوباتِ گوناگوں کا شکار رہتی ہے۔''

رابعہ خاتون کی وفات پر انہوں نے اشعار کے علاوہ ایک مضمون تہذیب نسواں میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں عزیز سہیلی کی موت کے غم کے ساتھ ان سے نہ مل سکنے کا شدید دکھ بھی شامل ہے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ ایک تعلیم یافتہ رئیس زادی برصغیر کے سماج کی عائد کردہ پابندیوں میں قید ہوکر اپنی سہیلیوں سے ملاقات کا اختیار بھی نہیں رکھتی تھیں۔ علم کی روشنی ان کے ذہن و دل کو کشادہ کر چکی تھی۔ ان کے اندر اظہار و عمل کی خواہش جڑ پکڑ گئی تھی۔ مگر وہ ہم خیال اور ذہنی طور پر ہم قامت افراد سے خواہ وہ خواتین ہی کیوں نہ ہو ملنے اور گفتگو کرنے سے محروم رہیں۔ وہ قلم کا سہارا لیتی رہیں۔ مگر خطوط تو تشنگی میں اضافہ ہی کرتے تھے۔ اس تشنگی اور اذیت کا اظہار بھی بار بار ان کے خطوط اور ڈائری میں ہوتا ہے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو ان کی ہم عمر قریبی عزیز رحیلہ خاتون شروانی ان سے ملنے آئیں تو ان کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا اور ۳۰ دسمبر کو چلی گئیں تو لکھتی ہیں۔

''رحیلہ خاتون آپا کی روانگی کے بعد اپنے گھر پر نظر ڈالی تو ایسا محسوس ہوا گویا دُلہن نے اپنے زیور اتار دیئے ہوں۔'' ان کی آمد پر لکھتی ہیں۔

''راحیلہ خاتون آپا اہلیہ صدیق خان صاحب کے ساتھ شام کے تین بجے آئیں۔ خواہر موصوفہ کے ساتھ ہمیشہ سے محبت رکھتی ہوں۔ اس محبت کا باعث ان کی قومی محبت' فطری شرافت اور کذب وریا سے بری ظرافت ہے۔ خدا کرے دنیاوی گرفتاریاں اور اغراض و مقاصد کی توثیق ان کے دلربا جوہروں کا بال بیکا نہ کرسکے۔ درحقیقت وہ ظرافت جو تہذیبی۔ جھوٹ اور ذاتی اغراض سے پاک ہو زندگی کو زندگی بنادیتی ہے۔ کل کی طرح آج بھی ان کی صحبت نے میری کند اور کملائی ہوئی طبیعت میں زندگی پیدا کردی۔ مگر آخر میں ان کی ایک پرانی نادیدہ سہیلی کی طویل اور عجیب داستان سن کر میں سُن ہوگئی۔ آہ اس وحشیانہ قدامت پرستی نے نازنینوں کی زندگی کو سچا' پراسرار اور حیرت انگیز ناول مگر غم انجام بنادیا

ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا لڑکی کے افسانہ حیات کا انجام بھی اس کی دیوانگی اور اس کے طالب کی خودکشی پر ہوا۔ میرے دل میں بے اختیار اس واقع کو عالم آشکار کرنے کی آرزو پیدا ہوئی مگر ناکام اور بیہودہ آرزو۔ کیونکہ اول میرے ادھورے اور اتمام خواہ مشاغل مزید کارپردازی کی اجازت نہیں دیتے۔ دوسرے اس مظلومہ کے اخفا کوش سرپرست راحیلہ خاتون آپا سے خدا واسطے بیر رکھتے ہیں۔ یہ چور اپنی داڑھی میں تنکا ڈھونڈنے لگیں گے اور بات کی تہہ تک پہنچ کر حق ناحق خواہر ممدوح کے سر ہوجائیں گے۔ یہ راحیلہ خاتون زخ ش کی قریبی عزیز اور ہم عمر تھیں۔ راحیلہ خاتون کی والدہ مشرقی بیگم اور والد موسیٰ خان شروانی کا گھر مشرف منزل علی گڑھ میں مسلم لیگ کا مرکز تھا کیونکہ مسلم لیگ کی بنیاد اسی گھر میں ڈالی گئی تھی۔ راحیلہ خاتون ابتدائی عمر سے مسلم لیگ کی رکن تھی اور سماجی و سیاسی اعتبار سے متحرک شخصیت تھیں۔ انہی خاتون نے کراچی میں سرسید گرلز کالج بھی قائم کیا اور یہاں گراں بہاں تعلیمی و سماجی کام کیے۔

زاہدہ خاتون خود بھی غیر معمولی سماجی وسیاسی شعور رکھتی تھیں اور اردگرد کے سیاسی حالات سے شدید متاثر ہوتی تھیں ان کی زود رنج طبیعت دنیا کے تمام انسان خصوصاً مسلمانوں کے دکھ کو اس طرح محسوس کرتی تھی کہ وہ ان کا ذاتی غم بن جاتا خصوصاً ترکی کے حالات نے اس وقت برصغیر کے تمام مسلمانوں کو مضطرب کیا ہوا تھا۔ زاہدہ خاتون اپنے اضطراب کا اظہار شاعری اور مضامین میں کرتی رہیں۔ ان کے اضطراب کی پوری تصویر کشی ۱۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کے روزنامچے میں موجود ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''ہٹو ہٹو' سرکو سرکو اے فراق کے داغو! اے بزم دل کے چراغو! جگہ خالی کرو۔ بہت تھوڑی جگہ' بس ایک نشست کے قابل۔ آہ اس جلی بھنی سنسان' عبرت انگیز محفل میں جگہ کہاں؟ اس کے کھچا کھچ بھرے گوشوں میں نئی نشست کا کیا ذکر؟ اچھا تو اے طرابلس کے داغ! اے میری بزم دل کے سب سے پہلے آتشیں زینت بخشنے والے! کھسک' سمٹ' اور ایک نو وارد کو جگہ دے......

مگر آہ تو ٹس سے مس بھی نہیں ہوتا!

خیر اے حسین سلونیکا! مقدس ایڈریانوپل! ترکوں کے پیارے وطن اور سحر طراز ہومر کے مولد سمرنا! تم ہی آئینِ مہمان نوازی پر عمل کرو۔

مگر آہ تمہارے داغوں نے بھی اپنے پہلے رفیق کی تقلید کی۔ اے لیلیٰ مجنوں کی سرزمین! اے ہارون و مامون کے پایہ تخت! اے مقتل حسینؑ! اور اے خوابگاہِ مرتضیٰؑ کیا تم بھی ایثار نفس کا ثبوت دینے سے قاصر رہو گے؟

مگر آہ تمہارے داغ تو اور بھی سخت نکلے!

یہ سب اپنی جگہ پر اڑ گئے ہیں۔ بس تو ہی رحم کر اے گہوارۂ نبوت ﷺ‘ سرچشمۂ الہام‘ اولین قبلۂ اسلام‘ ہلال وصلیب کے میدان آویزش‘ صلاح الدین کے چشم و چراغ۔ ہاں اے بیت المقدس! اے وہ پاک مقام جسے ہندوستانی فوجوں نے (کبھی نہ بھولیے گا‘ ہندوستانی سپاہ نے) اسلام سے چھین کر لاڈلے یہودیوں کا گھر بنانے کیلئے برطانیہ کے حوالے کیا۔ تو ہی رحم کر!

......مگر آہ تیرا داغ بھی اٹل ہے۔

اب کیا کروں‘ اس نئے مہمان کو کس طرف لے جاؤں؟ داغستانِ حجاز کی طرف؟ نہیں! نہیں۔ کبھی نہیں۔ آہ اے معماران ابراہیم و اسماعیل کے بنائے ہوئے بیت اللہ‘ قبلۂ دین و ایماں‘ مولد مصطفےٰ ﷺ کے داغ‘ ہرگز ہرگز سوئی کے ناکے کی برابر جگہ خالی نہ کیجئو۔ بزمِ دل درہم و برہم ہوجائے گی‘ زمین شق ہوجائے گی‘ آسمان گر پڑے گا اگر تو قلبِ مومن سے بال بھر بھی ہٹا اور ہاں تو بھی اسی طرح کلیجے سے‘ سینے سے‘ دل سے‘ لگے رہیو۔ اے گیسوؤں والے محبوب کو آغوش میں سُلانے والی یثرب نگری کے داغ! ہاں ہاں تجھے اسی آرام جان کے آرام گاہ کی قسم‘ اس کے آل و اصحاب کی خواب گاہوں کی‘ اس کی مسجد ومنبر کی‘ اس کی پامال کی ہوئی گلیوں کی قسم‘ تو میخ بن کر دل میں گڑا رہ‘ یہاں تک کہ تیرا سوز میرے جسم کے خانۂ عنصری کو جلا کر خاک سیاہ کردے اور یا تو برشتہ جگر مسلمانوں کو یوسفِ گم گشتہ کی طرح واپس مل جائے۔

سب سے آخر میں مسیحی پوپ کے اس اسلامی گوشے سے ملتجی ہوں جسے قدرت کی عجوبہ کاری نے دو براعظموں کے درمیان حدِ فاصل بنایا ہے۔ ہاں حسن و زیبائی کے اس قدرتی مرقع سے جس کو فتح دنیا کی کنجی اور عالم گیر سلطنت کا پھاٹک بتایا جاتا ہے‘ جس کیلئے پیٹر‘ نپولین‘ اور تمام فاتحان شہر کی روحیں پھڑک پھڑک رہ گئیں‘ جس کی شان میں ہمارا قومی شاعر کہتا ہے۔

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار\
مہدی اُمت کی سطوت کا نشان پائدار

صورتِ خاک حرم‘ یہ سرزمیں بھی پاک ہے\
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ﷺ ہے

نگہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا\
تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا

کشورِ اسلام کا اے دوستو! دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

(علامہ اقبال نظم)

اس مشہور تاریخی شہر کے داغ سے ملتجی ہوں کہ تو ہی ''نئے داغ'' کو اپنی جانشینی عطا کر' یا کم سے کم یہ کہ خود عمق پذیر ہوکر اسے اپنے سینے پر بٹھالے۔

آ۔آ۔ اے نو وارد داغ! اے خدمات خلافت کے مرکز جلیل' صداقت وحریت کے مشہدِ عظیم' مہاجرین اسلام کے مرجع وحید' اخوت کے منظر جمیل' ''انگورہ کے داغ'' آ اور ''داغِ قسطنطنیہ'' سے ہمکنار ہو اس وقت تک کیلئے کہ غیرتِ خداوندی متحرک ہوکر ترکوں کی تمام وطنی سرزمین کو آزاد کرکے بیسویں صدی کے ملحد فرنگیوں کے منھ پر طمانچہ ''اعجاز'' رسید کرے۔''

روزنامچے کی یہ دکھ بھری تحریر سقوط انگورا کی یہ غلط خبر پڑھ کر لکھی گئی تھی جو اس وقت کے اخبار پائینر میں چھپی تھی۔۱۳ستمبر۱۹۲۱ء بمطابق ۱۰محرم کو وہ امام حسین ؑ کے غم کے ساتھ مسلمانوں کے آلام پر بھی غور کرتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ہندی مسلمانوں کو اس پر آشوب دور میں اسوۂ حسینیہ (مقاومت صابرہ) پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔اسی دن انہیں اکبر الہ آبادی کی وفات کی خبر ملی۔ اکبر الہ آبادی سے وہ متاثر بھی تھیں اور بالواسطہ تعلق بھی رکھتی تھیں۔اس دن کے روزنامچے کا ایک حصہ اکبر الہ آبادی کے بارے میں ہے۔

''سنتی ہوں سقوط انگورا کی خبر جسے پائنیر نے نمایاں حروف میں شائع کیا تھا۔ برطانوی مطبخ کی من گھڑت خبروں میں سے تھی۔ الحمد للہ نعمانہ' یہی سنا ہے کہ ترکوں کا قدم پیچھے ہٹنے کی جگہ آگے بڑھ رہا ہے۔ثم الحمدللہ اکبر الہ آبادی نے کیا سچ کہا ہے۔

گھر سے خط آیا کہ کل ہوگیا چہلم اس کا
پائنیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

میں یہ سطریں لکھ رہی تھی کہ ابویا اور داؤد احمد نے فرداً فرداً ایک دردناک خبر سنائی جس سے دل دیر تک بے قابو رہا آہ! بے مثال لسان العصر سید اکبر حسین خدا تمہاری مغفرت کرے' تمہاری وفات نے بزم سخن کو سونا کردیا۔تم ہمارے درمیان۷۰،۸۰ برس رہے مگر کوئی نہ سمجھ سکا تم کون تھے اور کیا تھے۔ تمہارا رنگ سخن ہر سخن سنج نے اڑانا چاہا مگر ایک

بھی نہ اڑا سکا اور جو نسخہ تم نے آسمانی محکمے میں پیٹنٹ کرالیا تھا۔ اس کے اعجاز اثر اجزا ہزار ہزار تجسس اور سرگردانی پر بھی کسی نقاد کے ہاتھ نہ آئے۔''

زخ ش کے آخری ایام ان کے روزنامچے میں تحریر ہیں یہ روزنامچہ ۴ ستمبر ۱۹۲۱ء مطابق یکم محرم الحرام ۱۳۴۰ھ سے ۲۷ جنوری ۱۹۲۲ء مطابق ۲۸ جماد الاول ۱۳۴۱ھ تک باقاعدگی سے ہجری اور عیسوی تاریخوں کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس طرح وہ وفات سے چند روز قبل تک روزنامچہ تحریر کرتی رہیں۔ ان ایام میں اگرچہ وہ بیماری کی شدت سے دوچار رہیں اور اپنی جواں مرگی کی پیش گوئی کررہی تھیں مگر اپنے روزمرہ کے مشاغل سے دستبردار نہیں ہوئی تھیں۔ خصوصاً شعری تخلیقات اور طبیعت کی روانی زوروں پر تھی۔ اِن ایام میں ان کی بینائی کا وہ نقص بھی دور ہوگیا جو رات کو پڑھنے سے معذور کردیتا تھا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کی رات کو لکھتی ہیں۔

''آج کل خدا کے ایک نئے انعام سے سرفراز ہوں یعنی آٹھ سال بعد رات میں نگاہی کام کرنے کی قوت عود کرآئی ہے۔ اگرچہ بائیں آنکھ کا پیدائشی ضعف اب بھی ستاتا ہے مگر اتنا نہیں کہ جبر وظلم بھی آنکھوں کو آمادۂ کار نہ کرسکے۔''

تحریر وتخلیق کے ساتھ انہوں نے سماجی اور فلاحی ذمہ داریوں کو بھی جاری رکھا جس میں وہ اپنے تایا احمد سعید خان کی معاونت کرتی تھیں۔ احمد سعید خان اپنی دولت کا بڑا حصہ فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سے خاندانوں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا اور ان کی کفالت بچوں کی تعلیم وصحت کی نگرانی کا باضابطہ انتظام ان کی جانب سے تھا۔ بچیوں کی تعلیمی ذمہ داری انہوں نے زخ ش کو سونپی تھی۔ وہ خود بھی لڑکیوں کی تعلیم اور عورتوں کی حالت سدھارنے کی طرف راغب تھیں۔ چنانچہ نومسلم بچیوں کو پڑھانا۔ ان کے کپڑے درست کرنا۔ ان کے علاج پر توجہ دینا وہ مشاغل ہیں جن کا ذکر ان کے روزنامچے میں ہے۔ خصوصاً ان بچیوں کا ذکر ہے جو ان کی شاگردی میں مسلسل رہیں۔ ان کی فہرست اپنی نوٹ بک میں یوں لکھی ہے۔

''اسمائے تلامیذ نزہت معہ تفصیل تعلیم

۱۔ گیتی بانو عربانو دختر عبداللہ نومسلم مرحوم (اردو نوشت وخواند، تھوڑی سی فارسی اور قرآن مجید کا دور ثانی)۔

۲۔ سارہ خانم دختر مولوی احمد حسین عرف پنجکن مرحوم (قرآن مجید، اردو اور کسی قدر فارسی)۔

۳۔ مشرف حسین پسر شیخ عبدالواحد عرف ننھے مرحوم (قرآن شریف، اردو زبان، من اولھما الا آخرھما)

۴۔ علیمن دختر رمضانی قوم سقہ (قرآن مجید، اردو، الف ابجد سے لے کر تائے تمت تک)۔

۵۔ عائشہ دختر محمد صدیق قوم پٹھان (قرآن شریف، اردو، الف ابجد سے تائے تمت تک)۔

علیمن کا ذکر ۱۱ستمبر ۱۹۲۱ء کو روزنامچے میں یوں کرتی ہیں۔

''علیمن جو میری گیارہ سالہ حاضر باش پیش خدمت ہے اور جسے میں نے خود قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی ہے۔ اس کی بابت یکا یک یہ خبر گوش گزار ہوئی کہ اس کے متعدد رشتے دار جمع ہوکر ایک سقہ سے فوراً نکاح کر دینے کا مطالبہ کرنے آئے ہیں۔ اس لڑکی کو مرحوم والدین نے روپیہ لے کر نہایت کم سنی میں ایک عمر رسیدہ بدمعاش اور نادار سقہ سے بیاہ دیا تھا۔ جس سے ابا جی نے بمشکل دوسو روپے دے کر طلاق نامہ حاصل کیا۔ اب دوبارہ یہ کمبخت برادران یوسف اس ناز ونعم کی خوگر ہونہار بچی کو پتھر سے دے مارنا چاہتے ہیں۔ غضب یہ کہ ابا جی (تایا) بھی جنھوں نے علیمن کو میرے سپرد کیا تھا انہی کے ہمنوا ہیں۔ میں نے پوری استقامت سے مخالفانہ جدوجہد کی اور اپنے باپ کی مدد سے عارضی طور پر بلا کو ٹال دیا۔ مگر انجام کا پتہ نہیں۔''

گیتی بانو عرف بانو ان کی خاص شاگرد تھی اور پڑھ لکھ کر اتنی ہوشیار ہوگئی تھی کہ ان کے علمی کاموں میں معاونت کرتی تھی۔ ان کی اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ لڑکی تپ دق میں مبتلا ہوکر سخت بیمار ہوگئی۔ ز خ ش اس کی بیماری سے متفکر وملول رہنے کے ساتھ ساتھ اس کی تیمار داری اور دلجوئی کو اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ جنوری سے ان کے روزنامچے میں بار بار بانو کی علالت کا ذکر آتا ہے۔ ۱۱جنوری ۱۹۲۲ء کو لکھتی ہیں۔

''بانو عرصے سے علیل ہے پہلے جلد جلد تیز بخار کے حملے ہوتے رہتے تھے۔ اب ہر وقت خفیف حرارت رہتی ہے جس میں شام کو زیادتی ہوجاتی ہے ہمہ وقت کچھ کھانسی بھی اذیت افزا ہے۔ مجھے اس کی علالت سے بہت تشویش ہے اور لکھنے پڑھنے کے کام میں اس سے مدد لینی موقوف کردی ہے حالانکہ اس کا بس چلے تو تندرستی کے زمانے سے دوگنا کام کرے۔ ۱۵جنوری کو لکھتی ہیں پونے چھ بجے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ بانو زار زار رو رہی ہے اور مجھے بلا رہی ہے گھبرا کر گئی دیکھا کہ کل کی دست آور دوا بخار اور کونین کمپچر کی ایک خوراک پی لینے سے ضعف کی سنسناہٹ حد کو پہنچ گئی ہے۔ مقیاس الحرارت نے بتایا کہ بخار کا نام بھی نہیں۔ اس ضعف کی حالت کو بانو نے مرض کی کوئی جدید صورت سمجھا اور بد حواس ہوگئی۔ میں نے پہلے پیار سے اور پھر ڈانٹ کر چپ کیا اور دودھ میں انڈے کی زردی پھینٹ کر پلائی۔ طبیعت بحال ہوگئی۔ بانو کی علالت نے بہت ہی پریشان کر رکھا ہے۔ ۱۷جنوری کو لکھتی ہیں۔ سیدھا ہاتھ زخمی ہوگیا ہے الٹے ہاتھ پر نہ صرف اپنے رفیق کے کاموں کا بار ہے بلکہ اس کی خدمت و تیمارداری کی جدید مہم کو بھی سر کرنا پڑا ہے۔ پھر طرہ یہ کہ دل

جو اس کا حاکم تھا دست راست کی پریشانی سے بیمار ہوگیا۔ اب بیچارے بائیں ہاتھ کی رہنمائی کرے تو کون کرے۔ غیر متعلق لوگوں کی مداخلت اِمداد کی جگہ نیش زنی پرمبنی ہے مگر اے بیمار دل تو کیوں بیمار ہے۔ زندگی کی اصلیت تو پریشانی ہے کیا تونے جوش کا شعرنہیں سنا۔

سوچو تو دل میں آخرکس طرح رات دن ہو
جو سانس لے رہا ہوپھر بھی وہ مطمئن ہو

میں سمجھتی ہوں کہ سطور بالا میں میں نے اپنی مددگارِ اعلیٰ بانو کی شدید علالت اور اپنی حالت وطبیعت پر اس علالت کے اثرات کو کافی طور سے بیان کردیا ہے۔۱۹جنوری کو پھر وہ لکھتی ہیں۔

''بانو کے بخار کھانسی کی یکسانی سے جان عذاب میں آ گئی ہے۔ اگرچہ اس بےنظیرلڑکی کی خدمات سے محروم ہوکرمیں انقلاب حیات میں پھنس گئی ہوں اور جو وقت علمی مشاغل میں کٹتا تھا۔ تیمار داری اور دنیا کے روکھے پھیکے دھندوں میں گزرتا ہے اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ مجھے اس کا راء برابرغم نہیں جتنا خیال اس کی بیماری کا ہے۔''

یہ دور وہ تھا جب وہ خودبھی بیمارتھیں اور اب ان کی حساس طبیعت اپنی موت کی آمدکومحسوس کررہی تھی۔ مگر اپنی خدمات گار کی تیمارداری کوبھی فرض سمجھتی تھیں۔ ان دنوں ان کی بہن کے ہاں بھی ولادت ہونے والی تھی۔ انہیں اس خوشی کی خبر کا بھی انتظار تھا۔مگر اپنی بیماری اور دیگر مشاغل پر بانو کی بیماری کی فکر حاوی تھی۔۲۴جنوری کوبھی ان کے روزنامچے میں صرف بانو کی صحت کا ذکر ہے۔لکھتی ہیں۔ تین دن سے بانوحکیم شبیر احمد خان کے زیر علاج ہےمگر حالت میں ذرہ برابر فرق نہیں وہی صبح کو۹۹اور شام کو۱۰۱ درجہ حرارت ہوتی ہے ۔وہی کھانسی ،وہی درد۔۲۷جنوری۱۹۲۲ءتک انہوں نے روزنامچہ لکھا ہے۔ آخری ایام کے بارے میں انیسہ خاتون شروانیہ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے۔مسلسل صدمات بیماری کی تکالیف اور تنہائی نے ان میں اضطرابی کیفیت اور بے ثبات زندگی کا یقین اس طرح طاری کیا تھا کہ وہ اپنی جواں مرگی کی پیش گوئی اشعار اور روزنامچے میں کرنے لگی تھیں۔ مذہب سے انہوں نے ابتدا سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس لیے بھی موت کو برحق سمجھتی تھی اور صبر وشکر کی طرف راغب تھیں۔ نتیجتاًزندگی کی تمنا پر بعد از موت کے انعامات الٰہی کی امید حاوی ہونے لگی۔ ۱۱اکتوبر۱۹۲۱ء کے روزنامچے میں انہوں نے لکھا۔

''اکتوبر کے آغاز سے دوپہر میں سونے کی جگہ مطالعے میں کٹتی ہے۔قوت سے زیادہ کام کرنے کی وجہ یہ ہے کہ روح ہر وقت دل کو''**جواں مرگی**'' کا یقین دلاتی رہتی ہے اور دل ہر وقت دماغ کو اس خیال سے معمور رکھتا

ہے۔'' جو کرنا ہے کرلو تھوڑی مہلت ہے۔''

اس عبارت میں جواں مرگی کو جلی حروف میں لکھا گیا ہے۔ اسی روز انہوں نے لکھا کہ وہ موت سے نہیں ڈرتیں۔ اپنی سچی قومی محبت اور خصوصا حضرت محمد ﷺ سے عشق کی بناء پر انہیں بخشش و نجات کی امید ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے اس روزنامچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے مایوس ہوچکی تھیں مگر جتنا بھی وقت ان کے پاس تھا اسے تحریر وتصنیف پر صرف کرنا چاہتی تھیں۔ تاہم قویٰ جواب دے رہے تھے۔ جنوری ۱۹۲۲ء تک صدمات' پریشانی اور بیماری کا غلبہ رہا مگر وہ پوری ہمت سے روزمرہ کے مشاغل کو جن میں گھریلو' سماجی اور تحریری ذمہ داریاں تھیں پوری کرتی رہیں۔ ۲۵ جنوری ۱۹۲۲ء کو انہوں نے روزنامچے میں پنڈیاں بنوانے کا ذکر کیا ہے۔ پھر یہ بھی لکھا ہے'' یہ تو ظاہر ہے کہ ڈھائی تین سو پنڈیوں میں سے ایک ریزہ بھی میرے منہ میں نہ جائے گا'' اور اس کی وجہ ان کی طبیعت کی ناسازی ہی معلوم ہوتی ہے۔ یہی وہ تاریخیں ہیں جب ان کی ہمہ وقت کی ساتھی اکلوتی بہن احمدی بیگم زچگی کے آخری مراحل سے گزر رہی تھیں اور کسی بھی لمحے بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ ۲۷ جنوری تک انہوں نے روزنامچہ لکھا ہے۔ آخری دو دنوں کے روزنامچے دو دو لائن پر مشتمل ہے جو دو عزیز لڑکیوں محمدی بیگم اور احمدی بیگم کے آنے اور جانے کے خبر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کے حالات کی راوی انیسہ بیگم ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

''۲۷ جنوری کو جمعہ کے دن مرض الموت میں گرفتار ہوئیں جو کہ نہایت تیز بخار کی صورت میں نمودار ہوا اور جس نے آناً فاناً ۱۰۶ ڈگری پر پہنچ کر دوسرے ہی روز سرسامی صورت اختیار کرلی۔ یہ وہی جان لیوا مرض تھا جس کا نشانہ چھ سال پہلے ان کے جوانمرگ بھائی بن چکے تھے۔ ضعیف الحال باپ نے صورتحال دگرگوں دیکھ کر تہیہ کرلیا کہ اس مرتبہ ڈاکٹری علاج کے بجائے یونانی تدابیر کی جائیں گی۔ ان کے بھائی مرحوم کی آخری بیماری میں مسلسل ڈاکٹری معالجہ جاری رہا تھا اور یہ ایک زبان زد بات تھی کہ ان کی وفات کے وقت معہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے سات ڈاکٹر اور کمپوڈر موجود تھے۔ زاہدہ خاتون مرحومہ نے اپنی مسدس ''اللہ الصمد'' کے اس شعر میں یہی اشارہ کیا ہے۔

کیا کیا حیلِ اطباء کی فسوں کاری نے
کیا کیا آکے بھلا ڈاکٹر انصاری نے

چنانچہ فی الفور دہلی سے وہاں کے نامی طبیب غلام کبریا خاں عرف بھورے میاں کو بلایا گیا۔ مگر مرض کی لحہ بہ لحہ شدت آناً فاناً بڑھتی گئی' حتیٰ کہ تیسرے ہی روز پریشان کن صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ تیز بخار' شدید غفلت' بے چینی' ہذیاں سرائی وغیرہ تکالیف ہر روز بڑھ رہی تھیں۔ باپ کا یہ عالم تھا کہ اندر باہر کسی جگہ ان کو ایک منٹ قرار نہ تھا۔ ایک رات

شمار کیا گیا تو سات مرتبے بیٹی کے پاس مردانے سے آئے تھے۔ خیر' خیرات' صدقات' مبرات' دعا' دوا سب کچھ جاری تھے مگر افاقے کی شکل عنقا تھی۔ ادھر یہ حالت امید وبیم تھی اُدھر قدرت کچھ اور ہی گل کھلانے والی تھی۔ یعنی بڑی بہن احمدی بیگم نکہت شروانیہ کے چھوٹی بہن کی علالت سے تیسرے روز بچی پیدا ہوئی۔ گویا گھر میں ایک آیا اور دوسرا رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ پھر یہ جانے والا کون تھا؟ بھانجی کی وہ جان نثار خالہ جو مسرت کے لیے ترسی ہوئی تھی' اور اس ہونے والی خوشی کے لیے جس نے ایک ایک دن گن گن کر ایک تجربہ کار خاتون کی طرح پوری تیاریاں کی تھی' حتیٰ کہ نومولود کی رضاعت کا بھی قبل از قبل انتظام کر کے ایک عورت کو نامزد کر دیا تھا۔ اللہ اکبر' اس فسانے کا یہ آخری باب کس قدر عبرت انگیز اور حسرت ناک تھا۔ کیا بے نیاز اللہ ہے پاک۔

لیکن غالباً صرف اسی نوید مسرت کو سننے کے لئے علالت کے چوتھے روز یکا یک وہ ہوش میں آ گئیں۔ حواس کسی قدر یک جا ہوگئے اور بخار ہلکا پڑ گیا۔ کسی نے یہ خوش خبری سنائی تو اس زرد اور مردنی چھائے چہرے پر مسرت کی آناً فاناً مٹ جانے والی لہر پیدا ہوئی اور ہنس کر والدِ بزرگوار سے کہا ''ارے لڑکی! ابو یاجی لڑکی پیدا ہوئی ہے؟'' اس کے بعد آنکھیں بدستور بند ہوگئیں۔ کسی دوسرے وقت لمحہ بھر کے لیے آنکھیں کھول کر پاپنی زچہ بہن کے پاس پیغام بھیجا کہ میرا دل ننھی منی کو دیکھنے کے لیے بہت چاہتا ہے مگر بیماری و ناتوانی سے از حد مجبور ہوں۔ اس پیام کا لب و لہجہ اتنا درد ناک اور پرحسرت تھا کہ آج بھی اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ افسوس بھانجی کو دیکھنے کی یہ آخری آرزو قدرت کی طرف سے پوری ہونے والی نہ تھی۔ خدا کی شان ہے کہ عمر بھر دونوں بہنیں ایک گھر میں یک جا اور ہر وقت باہم دگر شریک رنج و راحت رہیں لیکن اس آخری وقت میں باہم اس طرح جدا ہوئیں کہ بڑی بہن کو اپنی چہیتی چھوٹی بہن کا آخری دیدار یا خدمت بھی میسر نہ ہوسکی اور کانوں سے بہن کی خبر مرگ ہی سنی پڑی۔ بیماری میں دلٹنا پلٹنا بھی نصیب نہ ہوا۔ اس روز زاہدہ خاتون اپنی شاگرد بانو کو اپنے پاس دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور زیر لب کہا'' کہ آج تین خوشی کی باتیں ایک ساتھ پیش آئیں' ایک ننھی منی کی ولادت' دوسری بانو کا بستر علالت چھوڑ کر میرے پاس آنا اور تیسری یہ کہ خود میرا بخار ہلکا ہے''۔ اسی اثناء میں اپنی پروردہ دوسری لڑکیوں کو بلا کر بے حد تاکید کی کہ دیکھو خبردار میرے کاغذات کو پوری احتیاط سے سنبھال کر رکھنا ہرگز ان کا ایک پُرزہ ضائع نہ ہونے پائے۔ لیکن جلد ہی پھر بخار بڑھ گیا اور حواس و ہوش غائب بے ہوشی میں بھی بعض وقت یہی تاکیدی اشارہ اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر مسلسل کرتی رہتی تھیں۔ الغرض موت و حیات کی اس کشمکش میں تیس و اکتیس جنوری کی تاریخیں گزر گئیں' یکم فروری کو یکا یک پھر ہوش و حواس کچھ درست ہوئے' اگرچہ زبان لکنت زدہ ہوچکی تھی...... لیکن مخصوص جبلی خوش اخلاقی کا اس وقت بھی مظاہرہ ہوا جبکہ ایک عزیزہ خاندان کے آنے اور مزاج پرسی کرنے کے جواب میں مسکرا کر ان کے مخصوص خانگی حالات کی بابت لڑکھڑائی ہوئی زبان سے دریافت حال کرنا چاہا مگر ایک آدھ لفظ سے زیادہ

گویائی نے یارانہ دیا۔ اس کے بعد بے چینی میں سر اٹھانے اور بیٹھنے کی کوشش کی۔ والدِ بزرگوار نے فوراً اپنے سینے سے بیٹی کے سر کو سہارا دیا' اور سیال غذا کے دو تین چمچے خاص کوشش سے کھلائے جو کہ ہر دفعہ گلوگیر ہوئے۔ پھر مردہ دلی سے گویا ہوئے ''بی بی! میرا ایک کہنا مانو'' معاً لڑکھڑائی اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں جواب ملا۔ ''آپ کا؟ آپ کا کہنا نہ مانوں گی تو کس کا مانوں گی؟ باپ نے حسرت سے کہا ''کہ ذرا دیر آنکھیں بند کر کے آرام کرو'' (کیونکہ یہ آنکھیں چار پانچ شبانہ روز سے اکثر کھلی رہتی تھیں اور نیند بالکل غائب تھی)۔ جواب میں اچھا کہا اور آنکھیں بند کر لیں والد نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور سب کو خاموشی اور نگہداشت کی تاکید کی۔ آہ یہ کسے معلوم تھا کہ باپ کی شیدا اور جاں نثار بیٹی کے یہ آخری الفاظ ہیں کیونکہ اس کے بجز ایک یا دو بار ''اللہ'' کہنے کے پھر لب نہ کھلے اور باپ سے اظہارِ وفاداری کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ دوسرے روز جمعرات کے دن ۲ فروری ۱۹۲۲ء کی طلوع صبح قلعہ ظفر منزل کے لیے خصوصاً اور دنیائے علم و ادب شعر و سخن اور ملک و قوم کے لیے عموماً ہر دلعزیز قومی شاعرہ ز خ ش کی موت کا پیغام تھی' جن کا خورشید حیات طلوع سحر کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون ۔ چھوٹے بھائی داؤد احمد خان نے بہن کے عالم نزع میں سرہانے کھڑے ہو کر نہایت صبر و استقلال کے ساتھ' یٰسین خوانی کی اور بالآخر اس دیسی کپڑے کی چادر ان کے تنِ بے جان پر ڈال دی جس کو انہوں نے مرض الموت سے صرف گیارہ روز پیشتر تحریک سودیشی پر عملی اقدام کا فیصلہ کرتے ہوئے بڑے شوق سے اپنے لباس کے لے خرید ا تھا۔''......۲۰

زخ ش نے اسی کمرے میں وفات پائی جس میں اپنی ۲۷ سالہ عمر کا زیادہ عرصہ گزارا تھا۔ یہ ظفر منزل کی زنانہ حویلی میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جو ان کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اس کمرے میں وہ مطالعے اور تحریری مشاغل میں مصروف رہتیں۔ اسی گوشۂ تنہائی میں انہوں نے شعر و سخن کی اپنی دنیا آباد کر رکھی تھی جس میں ان کی ساتھی مرحومین کی یادیں تھیں اور ان کی کتابیں تھیں۔ ان کی آخری آرام گاہ ضلع علی گڑھ میں بھموری کے آبائی قبرستان میں ان کی والدہ کی قبر کے قریب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رسالہ شریف بی بی، لاہور ۔۲۲ مئی ۱۹۱۴ء
۲۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۱۴۰-۱۴۱۔ انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدر آباد دکن۔
۳۔ انیسہ خاتون شروانیہ کو خط ۔ بتاریخ ۹ رمضان المبارک ۱۳۲۸ھ ۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے
۴۔ انیسہ خاتون شروانیہ کو خط ۔ بتاریخ ۲۴ جنوری ۱۹۱۲ء ۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے
۵۔ خط احمدی بیگم نکہت کا لیلیٰ بانو کو خط ۔۲۶ اپریل سال نہیں دیا ہے۔ غیر مطبوعہ، کاپی محفوظ ہے۔

۶۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط ۔ بتاریخ ۱۹ مئی ۱۹۱۸ء۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۷۔ شریف بی بی ، لاہور۔ شمارہ ۲۲ مئی ۱۹۱۴ء۔ صفحہ نمبر ۴

۸۔ انیسہ خاتون شروانیہ کو خط ۔ بتاریخ ۲۵ جولائی ۱۹۱۷ء ۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۹۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط ۔ بتاریخ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۲ء۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۰۔ انیسہ خاتون شروانیہ کو خط ۔ بتاریخ ۱۷ جنوری ۱۹۱۴ء ۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۱۔ حیات زخ ش ۔ صفحہ نمبر ۱۱۳۔ انیسہ خاتون شروانیہ ۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ، چھتہ بازار حیدر آباد دکن۔

۱۲۔ روزنامچہ زخ ش ، بتاریخ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء، غیر مطبوعہ کاپی محفوظ

۱۳۔ حیات زخ ش ۔ صفحہ نمبر ۱۱۵۔ انیسہ خاتون شروانیہ ۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ، چھتہ بازار حیدر آباد دکن۔

۱۴۔ انیسہ خاتون شروانیہ کو خط ۔ بتاریخ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ء۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۵۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط ۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۶۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط ۔ غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۷۔ ہارون خان شروانی کو خط ۔ بتاریخ ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۱ء ۔ غیر مطبوعہ، کاپی محفوظ ہے

۱۸۔ روزنامچہ زخ ش ، بتاریخ ۹ نومبر ۱۹۲۱ء (۸ ربیع الاول)، غیر مطبوعہ کاپی محفوظ

۱۹۔ روزنامچہ زخ ش ، بتاریخ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۱ء، غیر مطبوعہ کاپی محفوظ

۲۰۔ حیات زخ ش ۔ صفحہ نمبر ۱۵۰ سے ۱۵۳۔ انیسہ خاتون شروانیہ ۔
مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ، چھتہ بازار حیدر آباد دکن۔

زاہدہ خاتون شروانیہ کی شخصیت اور ان کی وفات پر اہل قلم کے تاثرات

زخ ش کے روزنامچے، خطوط اور ان کے اعزاء کے مضامین سے شخصیت کا جو تصور ابھرتا ہے اس میں وہ انتہائی محبت کرنے والی، پرخلوص، حساس، زود رنج مگر صابرو قانع خاتون نظر آتی ہیں۔ ان کے سراپا کے بارے میں ان کی بھانجی مدیحہ خاتون نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

''مجھے اپنی والدہ احمدی بیگم نکہت جو زاہدہ خاتون کی بڑی بہن تھیں اور کچھ ذاتی لواحقین اور مقربین سے معلوم ہوا۔ وہ کچھ اس طرح ہے۔ زاہدہ خاتون نزہت کا قد درمیانی، چھریرا بدن اور صبیح رنگ تھا۔ ذہین اور بڑی آنکھوں میں سرخی کی جھلک تھی۔ نگاہ نیچی رکھتی تھیں اور زیادہ تر سوچ میں غرق رہتی تھیں۔ عام طور پر چوڑی دار پاجامہ پہنتیں اور سر ڈھکا رہتا۔ تنہائی اور خاموشی پسند تھیں۔ بزرگوں سے احترام اور بچوں سے محبت سے پیش آتیں۔ خاص عزیزوں کی بچیوں کے لئے خود گڑیاں بنا کر اور کپڑے سی کر دیتی تھیں۔ عام طور پر رات کو دیر تک لیمپ کی روشنی میں پڑھنے کی وجہ سے آشوب چشم کی شکایت رہتی تھی جس کا ذکر اپنی دوستوں کے خطوط میں کرتی تھیں۔ فطرتاً شہرت سے گھبراتیں اور گوشہ گیری پسند کرتی تھیں۔ اگر گھر میں کبھی خواتین کی کوئی محفل ہوتی اور لوگ گفتگو میں مشغول ہوتے تو زاہدہ ایک طرف بیٹھی آہستہ گنگناتی معلوم ہوتیں۔ پھر تھوڑی دیر میں اپنی ایک خاص معتمد لڑکی کیتی بانو (جس کو انہوں نے خود پڑھایا تھا) کو بلا کر پوری غزل یا نظم لکھوا دیتیں۔''......١

مدیحہ خاتون ایک اور مضمون میں ان کے سراپے اور بچپن کو یوں بیان کرتی ہیں۔

''زاہدہ خاتون بچپن سے ہی نہایت کمزور نحیف الجثہ واقع ہوئی تھیں لیکن قطعاً سنجیدہ، پروقار اور نہایت حساس تھیں۔ بچپن میں ہرلڑکی کی طرح ان کو گڑیوں کا کھیل پسند تھا لیکن اس میں ایک انوکھی جدت گڑیوں کے سجانے کا اہتمام تھا۔ یعنی ایک شیشے کی الماری کے مختلف خانوں کو کلاس روم بنایا جاتا تھا اور اس کے ایک حصے میں برقعہ پوش گڑیاں اور دوسرے حصے میں سیاہ شروانی اور ترکی ٹوپے پہنے گڈے پڑھائی کرتے ہوئے سجائے جاتے تھے۔ تاش کھیلنے کا شوق تھا لیکن اس میں بھی تعلیمی تاش پسند تھے۔''......٢

زخ ش کی شخصیت خیالات، جذبات، احساسات اور زندگی کو برتنے کے لیے ان کے رویوں کو سمجھنے میں لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھے ہوئے اُن بے شمار اور مسلسل خطوط سے بہت مدد ملتی ہے جو انہوں نے ١٩١٦ء سے اپنی وفات تک

لکھے۔ان دستیاب خطوط میں ایک خط خود لیلیٰ خواجہ بانو کا بھی ہے جو ستمبر ۱۹۱۶ء کو زخ ش کے خط خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی عمر ۱۷ برس بتائی ہے اور بہت سادگی سے اپنے دن بھر کے مشاغل کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

''آپ مجھ سے ایک سوال کرتی ہیں تو میں دس پانچ جواب دیتی ہوں۔ سنیئے میری عمر سترہ سال کی ہے۔ میں خواجہ صاحب کے خاندان سے ہوں۔ میری والدہ اور خواجہ صاحب کی پہلی بیوی سگی بہنیں تھیں۔ حور بانو (خواجہ صاحب کی پہلی بیگم سے بیٹی) نے میری والدہ یعنی اپنی خالہ کے ہاں پرورش پائی ہے۔ میرے عقد کو یہ دسواں مہینہ ہے۔ میں اس بستی کے باہر رہتی ہوں جس میں میرے خاندان کے سب لوگ آباد ہیں۔ میرا گھر درگاہ کے قریب ہے۔'' (مکمل خط دیکھئے، ضمیمہ نمبر ا)

اس طرح لیلیٰ بانو زخ ش کی تقریباً ہم عمر تھیں اور انہیں کی طرح صاف گو اور سوچ وفکر رکھنے والی۔ چنانچہ زخ ش نے بہت بے تکلفی سے اور پورے اعتماد کے ساتھ انہیں اپنے ذاتی خانگی اور فکری زندگی میں شریک کرلیا اور وہ سب کچھ ان خطوط میں لکھ دیا جن سے ان کی مکمل شخصیت پر سمجھا جاسکتا ہے۔

اپنے سراپا کے بارے میں انہوں نے بھی تذکرۂ لیلیٰ خواجہ بانو کو ایک خط میں لکھا ہے۔

''اچھا بہن اصل نازنین اگر جواب میں دیر ہونے سے خاطر نازک مکدر ہو تو معافی۔ خوامخواہ لوگوں نے مجھے محض لمبی اور موٹی نہ ہونے کی بناء پر نازک سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ نزاکت کا تعلق مزاج سے ہوتا ہے۔''......۳

انیسہ خاتون نے بھی ملتا جلتا سراپا بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ خاندان کی دیگر لڑکیوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ذہانت' سنجیدگی' بردباری' فہم وفراست' باضابطگی ان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ وہ بے حد حساس تھیں۔ خلاف مزاج باتوں پر ملال ہوتا تھا مگر غصے یا جوش میں نہیں آتی تھیں۔ بہت عالی حوصلہ اور فخر وغرور سے پاک تھیں۔ وہ انہیں شگفتہ اخلاق کی تصویر لکھتی ہیں۔

''زاہدہ خاتون کم سخن' کم خوراک' کم خواب اور کم آمیز خاتون تھیں۔ تاہم ان کے اخلاق اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ عزیز و اقربا کے علاوہ جن کا بھی ان سے تعلق تھا محبت' ہمدردی اور توجہ سے پیش آتی تھیں۔ ان کی باتیں پورے خلوص سے سنتیں اور جہاں ضرورت ہوتی مشورے اور تعاون سے نوازتیں۔ ہر اس فرد سے جن کا ان سے ذاتی یا قلمی رابطہ تھا۔ اتنا لگاؤ رکھتی تھیں کہ ان کی تکالیف پر خود بھی رنجیدہ ہوجاتی تھیں۔ عام طور سے وہ محویت اور استغراق کے عالم میں رہتی تھیں۔ خصوصاً مطالعے کے وقت گردوپیش سے بالکل غافل ہوجاتی تھیں اور جب تک اس سے فارغ نہ ہوجائیں کسی سے

مخاطب نہ ہوتی تھیں۔ یہ اس عالم استغراق شاعری کے نزول کے وقت غیر معمولی محویت میں تبدیل ہوجاتا ایسے میں انہیں اگر کوئی آواز دے تو بڑی مشکل سے سن پاتیں اور اگر چونک کر متوجہ بھی ہوجائیں تو یوں محسوس ہوتا کہ ذہنی طور پر وہ بالکل حاضر نہیں ہیں۔ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتی ہوتی تھیں اور سنتے ہوئے سنتی نہیں تھیں۔اگر چہ ماحول اور اردگرد کے لوگوں سے بالکل لاتعلق اور بے خبر سی نظر آتی تھیں پھر بھی جب وہ لکھتی تھیں تو ماحول کے تمام جزیات کو تحریر میں پیش کرتی تھیں۔ وہ گھنٹوں محو بیٹھی بظاہر گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا جب وہ شعری تخلیق میں مصروف ہوتی تھیں۔ اپنے اشعار کو وہ ذہن میں محفوظ رکھتیں اور بعد میں کاغذ پر منتقل کرواکر ترتیب اور نظر ثانی کرتیں۔ چہل قدمی بھی ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا وہ خاموشی کے ساتھ عالم محویت میں ٹہلتے ہوئے اشعار کہتیں اور پھر اسے لکھوالیتیں۔خود پڑھنے کے علاوہ دوسروں کو بھی تعلیم دینا پسند کرتی تھیں۔ عام طور سے گفتگو کی محفل سے اجتناب کرتیں لیکن جہاں علم و ادب اور شعر وسخن کی باتیں ہوتیں وہاں توجہ سے گفتگو میں حصہ لیتیں۔ ادب اور سیاست پر ان کی گفتگو ان کے بھائی اور والد سے ہوتی تھی۔ چونکہ وہ ہر معاملے میں اپنی رائے رکھتی تھیں اس لیے وہ دوسروں کو بھی اس پر قائل کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور عموماً اس میں کامیاب بھی ہوجاتی تھیں۔ خاندان کی دوسری لڑکیاں ان کی علمیت سے مرعوب تھیں۔۔۔۔۔تفریحات میں تاش کا بہت شوق تھا اور کبھی کبھی بہن بھائیوں اور شاگرد لڑکیوں کے ساتھ اس سے دل بہلایا کرتی تھیں۔''......۴

تاش کے کھیل کا ذکر ان کے خط میں بھی آیا ہے۔۴فروری ۱۹۲۱ءکو لیلیٰ بانو کو لکھتی ہیں۔

''کل دوپہر کے قریب تمہاری مرسلہ تصویر ملی۔ میں اس وقت بہنوں کے حلقے میں بیٹھی تاش کھیل رہی تھی سب نے بہ کمال اشتیاق کاغذی حجاب کو چاک کرکے اس دلکش چیز کو بے نقاب کیا۔''

اس خط میں اپنے بچپن کی تصویر کا ذکر کرتے ہوئے بھائی احمداللہ خان حیران کو یاد کرتی ہیں۔

''میرے زمانہ طفولیت کی تصویر (جوموجودہ شکل و حالت سے قطعاً مختلف ہے) میرے لیے ایک عجیب چیز ہے۔ اس کی دل کو تڑپا دینے والی خصوصیت یہ ہے کہ ایک میز پر دو بچے اس اختلاط آمیز طریقہ سے بیٹھے ہیں گویا کہ عمر بھر ان کی یکجائی کا یہی عالم رہے گا۔مگر آہ آج صورت واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک کوئے خموشاں میں محوخواب ہے اور دوسری بارگاہ حیات میں مصروف عمل۔''

جس استغراقی کیفیت کا ذکر ان کی دونوں عزیزاؤں نے کیا ہے اس کا خود انہیں بھی احساس تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت کے بارے میں لیلیٰ خواجہ بانو کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

متجاوزالحد ہوکر مجھے پریشان کر رکھا ہے اور اپنی استغراقی کیفیت کو اصلاح طلب نتائج کے ذیل میں یاد داشتوں کے اندر نوٹ کرلیا ہے۔ کیوں کہ بارہا ایسا ہو ہے کہ لوگوں نے مجھ سے شہادت طلب کی ہے کہ فلاں موقع پر تمہاری موجودگی میں یہ بات کہی گئی تھی یا نہیں اور مجھے ندامت کے ساتھ کہنا پڑا کہ میں اس وقت باہمہ اور بے ہمہ کی حیثیت سے شریک صحبت تھی۔''......۵

زخ ش کے مزاج میں ایک طرح کی شوخی اور لطیف حس مزاح بھی تھی۔ زندگی میں جب بھی خوش ہونے کا موقع آیا۔ اس کا اظہار بھی بڑی لطافت کے ساتھ کیا۔۱۰ اگست ۱۹۱۸ء کو لیلیٰ خواجہ بانو کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''آپ نے موسم بدلنے پر آنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس لیے میں قحط زدہ اشخاص کی طرح ہر وقت بارش کی دعا کیا کرتی ہوں اور بعض وقت تنگ آ کر یہ شعر پڑھنے لگتی ہوں۔

تمہیں جانو تمہیں سمجھو وہ کیوں اتنا پریشاں ہے
بتائے داغ مضطر کیا سبب کیا وجہ کیا باعث ''

اس شعر کو پڑھ کے خواجہ بانو نے کوئی چبھتا ہوا جملہ لکھا ہوگا۔ جس کے جواب میں وہ لکھتی ہیں۔

''داغ مرحوم کی تعریف کی بابت کچھ نہ پوچھو، لمبی کہانی ہے۔ بس اتنا کہے دیتی ہوں کہ اس شیریں زباں سخن درکار نگ، میری طبیعت سے بالکل مخالف واقع ہوا ہے۔ اس لیے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر میری زندگی میں دو سال قبل جو انقلاب برپا ہوا اس نے ہر اس چیز کو جو میرے پیارے کو پیاری تھی میرا محبوب مشغلہ بنادیا ہے۔ ہمارے درمیان قومی، سیاسی، خانگی معاملات میں اگر اتفاقیہ ایک آدھ اختلاف تھا تو وہ اس انقلاب نے مٹادیا۔ اس پرانی کہاوت کی تصدیق ہوگئی کہ ''لال پیارا تو لال کا خیال پیارا''۔ ذاتی طور پر مجھے تعلق خاطر صرف اس زندہ جاوید شاعر سے ہے جس کی خوابگاہ آپ کے پڑوس میں واقع ہے۔''

پڑوس میں تو غالب کی قبر کی طرف اشارہ ہے لیکن اس خط میں جس کی محبت نے انہیں داغ کی طرف متوجہ کیا وہ ان کے بھائی حیران ہی ہوسکتے ہیں کہ دو سال قبل ۱۹۱۶ء میں انہی کا انتقال ہوا تھا۔ دوسری بات کہ سیاسی اور خانگی معاملات میں دونوں بہن بھائیوں میں بہت زیادہ ہم آہنگی تھی۔ ہوسکتا ہے حیران کو داغ کی شاعری پسند ہو۔ وہ خود غالب

اور اقبال کو پسند کرتی تھیں۔ مگر جیسا کہ اس خط میں ہے کہ حیران کی وفات کے بعد ان کی یاد نے انہیں ہر اس شخصیت سے قریب کردیا جس کی خاطر انہیں عزیز تھی اور یہ صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ایسا نظر آتا ہے کیونکہ داغ کی شاعری سے ان کا لگاؤ بڑھتا گیا۔ داغ سے ان کی انسیت بڑھتی گئی۔ ایک غزل بھی انہوں نے داغ کی زمین میں کہی اور ۵ مارچ ۱۹۲۱ء کو ایک اور خط میں لیلیٰ بانو کو لکھتی ہیں۔

''نظر کے سامنے تمہارے دو جواب طلب خطوط ہیں اور ہاتھ میں اعتراف کوتاہی کرنے والا قلم اگر کوئی ٹیلیفون خفتگان خاک سے گفت وشنید کراسکتا تو میں داغ مرحوم سے انقلابِ مذکور کی عظمت کا اعتراف کروائے بغیر نہیں رہتی۔ کیوں کہ انہوں نے ایک بار اپنے دوست کی بابت لکھا۔

تو مجھ پہ شیفتہ ہو ، مجھے اجتناب ہو

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو ''

اس شعر کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ ہمیشہ زخ ش نے لیلیٰ خواجہ بانو سے خط کا جواب جلد نہ دینے کی شکایت کی ہے۔ لیکن جب خود انہیں دو خطوط کے جواب نہ ملنے پر لیلیٰ خواجہ بانو نے شکایتی خط لکھا تو یہ فقرے اور شعر بے ساختہ ان کے قلم سے نکلے۔

ان کی خوش طبعی کی ایک اور مثال اُس خط میں ہے جو انہوں نے ۱۰ اگست ۱۹۱۸ء کو لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھا۔ ان کی بہن احمدی بیگم نے لیلیٰ خواجہ بانو کو ایک خط میں زخ ش کی نسبت طے ہونے کے بارے میں لکھ دیا تھا۔ لیلیٰ خواجہ بانو نے منگیتر موصوف کی تصویر کی فرمائش کردی ہوگی۔ جواب میں وہ لکھتی ہیں۔

''میں نے نکہت صاحبہ سے تو اس بارے میں کچھ کہا سنا نہیں ہاں خود ایک قلمی تصویر کھینچ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔ دیکھئے اور میری مصوری کی داد دیجئے۔ سب سے اوپر ایک کاسۂ سر ہے۔ اس کے نیچے ایک پیشانی ہے۔ پھر دو آنکھیں ہیں۔ پھر ایک ناک، پھر دونوں ہونٹ، پھر ایک ٹھڈی۔ مزید تشریح کے لیے لکھتی ہوں کہ چہرہ ریش و بروت سے مبرا نہیں ہے اور اسکے اطراف میں دو کان بھی موجود ہیں۔ کیوں؟ اس فوٹو میں خاص خوبی یہ ہے کہ کسی مخصوص فرد بشر سے یا ذات سے منسوب نہیں اور اس بات سے آپا جان والی تصویر محروم ہے۔ اس کے نقش باطل ہوجانا کلک قدرت کی ایک جنبش پر منحصر ہے۔''

اسی طرح اپنی بہن نکہت کی شادی طے ہوجانے کا تذکرہ بھی پوری شوخی کے ساتھ کرتی ہیں

۲۱فروری ۱۹۱۸ء کو لیلیٰ خواجہ بانو کو خط میں لکھا۔

''جس وقت آپ کا خط آیا۔ اتفاقیہ یہاں شادی بیاہ کا ہی ذکر مذکور درپیش تھا۔

مگر کس کی شادی؟ آپ کے سرعزیز کی قسم آپا جان کی اور صرف آپا جان کی۔

کیسی اسیری؟ کہاں کی نظربندی؟؟ آزاد ہی کون ہے جو اسیر کیا جائے۔ جامہ ندارم دامن از کجا آرم؟۔
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

''۔۔۔۔۔کان مشتاق ہیں''۔ لیلیٰ للہٰ ایسی باتیں نہ کرو۔ تم کیا جان سکتی ہو؟ تمہیں کیا خبر ہے؟ ہائے بہن! میری زبان نہ کھلواؤ میں اس کے متعلق ایک حرف نہیں لکھ سکتی اور کسی صورت سے نہیں لکھ سکتی۔ میرا مستقبل ،اس کے متعلق آپ مہربانی کرکے کوئی سوال نہ کریں۔ یہ باتیں لکھنے کی نہیں۔ آپا جان کی شادی اپنے ننھیال (بوڑھ گاؤں میں ایک خوش خصال نوجوان سے عنقریب ہونے والی ہے)۔''

خوشی کے لمحات ان کی زندگی میں جس طرح جھلک دکھا کر گم ہوجاتے تھے اسی طرح تحریروں میں بھی کہیں کہیں پوری طرح ایک لمحاتی کیفیت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ لیلیٰ خواجہ بانو کے آنے کی خبر سن کر ان سے زیادہ قیام کا اصرار بہت خوبصورت جملے میں کرتی ہیں۔ ۲۷اگست ۱۹۱۸ء کو لکھتی ہیں۔

''اتنی عرض اور ہے کہ آپ یہاں آگ لینے کے لیے نہ آئیں کیونکہ پیغمبری دینے کا یہاں کسی کو اختیار نہیں۔''

لیلیٰ خواجہ بانو جب ان کے ہاں قیام کرکے واپس جاتی ہیں۔ تو ان کو اور ان کے ننھے بچے حسین کو یاد کرکے لکھتی ہیں۔

''اس کی پیاری پیاری طفلانہ ادائیں ہر وقت یاد آ آ کر دل کو بیتاب کرتی ہیں۔''

۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے اسی خط میں لیلیٰ خواجہ بانو سے اپنی پرخلوص محبت کا اظہار اس طرح کرتی ہیں۔

''پیاری لیلیٰ تم نے ہرگز میری محبت کی تصویر نہیں دیکھی اور نہ میرے الفاظ جذبات دل کی ترجمانی کا حق ادا کرسکے۔ تم کیا جانو کہ میرے کوزۂ دل میں دریائے محبت خدا نے کس طرح بند کردیا ہے۔ اس کا حال تو صرف امتحان کا موقع آنے پر ظاہر ہوگا۔ ہم کیسے ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ کچھ بھی نہیں کہتے۔ وقت آنے دو۔ وقت آنے دو۔ ہم تم کو بتادیں گے۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ تم اپنا دل رواروی میں یہیں چھوڑ گئیں۔ اب وہ تمہیں کبھی واپس نہیں ملے

گا۔ بھلا ایسا بے وقوف کون ہے جو آیا دھن پھیر دے۔ اُف کچھ نہ پوچھو ملاقات کا زمانہ اک طلسم تھا جو آناً فاناً ٹوٹ گیا اور چشم تحیر دیکھتی رہ گئی۔''

وہ اپنی اس عزیز سہیلی کو ہر خط میں مختلف القاب سے یاد کرتی ہیں۔ خطوط کا جو سلسلہ ۱۸ اگست ۱۹۱۶ء کو محترمہ خولجہ بانو صاحبہ سے شروع ہوا تھا۔ ملاقات کے بعد خط کے موضوع کی مناسبت سے زیادہ بے تکلف القابات میں بدلتا گیا۔ مثلاً خواہرمہرباں، خواہر فراموش کار، میری بدگمان دوست، پیاری لیلیٰ، دلنشیں لیلیٰ، پیاری ستم شعار، جلد گھبرا اٹھنے والی، بیمار آنکھوں والی، نزہت نواز، نزہت نواز، سرمایہ راحت، میری اپنی لیلیٰ وغیرہ۔ ایک خط میں جب لیلیٰ بانو، خواجہ حسن نظامی کے سفر میں ہونے پر پریشانی کا اظہار کرتی ہیں۔ تو زخ ش انہیں بڑی محبت سے سمجھاتی ہیں۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے خط میں ان کا یہ انداز دیکھئے۔

''مجنوں نواز لیلیٰ

خدا تمہارے پردیسی کو خیریت سے گھر لائے۔ لیلیٰ مجنوں نہ بنو۔ بھلا خواجہ صاحب اور تمہارے خلجان کی پروا نہ کریں۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ خدا پر بھروسہ رکھو جو دہلی میں بھی ہے اور کاٹھیاوار میں بھی۔''

خطوط کے اختتام پر اپنے نام کے ساتھ بھی اسی طرح بدلتے ہوئے الفاظ اس موقع کی جذبات و حالات کی مناسبت سے لکھتی ہیں۔ مثلاً پہلے خط میں عاجزہ زاہدہ خاتون شروانیہ، پھر ناچیز زاہدہ اور بے تکلفی بڑھتی گئی تو الفاظ بھی بے تکلف ہوتے گئے۔ مثلاً دل سے لاچار، محبت کیش، آپ کو یاد کرنے والی، خیر طلب، دورافتادہ زاہدہ، تمہاری ستائی ہوئی، متمنی ملاقات، ۔ ایک خط میں اپنا نام نادر خاتون شروانیہ لکھا ہے۔ چند خطوط میں زاہدہ خاتون شروانیہ۔ ایک جگہ وہی تمہاری نزہت اور زیادہ میں صرف زاہدہ لکھا ہے۔ ان القابات سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں جذبات کے اظہار پر کتنی قدرت تھی۔ خط کہیں بھی کٹے پھٹے نہیں ہیں جبکہ زیادہ تر خطوط میں املادی گئی ہے۔ کچھ اپنی تحریر میں بھی ہیں۔ چند احمدی بیگم نکہت کی تحریر میں ہیں اور زیادہ تر ان کی شاگرد بانو کی تحریر میں املا کرائے گئے ہیں۔ ان کے جذبات کی گہرائی اور خلوص کی شدت املا میں بھی اسی طرح ہے جس طرح تحریر میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی تخلیقی اُپج ان خطوط میں بھی نمایاں ہے جہاں تک نام تبدیل کرنے کا معاملہ ہے اس سلسلے میں بھی ان کے خطوط سے مکمل پتہ چلتا ہے کہ وہ کن حالات اور پریشانیوں کی وجہ سے ایسا کررہی ہیں ۔ ۲۱ اگست ۱۹۱۹ء کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''بہن مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استانی میں مضمون لکھنے کے لیے ایک خاص لفظ اپنے واسطے مقرر کرلوں مثلاً ''علی گڑھ کی ایک سخن گو خاتون'' (بخدا یہ لفظ اپنے قلم سے لکھتے ہوئے مجھے بہت شرم آتی ہے) یا اسی کے ہم معنی

الفاظ تم یا خواجہ صاحب اپنی طرف سے مقرر کر دو۔''

وہ ۵ مارچ ۱۹۲۱ء کو ایک اور خط میں لکھتی ہیں۔

''علی گڑھ میں ہم تھے۔ مصروفیات حیات تھیں۔ میزبانی تھی۔ مہمانی تھی۔ زخ ش کے حروف مقطعات کا تجسس تھا۔ نرم گرم پارٹیوں کی کشتم کشتا تھی۔ دونوں کی جدا جدا نمائش تھی۔ غرض بہت سی قابل ذکر باتیں تھیں۔''

اگرچہ وہ خواجہ صاحب کی بہت عزت کرتی تھیں لیکن جہاں ان سے اختلاف ہوتا اسے بھی تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے لکھ دیتیں۔ وہ اختلاف رائے یا ذاتی رنجشوں کی بنیاد پر کسی کے لیے بھی دل میں کینہ نہیں رکھتی تھیں۔ جو بات سچ ہو کہہ دیتی تھیں۔ کئی مرتبہ بہت احترام کے ساتھ خواجہ صاحب سے بھی اختلاف کیا ہے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''خواجہ صاحب انقلابِ مدرسۃ العلوم سے خوش ہیں تو کوئی تعجب نہیں قریب قریب تمام حزب الاحرار کا یہی خیال ہے۔ مگر میں (جو دیہاتی آب و ہوا کے درمیاں حریت کی دھیمی سے ضو سے بھی محروم ہوں اور باایں ہمہ احرار کی بعض زنانہ نشستوں پر بھیکم پور کی چار دیواری میں نکتہ چینی کیا کرتی ہوں) ان سے مختلف الرائے ہوں۔ خواجہ صاحب کا یہ فرمانا کہ فرعونیت کا سایا دور ہوا، بہت دلکش، بہت ہی خوش آئند اور بہت ہی مطبوع طبع ہے۔ آہ کاش صورتِ معاملات اس فقرے سے متحد ہوتی۔ کاش سایۂ فرعون دور ہونے کے بعد کالج قائم رہ سکتا۔ جس خوش گوار توقع کے نشے میں حق پرست خواجہ صاحب انقلاب کے جانبدار بنے ہیں۔ افسوس کہ اس کی حقیقت ایک شیریں خواب سے زیادہ نہیں۔ ہمارے کالج کے حالات و معاملات عام مدارس سے مختلف ہیں اور اس کے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا موجودہ صورت برقرار رکھے یا ورطۂ فنا میں پھنس جائے۔''

ایک اور خط میں وہ انقلاب اخبار پر تنقید کرتی ہیں جبکہ ان کو اندازہ تھا کہ خواجہ حسن نظامی ہی کی ملکیت ہے۔ ایک خط میں انہوں نے اپنی نظم کے لیے یہ الفاظ لکھے تھے۔

''اگر انقلاب پر خواجہ صاحب کو مالکانہ حقوق حاصل ہوں تو گمنام یا ایک دردمند قوم کے نام سے شائع کروادیں۔''

اس کے باوجود وہ انقلاب اخبار پر تنقید کرتی ہیں اور ایک اور خط میں لکھتی ہیں۔

''انقلاب کی جس حرکت نے میرے دل کو اذیت دی وہ مولوی ظفر علی خان کی تحقیر و توہین تھی۔ مانا کہ بہ فرض محال وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ اُن کی نیت اچھی نہیں ہے۔ اردو نظم و نثر پر ترقی علوم پر قوم کی بیداری پر اُن کا ذرا برابر کوئی احسان نہیں ہے مگر از برائے خدا مجھے بتانا کہ کیا تعلیمِ محمدی اجازت دیتی ہے کہ ایک گوشہ نشیں مردِ مسلماں کی اس طرح اعلانیہ ٹوپی اتاری جائے۔ اس طرح سوکام چھوڑ کر اس کی جائز و ناجائز ہتک و اعانت کی جائے۔ ایسی محسن کش بد اخلاق قوم پر جتنی تباہی آئے کم ہے۔''

اسی طرح ایک مرتبہ جب ان کے والد نے خواجہ صاحب کی فرمائش پر کسی محترمہ والی ریاست (امکان ہے کہ وہ بیگم بھوپال تھیں) کی میزبانی سے انکار کردیا تو انہوں نے بڑی صاف گوئی سے لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھا۔

''اس وقت ابویا سفر کے لیے کمر باندھے بالکل تیار تھے اور محاورۃً کہہ سکتی ہو کہ کھڑے کھڑے جھک کر جواب لکھ دیا۔ وہ کئی یوم کے لیے باہر جانے والے تھے۔ زنان خانے میں بھی اس وقت ہماری بزرگ خواتین کا اجتماع تھا۔ ایسی حالت میں والیانِ ریاست کی مہمان داری خواہ ایک گھنٹے کی ہی ہو۔۔۔۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگوں میں خاندانی تعصب اور پابندی رواج درجۂ نقص تک پہنچی ہوئی ہے۔ مجھے اعترافِ حقیقت میں دشمنوں کے سامنے بھی تامل نہیں ہوسکتا آپ تو عزیز ترین دوست ہیں اس لیے آپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ ہونا چاہیئے اور ہم جن مشکلات میں مبتلا ہے ان کے متعلق ہمدردی کرنا اور آسانی بہم پہنچایا چاہیئے۔''

اسی سلسلے میں اپنے اگلے خط میں ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لکھتی ہیں۔

''میں خیال کرتی ہوں کہ اگر تم کسی ملاقات میں بیگم صاحبہ پر اشارۃً یہ امر واضح کردو تو اچھا ہے کہ ہمارے ہاں دوشیزہ لڑکیاں ہر کسی سے آزادانہ میل جول نہیں رکھ سکتیں۔ مگر یہ ظاہر نہیں کرنا کہ اس فقرے کا روئے سخن ان کی طرف ہے۔''

دوستوں کی دلداری اور عزیزوں سے شدید محبت کا اظہار ان کے خطوں میں نظر آتا ہے۔ ان کی سہیلی رابعہ خاتون جن سے پرخلوص خط و کتابت کا رابطہ تھا۔ طویل بیماری میں مبتلا ہوکر انتقال کر گئیں۔ رابعہ خاتون کو لکھے جانے والے خط دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن انیسہ خاتون اور لیلیٰ خواجہ بانو کو جو خط لکھے ہیں۔ اُن سے رابعہ خاتون سے ان کی محبت اور رابعہ خاتون کی ان سے چاہت کا پتہ چلتا ہے۔ انیسہ خاتون کو ۱۶ جنوری ۱۹۱۸ء کو لکھتی ہیں۔

''ارے ہماری رابعہ پیاری کا مدت سے خط نہیں آیا۔ دن رات ان کی طرف سے بہت پریشانی اور خفقان

لاحق رہتا ہے۔ اصل میں میری شامتِ اعمال کا قصور ہے۔ جس سے محبت کرتی ہوں وہی مبتلائے مسائل و آفات رہتا ہے۔ چونکہ مجھے رابعہ سے محبت ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے اس لیے وہ بیچاری تکالیف اور صعوباتیں گوناگوں کا شکار رہتی ہے۔''

رابعہ خاتون کی بیماری سے پریشان ہوکر ۲۹ مئی ۱۹۱۸ء کو لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھتی ہیں۔

''لیلیٰ میری رابعہ کے لیے دعا کرو ان کے پیٹ پر ایک اندیشناک آپریشن ہونے والا ہے نہایت پریشان ہوں۔''

رابعہ خاتون کی وفات کے بعد ۱۳ فروری ۱۹۱۹ء کو ایک اور خط میں لکھتی ہیں۔

''آہ لیلیٰ رابعہ نے مجھے بڑا دکھ دیا۔ مجھ سے بڑے خلوص کا برتاؤ کیا۔ میرے دل میں بڑی قدر بڑی منزلت پیدا کی اور پھر آخر میں سخت دغا دی۔''

رابعہ خاتون سے یہ محبت تا عمر برقرار رہی۔ ان کے شوہر کے انتقال کی خبر پڑھی تو اپنے روزنامچے میں ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو لکھتی ہیں۔

''اس کا عزیز شوہر طاہر علی خان انجینئر حیدرآباد دکن جس کی وفات کی ابھی ابھی اخبار تہذیب نسواں نے خبر دی ہے۔ بیوی کے ساتھ نہایت وفادار رہا۔ ایک ضعیف، بیمار صحت کی تلاش میں شہروں شہروں پھرتی رہنے والی بیوی کے ساتھ اب ان مرحوم میاں بیوی کی مشترکہ یادگار ایک بچی طاہرہ رہ گئی ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔''

فاطمہ بیگم ایڈیٹر شریف بی بی کی بیوگی پر لیلیٰ بانو کو لکھتی ہیں۔

''فاطمہ (شریف بی بی) کی بیوگی کا حال شاید تم نے زمیندار میں دیکھا ہوگا۔ مجھے اس حادثے کا دلی صدمہ ہے اور مجھ سے زیادہ آپا جان کو جن کی فاطمہ سے گہری دوستی ہے۔''

اسی طرح اپنی معلّمہ فرخندہ بیگم طہرانیہ کا ذکر ہمیشہ محبت سے کرتی ہیں اور جب وہ آخری عمر میں ہوش سے بیگانہ ہوگئی تھیں تو اس افسوس کا اظہار انہوں نے لیلیٰ خواجہ بانو سے ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کے خط میں کیا۔

''آپ افسوس کریں گی کہ ہماری مایہ ناز معلّمہ صاحبہ کے دل و دماغ نے عمر بھر کی رفاقت کے بعد آخری وقت میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ آٹھ ماہ قبل کا ہے۔ ہم سے جہاں تک ہوسکا علاج و نگہداشت میں سرگرم کوشش کی۔ کیونکہ یہ ہمارا ایک مقدس فرض تھا۔ مگر افسوس خلل دماغ یومن فیومن بڑھتا گیا۔ ان کی منہ بولی بھانجی لیڈی ڈاکٹر شریف

النساء خانم دیکھنے کے لیے یہاں آئیں تھیں۔ بس انہی کے ہمراہ بھوپال چلی گئیں اور خود ان کا خیال تھا کہ تبدیلی آب و ہوا اور ان مزاج شناس بھانجی کے علاج سے ضرور فائدہ ہوگا۔ مگر اب اطلاع ملی ہے کہ حالت بدستور ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک ذی جاں عالی مرتبت اور قابل خاتون کا غربت اور ضعیفی کے عالم میں یہ حشر ہو۔ اس دردناک نظارے سے خدائے تعالیٰ کی شانِ صمدیت کا جلوہ چشم بصیرت کے سامنے نمودار ہوجاتا ہے۔''

دوسروں کا خیال اور ان کی پریشانیوں سے پریشان ہوجانا اور خوشیوں سے خوش ہوجانا۔ ز خ ش کی تحریروں میں ذاتی جذبات و احساسات پر حاوی ہیں۔ تاہم وہ جہاں بھی اپنے بارے میں لکھتی ہیں پوری سچائی اور شدت سے اظہار کرتی ہیں۔ ۱۳فروری ۱۹۱۹ء کا ایک مختصر خط اس کی مثال ہے کہ اس چھوٹے سے خط میں کتنی اداسی اور محبت پوشیدہ ہے۔

''لیلیٰ! عرصے سے بہن تم کو خط نہ لکھ سکی۔ رابعہ کی ناگہانی وفات۔ انیسہ کے ساتھ دتاولی میں تین چار دن کی یکجائی۔ پھر داؤد احمد کے حلقوم پر آپریشن کے خیال نے میری صحت کو خراب کردیا۔ بیمار ہوں اس وقت قلم سے پکڑتے ہوئے نقاہت کے سبب ہاتھ کپکپارہے ہیں۔

۷ادسمبر ۱۹۱۸ء کو اپنے پھوپھی زاد بھائی اور منگیتر کے انتقال کی خبر سننے کے بعد انہوں نے جو خطوط لکھے ہیں وہ ان کے دلی جذبات کا ایسا مرقع ہیں جنہیں مثالی کہا جاسکتا ہے۔ انیسہ خاتون کو لکھا جانے والا خط پچھلے ابواب میں نقل ہے۔ یہاں میں ان دو خطوط کے کچھ حصے نقل کررہی ہوں جو لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط میں ان کی زندگی کا بہت بڑا المیہ رقم ہوا ہے۔ ایک ایسا حادثہ جس نے ایک ذہین قدر شوخ، خوش مزاج، خوش کلام شاعرہ کو مرقع درد و یاس بنا دیا۔ پھر انہیں اپنے دلی جذبات کے اظہار کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ لیلیٰ خواجہ بانو کو بھی اس بارے میں جب لکھا تو خط کو پھاڑ دینے کی تاکید بھی ساتھ رہی۔

۲۳اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لکھتی ہیں۔

''انیسہ اور ان کے بڑے بھائی خاص طور سے علیل ہیں اور غرض عجب تشویش ناک لیل و نہار میں بصر ہورہی ہے۔''

انیسہ کے بڑے بھائی ابد شروانی جو ان کے منگیتر تھے ان کی موت کی خبر زخ ش سے تقریباً ایک ماہ سے زیادہ پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ ۱۸نومبر ۱۹۱۸ء کو لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھتی ہیں۔ جناب موصوفہ (پھوپھی) اور ان کے بڑے صاحبزادے

کی علالت نے تفکر انگیز طول کھینچا تھا۔ مگر آخر خدا نے اپنا فضل کیا۔''

جب انہیں پتہ چلا کہ انس خان ابد انتقال کر گئے تو ۷ادسمبر ۱۹۱۸ء کو وہ لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھتی ہیں۔

''پیاری بہن! آپ کے خط نے مجھے ایک بڑے حادثے کی خبر پہنچائی اور اس ضروری انکشافِ حقیقت پر میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ نے لکھا تھا کہ دتا دلی کی نسبت ایک بری خبر سننے میں آئی۔ اس فقرے نے مجھے چونکا دیا اور میں نے ہر ایک سے اس معاملے میں استفسار کیا۔ آخر الامر وہ المناک راز جسے ابویا نے حیرت انگیز مساعی سے کام لے کر مہینہ سوا مہینہ مجھ سے مخفی رکھا۔ آشکار ہوگیا۔ یعنی مجھے اب عزیز بھائی محمد انس خان کی خبرِ وفات (جس کے سننے کے لیے میں ہرگز تیار نہ تھی) سننی پڑی۔

بہن! ہم بہن بھائیوں کے تعلقات اپنی پھوپھی صاحبہ کی اولاد سے نہایت غیر معمولی یگانگت آمیز ہیں اور ہم سب آپس میں بالکل حقیقی بھائی بہنوں جیسی محبت رکھتے ہیں کیوں کہ میرے والدین کے سگے بہن بھائیوں کی اولاد میں صرف یہی چار نفوس تھے۔ جن میں سے ایک نے ماہِ گزشتہ میں ہمیں داغِ مفارقت دیا۔ علاوہ ازیں بچپن سے مرحوم کے ساتھ اپنے مستقبل کو وابستہ سمجھنے کی وجہ سے دل کو ایک خصوصیت ہوگئی تھی اور یہ ایک نیچرل امر ہے اور خصوصاً اس لیے کہ آہ مرحوم نے جو امید اور ضرورت سے زیادہ توجہ مجھ ناچیز پر صرف کی تھی اور ایسی حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی قدردانی کا ثبوت دیا تھا جو سمجھ میں نہیں آسکتی۔ افسوس میں دریائے ندامت و انفعال میں ڈوب جاتی ہوں جب یاد آتا ہے کہ اس مہمانِ چند روزہ اُس وجود فانی کی بات کا میں نے کبھی جواب ہی نہ دیا اور خیالِ مصلحت وہ خوف رسوائی نے میری مہر خاموشی کو آخر وقت تک نہ ٹوٹنے دیا۔ اب بھی یہی خوفِ رسوائی زیادہ اظہارِ غم نہیں کرنے دیتا اور دل کی بات دل میں رکھنے سے بیمار ہوگئی ہوں۔''

۲۷ دسمبر ۱۹۱۸ء کو پھر لکھتی ہیں۔

''اس کے بعد (بھائی حیران) اگرچہ میری زندگی بے لطف ہوگئی اور ولولہ ہائے شوق کا امتحان ختم ہوگیا مگر پھر میں نے کبھی اپنے مذاق و خیال سے تمام اعزاء کو بری و بیگانہ نہیں سمجھا۔ کیوں کہ ابھی میرے ذراتِ سخن کو آفتاب خیال کرنے والا وجود میرے پیش نظر تھا اور یہ وہی شخص تھا جس نے ہمارے ''کرم فرمائے خاص'' ماہ نومبر میں اپنے پیش رو بھائی کی تقلید کی۔

کو آں وقارِ دانش و آں عزت سخن

دردا کہ رفت قدرِ کمال و ہنر زما ''

اسی خط میں ۲۹ دسمبر کی تاریخ ڈال کر لکھتی ہیں۔

''ابھی ابھی میں اپنے اسی مرحوم بھائی ابد شروانی کے وہ مہذبانہ اور شریفانہ مکاتب اکھٹے کرکے یادگار نادر و نایاب کے طور پر صندوقچے میں رکھ رہی تھیں جو متفرق اوقات میں باُمید جواب مجھے لکھے گئے تھے اور جنہیں خواہرانہ فرض کی یاد دلا کر حروف رسید کی تمنا ظاہر کی گئی تھی۔افسوس لیلیٰ اس وقت خیال مصلحت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی اور میں نے ایسے وجود کی جو پہلے ہی جوش وخروش کی انتہائی حد کو پہنچا ہوا تھا۔ اپنی طرف سے کسی قسم کی حوصلہ افزائی اپنی طرف سے مناسب خیال نہ کی۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا، میں کیا جان سکتی تھی کہ شباب اور قوت کے مجسمے اس قدر جلد اور اس قدر آناً فاناً نابود ہوسکتے ہیں۔ آج جبکہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں خواب خرگوش سے بیدار ہوچکی ہوں۔ نہایت اضطراب اور کمالِ بے قراری کے ساتھ چاہتی ہوں کہ ہر خط کے جواب میں ایک دفتر سیاہ کردوں۔اب میں جواب دینے پر بالکل آمادہ ہوں مگر حیف صد حیف ۔

پشیمانی چہ سود آخر چودر اول خطا کردی ''

زاہدہ خاتون کوشاعری کی صلاحیت خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ انسانیت سے محبت اور حساسیت نے ان میں وہی خصوصیات پیدا کردی تھیں جو صوفی اور شاعر میں مشترک ہوتی ہیں۔ یعنی پیش بینی' اخلاص اور دنیاوی و مادی خواہشات سے بالاتر ہونا۔ وہ مذہب کی طرف مائل تھیں لیکن مذہب کو انسانیت کی فلاح کے حوالے سے اہم سمجھتی تھیں۔مگر مذہبی جذبات کو انتہا پسندی میں بدلتے دیکھ کر کڑھتی تھیں۔ کٹ ملائیت ناپسند تھی اس کا اظہار بھی کرتی ہیں۔اپنے بھائی داؤد خان کی حد سے بڑھتی ہوئی مذہبیت پر ۲۵ جون ۱۹۲۰ء کو ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''بہن! رفتہ رفتہ یہ لڑکا کٹ ملا ہوتا جارہا ہے کیا کیا جائے۔ ڈر ہے کہ یہ جذبہ ہنر سے گزر کر حد عیب میں داخل نہ ہوجائے اور خدانخواستہ توہم پرستی کی شکل اختیار کرلے۔''

۲۸ ستمبر ۱۹۲۰ء کو انیسہ خاتون کے بارے میں لکھتے ہوئے لیلیٰ خواجہ بانو کو بتاتی ہیں۔

''میری یہ مولانا بہن (یہ لقب ان کی عربی دانی اور طول نماز و عبادت پر بہنوں کی طرف سے عطا ہوا ہے) بڑی باکمال خاتون ہیں۔ ایک ادبی شاعر نے غالباً انہی صاحبہ کی نماز کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

یک دو سہ ساعت کشیدم والضآلین

چنانچہ اس وقت بھی عصر کی نماز عادت مستحکم کی بموجب عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہیں۔ بڑی خوش مزاج

ہیں۔ میرے اس شعر سے کو کسی زمانے میں کہا گیا تھا نہایت ہی گرم ہوتی ہیں۔ ــ

زہد سے مجھ کو وہ نسبت ہے جو ایماں سے تجھے
اے صنم زاہدہ کے نام سے بیزار نہ ہو

میں مجبوراً اس کے جواب میں اقبال کا یہ شعر پڑھ کر ان کی عافیت میں خلل ڈالتی ہوں۔

زاہد شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال
خشک ہے اس کو غریق یم صہبا کردے ''

یہ ٹھہری شوخی تحریر وہ خود بھی مذہب کی طرف مائل تھی اور حضور اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت کا بار بار اظہار کرتی تھیں۔ حضور کے اسوۂ حسنہ کی پیروکار ہونے کی خواہش ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے حقوق کی ادائیگی کو اسلام کی بنیادی تعلیم سمجھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی انہوں نے عورتوں کے ساتھ نا انصافی کا شکوہ کیا ہے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ یہ مذہب اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ فرقہ بازی کے بھی خلاف تھیں۔امام حسین سے عقیدت و محبت انتہا پر تھی، اپنی شاعری اور خطوط میں شیعہ سنی تفرقے پر افسوس کا اظہار بار بار کیا ہے۔غریب افراد کی ہر طرح سے مدد کرتیں۔ذاتی خواہشات سے اس قدر کنارہ کش تھیں کہ ایک روز اپنی پاکٹ منی سے دو پیسے کی ترید کرکھالی تو اس پر بھی پشیمانی کا اظہار کیا۔عزیز و اقربا کی ہی نہیں بلکہ جن سے ان کا قلمی رابطہ بھی تھا ان کی تکلیف پر بے چین ہوجاتی تھیں۔ ایک مرتبہ خواجہ حسن نظامی کے مضمون میں ایک ایسی لڑکی کا ذکر پڑھ کے جس کا منگیتر مر گیا تھا وہ لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھتی ہیں۔

''مہربانی کرکے بہت جلد مطلع کرو۔ بدنصیب لڑکی کون ہے۔ اس کا جواں مرد منگیتر کیسا آدمی تھا۔ کیا لڑکی تعلیم یافتہ ہے؟ کیوں اس نے ایسا سخت غم کیا کہ سہاگن بننے کی ہوس دل سے جاتی رہی۔ خواجہ صاحب کے دل تک اس کے جذبات کیوں کر پہنچ گئے۔ اگر مجھے اس کا نام اور حال معلوم ہوگیا تو پنج وقتہ دعائے خیر اس کے حق میں کرتی رہوں گی اور اس راز کو دل کے مخفی کونے میں دفن کرکے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گی۔ خدا نے مجھے ایسا دل دیا ہے جو کسی غمزدہ کی داستان سن کر بے آب مچھلی کی طرح لوٹنے لگتا ہے۔ ــ

سنا ذکر غم اور نکل آئے آنسو
بگاڑی مصیبت نے عادت کچھ ایسی

تمہیں چاہیئے کہ اگر ممکن ہوتو شکستہ دل لڑکی سے ملو۔ اسے تسکین دو اور سمجھاؤ کہ تم خدا اور تمہارے بزرگوں سے مانگنے والا اب دنیا میں نہ آئے گا۔ اگر خدا نے اس کی خواستگاری منظور نہ کی تو اس فیصلہ ایزدی کو کسی پردا دار مصلحت پر مبنی سمجھ کر صبرو شکر سے کام لو اسکے سوا کوئی چارا نہیں۔ اس سے کہہ دو کہ کسی کی یاد میں دوامی تجرد اختیار کر لینا نہایت راحت آفریں مگر ساتھ ہی نہایت گراں بہاں سودا ہے اور اس دنیاوی راحت کی خاطر اخروی انعام سے دست بردار ہونا بڑی نادانی ہے۔''

۳۰ جون ۱۹۱۹ء کو ایک اور خط میں لکھتی ہیں۔

''حیرت ہے کہ لڑکی کے خاندان میں منگنی کی بیوہ نگاہ نہیں کرسکتی۔ یہ تو بڑی اندھیر کی بات ہے۔ ہر لڑکی کے خیالات یکساں نہیں ہوتے۔ یہ نامراد رواج بہت سی نوجوان عورتوں کا قاتل بن سکتا ہے۔''

انہوں نے کتنا صحیح تجزیہ کیا ہے۔غیرت کے نام پر قتل، کاروکاری جیسے قبیح رواج آج بھی عورتوں کی جان لے رہے ہیں۔ وہ عورتوں کی سچی خیرخواہ تھیں اور وہ خود بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوئیں تھیں۔جس سے وہ لڑکی جس کا ذکر ہے۔ اس لیے بھی انہیں اس لڑکی کے احساسات کا اندازہ تھا لیکن انہوں نے اسے جو مشورہ دیا وہ جذبات سے زیادہ عقل پر مبنی ہے۔اپنی زندگی کے اس خلاء کو جو تجرد کی زندگی نے انہیں بخشا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھیں۔ ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''مجھے اعتراف ہے کہ میں ناتجربہ کاری کے سبب معاملاتِ نسواں پر رائے زنی کی اہلیت نہیں رکھتی۔ میری عمر کے تیئس چوبیس سال ایک ایسی چاردیواری میں گزرے جس میں اور باتوں کا ذکر ہی کیا۔ موانست زن وشوق اور پرورش اطفال کے مناظر و تجرد بھی ناپید ہیں۔''

بچوں سے انہیں محبت تھی اور ان سے شفیق برتاؤ اس حد تھا کہ گھر بچوں کے لیے بیماری میں بھی گڑیا بناتی تھیں۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے روزنامچے میں لکھتی ہیں۔

''وقت کا پرسکون حصہ گڑیوں کی نظر ہوتا ہے۔ بانو سعیدہ اور دفعدار انور شاہ کی بیوی اس کام میں میرے ساتھ شریک ہیں بلکہ شریک غالب۔ گھر کی چوزہ پلٹن (بال بچے) خوشی سے اچھل کود کر رہی ہیں اور کہتی پھرتی ہیں کہ دفعدار کی بیوی اور چھوٹی بیوی گڑیوں کا بیاہ کریں گی۔ خود مجھ سے جامی رحمۃ اللہ علیہ کی روح معرضۃ فرماتی ہے۔ بالغاں زا زنہار از کار طفلاں زی نہار۔ کسی کی نہیں سنتی اور خوشی خوشی بچپن کا سماں یاد دلانے کی کوشش کرتی ہیں۔''

یہ ان کی زندگی کے آخری ایام کا روزنامچہ ہے۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دوسروں کی

خوشیوں سے کس قدر خوش ہوتی تھیں اور بچوں سے ان کا برتاؤ بے حد مشفقانہ تھا۔

تاہم وہ اپنی شاعری سے بھی بڑے مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ ۳۰ جولائی ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں وہ لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھتی ہیں۔

''اس نازک ترین وقت میں اگر میری کمزور آواز اگر کسی ایک مست خواب کو بھی بیدار کر سکے تو میں سمجھوں گی کہ میری ناکام زندگی بیکار ثابت نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے مقدور بھر بہت کوشش کی کہ حاضر الوقت اسلامی مسائل پر فرقہ نسواں آواز اٹھائے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوسکا۔ حیرت ہے کہ رائس روٴسہ رئیسہ ہند بیگم بھوپال کا علم بھی انہیں اپنے گرد مجتمع نہ کر سکا۔''

ان کا سیاسی شعور بھی خطوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ ایک خط میں لیلیٰ بانو کو لکھتی ہیں۔

''جی ہاں گاندھی مہاراج نے طلبا کو شہ دے کر علی گڑھ میں تہلکہ ڈلوادیا اور جس چیز کو بنانے میں چالیس سال صرف ہوگئے وہ ایک دن میں معرض خوف میں پھنس گئی۔ ترک تعاون کی ابتدا گورنمنٹ کو بائیکاٹ کرنے سے تجویز کی گئی تھی مگر سامان عمل میں مسلمانوں کی تعلیم کے مقاطع سے اسکی بسم اللہ مناسب معلوم ہوئی۔''

کہا ماں نے

کچل ڈالوں گی اپنے بال بچوں کو
نئی ترکیب سوجھی دل پڑوسی کا دکھانے کی

اپنے دل کو انہوں نے شیشے کی طرح شفاف رکھا تھا۔ بہت سے معاملاتِ سیاست اور منافقت کو ان کی بصیرت بے نقاب دیکھتی تھی اور ان کا حساس دل کڑھتا تھا مگر ذاتی پسند ناپسند پر اجتماعی بہبود کو ترجیح دیتی تھیں۔ کبھی خود غرضانہ عناد کو دل میں جگہ نہیں دی۔ اپنے روزنامچے میں ۲۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لکھتی ہیں۔

''مولانا محمد علی نے اسیرِ بیداد تصدق احمد خان کی اسیری کا الزام جس عجلت و بے پرواہی سے بلا تحقیق میرے بے گناہ باپ کے سر تھوپا تھا اور ایک مقدس پاکیزہ سیرت مسلمان کو اپنی فصیح و بلیغ تقریروں سے بدنام کیا تھا۔ اس سے مجھے ضرور صدمہ پہنچا مگر حاشا و کلا مولانا کی اجتہادی غلطی اور بشری لغزش نے ایک سیکنڈ کے ۱۰ہزارویں حصے کے لیے بھی ان کی وقعت میرے دل میں کم نہیں کی۔ محمد علی وہ شخص ہے جس پر نہ صرف سات کروڑ مسلمانان ہند بلکہ چالیس کروڑ کلمہ

گویانِ عالم کو بجا فخر کرنا چاہئیے۔ محمد علی! عازم جمیل محمد علی

دیدہ احرار و دل ہمراہ تست
تانہ پنداری کہ تنہا می روی ''

ان ساری خصوصیات نے انہیں تصوف سے قریب کردیا تھا اور آنے والی زندگی ان پر منکشف ہورہی تھی جبھی وہ اپنی شاعری اور روزنامچے میں جواں مرگی کی پیش بینی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی نظم ''اے باپ'' میں والد کو محبت 'شفقت کا یقین دلاتے ہوئے آخری شعر میں یہ لکھتی ہیں۔

جب کہوں میں خیر باد اس عالم حق پوش کو
روح چل دے سونپ کر قالب تیری آغوش کو

خواجہ حسن نظامی نے ان کی وفات کے بعد ان کی نظم ''سفرِ عدم کی اطلاع'' اس نوٹ کے ساتھ چھاپی۔

''یہ نظم زاہدہ خاتون صاحبہ شروانیہ عرف سخن گو خاتون نے خواجہ بانو (صاحبہ) کے پاس اپنے انتقال سے کچھ قبل بھیجی تھی۔ اس وقت جبکہ ملک میں خاتون محترمہ کی وفات سے جگہ جگہ ماتم ہورہا ہے اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں اس موت کو قومی حادثہ خیال کیا جاتا ہے اس نظم کا شائع ہونا کئی اعتبار سے اچھا ہے۔ ایک تو مرحومہ کی شاعرانہ قابلیت، مکرر روشنی میں نظر آئے گی۔ دوسرے ان کی وہ فلسفیانہ، وہ صوفیانہ ذہانت معلوم ہوگی جو خدا نے ان کو عطا فرمائی تھی۔ تیسری بات جو سب سے زیادہ ہے وہ مرحومہ کی قوت کشف ہے۔ اس نظم میں انہوں نے صاف بتادیا ہے کہ ملنا ہے تو مل لو ورنہ میں اب عدم کے سفر کو جانے والی ہوں۔ ٦

مذکورہ نظم مجموعہ ''فردوس تخیل'' میں ''آ دیکھ مجھے'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کے آخری تین اشعار یہاں نقل کررہی ہوں۔

لوگ پوچھیں گے مری صورت و سیرت تجھ سے
منہ کسی کو جو دکھانا ہے تو آ دیکھ مجھے
دیکھ اب سیرِ عدم مد نظر ہے مجھ کو
جیتے جی دید میری چاہے ہے تو آ دیکھ مجھے
دیدنی ہے مری کیفیت ناگفتہ بہ
گر تجھے شبہٗ بے جا ہے تو آ دیکھ مجھے

زخ ش کی وفات پر اہلِ قلم کے تاثرات

زخ ش کی وفات کی اطلاع راحیلہ خاتون شروانی نے مولوی ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں کو جو زخ ش کے ناشر بھی تھے ایک خط کے ذریعے سے دی جسے انہوں نے اس طرح شائع کیا۔

''جبکہ اس ہفتے کا تہذیب ختم ہونے کو تھا محترمہ راحیلہ خاتون کے خط سے ناگہاں یہ دردناک خبر معلوم ہوکر بے انتہا رنج وقلق ہوا کہ تہذیب کی قابل فخر وسرمایہ ناز نامہ نگار زخ ش بھیکم پور نے بتاریخ ۲ فروری بروز جمعرات اس جہانِ فانی سے انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ خط یہ ہے۔''

''جناب مولانا ممتاز علی صاحب آہ! میں آج آپ کو وہ جاں کاہ خبر سناتی ہوں جس کے واسطے میں ہرگز تیار نہ تھی۔ کل ۴ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ بروز جمعرات صبح کے سات بجے میری پیاری چچیری بہن زاہدہ خاتون شروانیہ (زخ ش) نے ہم سب پر کوہ الم توڑ کر اپنے دائمی گھر جنت الفردوس کی راہ لی۔ صرف چار روز کی قلیل بیماری سے فیصلہ ہوگیا۔ نور کے تڑکے حورانِ بہشتی انہیں اپنے ہمراہ لے گئیں۔''......ے

اس خبر کے چھپتے ہی ہر طرف سے تعزیتی پیغامات ومضامین رسائل کو موصول ہونے لگے ان میں سے چند کے اقتباسات یہاں پیش کر رہی ہوں۔ نذر سجاد حیدر نے علی گڑھ سے لکھا۔

''آج مجھ کو یقین ہے کہ شاعر کے گیت سازِ فطرت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور اس کی تیر نظر مستقبل کی کتاب میں سے گزر کر اس پار کی جھلک بھی دیکھ آتی ہے۔ نہیں تو پھر وہ کیا تھا جس نے کچھ عرصہ پیشتر یہ اشعار زخ ش مرحومہ کے قلم سے لکھوا دیے۔

حسن باقی نے دل کو کھینچ لیا　　رخصت اے حسنِ ہستی فانی

برق نظارہ ہے فروغ حیات　　بارِ دل کیوں نہ ہو گراں جانی

یوسف روح مصر قدس میں جاں　　تن کو چھوڑ اے عزیزِ زندانی

اُف ان لطیف اشعار کی تہہ میں کیا کچھ معنی تھے۔ کیسی کچھ مہیب حقیقت چھپ رہی تھی۔ بہن تمہارے قلم نے ہمیں الوداع کہی۔ اور ہم نہ سمجھ سکے۔ تم چلی گئیں۔ اور ہم آج اپنی کم فہمی پر اشک آلود ہیں۔ دنیا ہمیشہ اس وقت جاگتی ہے جب کسی کی آنکھیں بند ہوچکی ہوتی ہیں۔ شروانی خاندان کی دختر نیک اختر فرقہ نسواں میں ایک ایسی شخصیت تھی کہ اس

خاندانِ ہند سے ابھی مدتوں اس کی نظیر پیدا ہونے کی امید نہیں۔ وہ علم وعمل کا زمانہ ہے۔ تعلیم نسواں کا ہر طرف چرچہ ہے۔ عموماً مسلمان لڑکیاں اسکولوں میں تعلیم پانے لگی ہیں۔ بہت سی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور بہتوں کی ہونے کی امید ہے۔ مغربی تعلیم سے مسلمان خواتین کے دماغ روشن، حوصلے بلنداور خیالات اعلیٰ ہوجائیں گے مگر ایسی شاعرہ جو آغازِ سن سال میں ہم سے چھن گئیں ہم مدتوں نہ پائیں گے۔''......۸

لیلیٰ خواجہ بانو جو اُن کی قریب ترین سہیلی تھی اور مسلسل رابطے میں رہتی تھیں۔ انہوں نے ''بس ایک تھیں۔ سنا ہے وہ بھی نہ رہیں'' کے عنوان سے لکھا۔

''وہ میرے لیے دنیا میں بس ایک تھیں۔ ان کے سوا کسی کو میں نے بہن نہیں بنایا اور میں کیا وہ تو سات کروڑ مسلمانوں میں ایک تھیں۔ مجھے تو کوئی دوسری بی بی ایسی لیاقتوں کی معلوم ہوتی نہیں اور ہوتو مجھے ان کے حال کی خبر نہیں............تہذیبی بہنوں تم جانتی بھی ہو زخ ش لکھنے والی اخبارِ تہذیب کی برادری میں ہی بس ایک ایسی تھیں جن کے نظم ونثر مضامین کو ہم سب مردوں کے ساتھ عورت کی لیاقت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے تھے۔ جن کو دیکھ کر بعض مرد تو واہ واہ کہتے تھے اور بعض اپنی عادت کے موافق یہ کہہ کر خفت مٹاتے تھے کہ کسی مرد نے لکھ دیا ہوگا۔ کیونکر کہوں زاہدہ خاتون شروانیہ جو سخن گو خاتون کے عرف سے بھی مشہور تھیں اب دنیا سے چلی گئیں۔''......۹

انیسہ خاتون نے جواں مرگی کے عنوان سے لکھا۔

''جس مرنے والی کی موت پر اعزاء کی آہ و بکا کے ساتھ علوم وفنون کے مختلف شعبے بھی بصد حسرت ماتم کناں ہوں۔ اس کا نعم البدل اس دورِ جہالت میں ایک زمانہ نامعلوم تک حاصل ہونے کی امید نہیں ہوتی۔ خصوصاً ہمارے مبتذل فرقۂ نسواں میں سے بااعتبارِ علم وفضل کمال ایک مردوں کے صف میں کھڑی ہوجانے والی بلکہ معمولی صورتوں میں ان سے آگے بڑھ جانے والی شاعرہ کی موت ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔''......۱۰

امتہ الحمید خانم نے جواُن کی سہیلی رابعہ خاتون کی بہن تھیں، مرنے والی کی یاد کے عنوان سے لکھا۔

''اے بے وقت رخصت ہوجانے والی بہشتی حور تو لافانی ہوچکی۔ تیری بلند پرواز۔ معنی خیز گوہر بار نظموں اور آئینہ حرم نے تجھے زندہ جاوید بنادیا۔ ابدالآباد تک تیرا نام بصد تحسین،تعظیم لوگوں کی زبان پر جاری رہے گا۔''......۱۱

تعزیت میں محترمہ ج نے کلکتہ سے لکھا۔

''اس خوبی مجسم خاتون کی دینداری اور قومی جذبے کے باعث جو عزت و محبت ان کی میرے دل میں تھی اسے خدا خوب جانتا ہے۔ ان کے کلام کا سوز و گداز اکثر مجھے خود فراموش اور اشکبار کر دیتا ہے۔ آہ نامعلوم مرحومہ نے کس ساعت میں یہ مصرعے لکھے تھے۔

مہر لب ہے گرچہ تیرا پاس جذبات اے پدر　　کہہ رہا ہے دل زبان بے زبانی سے مگر

جب کہوں میں خیرباد اس عالم حق پوش کو　　روح چل دے سونپ کر قالب تیری آغوش کو

خدا کے مقرب بندے دنیا میں بہت کم جیئے ہیں لیکن لائق صد آفریں ہیں۔''......۱۲

زہرہ اختر بیگم انوری نے زخ ش کی یاد کے عنوان سے طویل نظم اور قطعہ وفات لکھا۔ اُن میں سے چند اشعار دیکھیں۔

ملک عدم کو جانے والی زاہدہ شروانیہ
پیک تصور تجھ تلک پہنچائے زہرہ کا سلام
اے وہ کہ تیری ذات ہی سرمایہ نازِ صنف
اے وہ کہ مقبولِ خاص و عام تھا تیرا کلام
اے وہ کہ بو درد آتی تھی تیرے اشعار سے
اے وہ کہ رہتا تھا تیرا شعراء کامل میں خیال
اے وہ کہ وقتِ مرگ تک خدمت گزار قوم کی
اے وہ کہ تو نے کردیا فرضِ اولولعزمی تمام
اے وہ کہ پہلو میں تیرے رہتا تھا اک پر درد دل
اے وہ کہ سچے دل سے تھی تو فدیہ خیرالانعام
کچھ بات کہنی تجھ سے تھی کچھ بات سننی تجھ سے تھی
پر حیف تیری موت نے مہلت مجھے اتنی نہ دی

......۱۳

مولوی ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں نے مرحومہ زخ ش کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں اُن کی خدمات کا تفصیل سے ذکر ہے۔

''میرا تعارف مرحومہ کے والد ماجد سے سرسید نے کرایا تھا جس کو چالیس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ مگر مرحومہ سے خط و کتابت چند سال سے ہی تھی۔ اور یہ دردِ قوم ہی تھا جس نے باوجود کہ وہ ہندوستانی پردے کے ہر پہلو پر شدت سے عامل تھیں مجھ سے خط و کتابت پر مائل کیا۔ اور جب ان کی میری مکاتبت شروع ہوئی ان کی ہمدردی میرے مقاصد سے روز بروز بڑھتی گئی۔ کاغذ کی گرانی کے ایام میں جبکہ میں اخبار کی مالی حالت کی فکر سے بہت پریشان تھا۔ مرحومہ نے اپنی چیدہ نظموں کا ایک مجموعہ اخبار کی مدد کیلئے مجھے عنایت کیا۔ اور جب میں نے اس کے چھپنے کے بعد اس کے چالیس یا پچاس نسخے مرحومہ کی نذر کیے تو انہوں نے باوجود میرے اصرار کے وہ نذر قبول نہ کی اور میری درخواست نذر کے جواب میں ان نسخوں کی قیمت ہی نہیں بھیجی بلکہ اس کے علاوہ ۱۲۵ روپے اس غرض سے بھیجے کہ اس کی قیمت سے نادار غریب بہنوں کو آئینہ حرم کے نسخے مفت دیئے جائیں۔ جس کا اب تک میں نے باوجوہات اشتہار دینا مناسب نہیں جانا............ مرحومہ کی بے وقت موت سے تہذیب نسواں کو بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ وہ اپنی صنف کیلئے درد بھرا دل رکھتی تھیں اور اس درد کو تہذیب کے ذریعے ہی ظاہر کرتی تھیں۔ وہ مستورات کی قومی تحریکات کے باب میں مجھے اپنے مشوروں سے مدد دیتیں اور ان میں بے حد دلچسپی لیتی تھیں۔ مستورات کے تکالیف کے خطوط ان کے دل پر بے انتہا اثر کرتے۔ وہ بیواؤں اور درد رسیدہ بے کس عورتوں کے حالات سن کر بے تاب ہوجاتیں اور جہاں تک ان سے ممکن تھا ان کی مدد کرتیں اور اخبار میں ان کا ذکر کرنے کی سخت مخالفت کرتی تھیں۔

وہ گلشن تہذیب کیلئے ایک خوشنوا عندلیب تھیں۔ جو دردِ قوم کی راگنیاں سنا کر ملک جاودانی کو پرواز کر گئیں۔ آہ اس طائر قدسی کے اُڑ جانے سے چمن تہذیب بالکل سونا ہوگیا ہے۔ میں اپنی صحت کی متزلزل حالت پر غور کر کے بارہا یہ خیال کرتا تھا کہ تہذیبی مقاصد کو جو میری علالت کی وجہ سے ادھورے رہتے نظر آتے ہیں وہی سنبھالیں گی اور ضرور ان کی تکمیل کی کوئی صورت نکالیں گی۔ افسوس وہ سب حسرتیں دل کی دل میں رہی رہیں اور وہ بہشتی چڑیا اپنے آشیانے میں جا پہنچیں۔''......۱۴

تہذیب نسواں کے علاوہ زخ ش رسالہ عصمت میں بھی باقاعدگی سے شائع ہوتی رہی تھیں۔ ان کی وفات پر علامہ راشدالخیری نے لکھا۔

''وہ اس پائے کی عورت تھی کہ آج مسلمانوں میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ علاوہ ذاتی قابلیت کے جو ان کے مضامین میں نظم و نثر سے ظاہر ہوتی ہے ان کا دل قومی درد سے لبریز تھا۔''......۱۵

زخ ش کے بھانجے نعیم شروانی نعمت نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۶ء کے ایک مراسلے میں کیا، جس میں انہوں

نے لکھا ہے۔

''مجھے میرے نانا نواب مزمل اللہ خان صاحب مرحوم سے معلوم ہوا ہے کہ میری خالہ زخ ش مرحومہ کے انتقال پر علامہ اقبال نے تعزیت والے خط میں تحریر فرمایا تھا کہ اگر یہ عمر طبعی کو پاتیں تو میری ہم پلہ شاعرہ ہوجاتیں۔''

ان کے علاوہ تہذیب نسواں کی ۱۱ مارچ ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں پورے برصغیر سے خواتین لکھنے والیوں کے تعزیتی پیغامات شائع ہوئے۔ خاتون اکرم نے جھانسی سے لکھا۔

''آہ زاہدہ تیری بے وقت موت نے اگر تیرے عزیزوں کی آنکھوں میں دنیا اندھیر کردی ہے تو دیگر سیکڑوں بہنوں کو بھی رلایا اور ہزاروں کا دل دکھایا ہے۔ ہم تیری موت پر دستِ افسوس ملیں گے اور لقب کریں گے۔ زاہدہ خواتین کیلئے باعث فخر تھیں۔ وہ ہم سب میں ایک روشن چراغ تھیں جو بادصبا کے تیز جھونکوں سے سرشام ہی گزر گیا۔''

بنارس سے سلطانہ خاتون نے لکھا۔

''وہ خواتین ہندوستان کیلئے قابلِ ناز ہستی تھیں۔ ایک ایسا پھول تھیں جس نے اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ہندوستان کے گلستان نسواں کو معطر کر رکھا تھا۔ اس پھول کے کمہلا جانے سے ہمارے دل ٹوٹ گئے۔ حوصلے پست ہوگئے۔ ہماری امنگوں کا خاتمہ ہوگیا۔''

داؤد نگر سے عترت فاطمہ نے لکھا۔

''تمہارا جسم فانی تھا وہ فنا ہوگیا۔ مگر تمہارا نام نہیں مرسکتا جب تک دنیا میں تمہاری بے نظیر نظمیں رہیں گی تب تک تمہارا نام روشن رہے گا۔ تمہارے بے بہا موتیوں کے قدردان تمہارے نام کی ہمیشہ عزت کریں گے۔

الہ آباد سے رابعہ خاتون نے لکھا۔

''بزم نسواں کی صدر نشین زخ ش تم خاک نشین ہی ہوگئیں۔ آہ یہ الفاظ جگر خراش سننے کی طاقت نہیں۔

سیالکوٹ سے خورشید بیگم نے لکھا کہ وہ روزانہ نماز اور تلاوتِ قرآن کے بعد مرحومہ کیلئے دعائے مغفرت مانگتی ہیں اور روح کو ثواب بخشنا اپنا معمول قرار دیدیا ہے جو مسلسل دو ماہ تک جاری رکھا جائیگا۔......۱۶

مندرجہ بالا تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ گو انہوں نے بہت کم عمری میں وفات پائی مگر اپنی تحریری و تخلیقی

صلاحیتوں کی وجہ سے وہ مقام حاصل کرلیا تھا جس نے اس دور کے تمام اہم لکھنے والوں سے ان کی قابلیت کا اعتراف کروایا۔ بلاشبہ وہ نابغۂ روزگار ہستی تھیں جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زخ ش از مدیحہ خاتون شروانیہ۔ ماہنامہ سنگت، کوئٹہ۔ اگست ۲۰۰۶ء۔ صفحہ نمبر ۴۱

۲۔ زخ ش طاق نسیاں کا ایک روشن چراغ۔ از مدیحہ خانم شروانی۔ آج کل نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۹۶ء۔ صفحہ نمبر ۷

۳۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ بتاریخ ۱۰ مارچ ۱۹۱۸ء۔ غیر مطبوعہ، کاپی محفوظ ہے

۴۔ حیات زخ ش۔ صفحہ نمبر ۱۸۸، ۱۹۰۔ انیسہ خاتون شروانیہ۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۵۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط۔ بتاریخ ۲۷ ماہ مبارک ۱۳۳۴ھ، جمعۃ الوداع۔
غیر مطبوعہ، کاپی محفوظ ہے

۶۔ استانی دہلی رجب و شعبان ۱۳۴۰ھ

۷۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۱۱ فروری ۱۹۲۲ء

۸۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۲۵ فروری ۱۹۲۲ء

۹۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۲۵ فروری ۱۹۲۲ء

۱۰۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۴ مارچ ۱۹۲۲ء

۱۱۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۴ مارچ ۱۹۲۲ء

۱۲۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۱۸ مارچ ۱۹۲۲ء

۱۳۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۲۵ فروری ۱۹۲۲ء

۱۴۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۱۸ فروری ۱۹۲۲ء

۱۵۔ عصمت، جلد ۱۰ جولائی، ۱۹۱۸ء

۱۶۔ تہذیب نسواں، لاہور، ۱۱ مارچ ۱۹۲۲ء

زخ ش کی شاعری (مطبوعہ کلام کا جائزہ)

زخ ش کی شاعری ان کی کم عمری میں شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک پاکٹ بک ہوتی تھی جس کو کلیات کا نام دیا تھا۔ اُس پر اپنے اشعار لکھے۔ ابتدائی اشعار جو دس برس کی عمر میں لکھے تھے۔ ان میں عمر اور شاعری کی ناپختگی کے باوجود امکانات کی روشنی اور عزم کی بلندی واضح ہے۔ وہ اشعار درج ذیل ہیں۔

دائم میری مدد پر اگر کبریاء رہے — دنیا میں ثانی بھی مرا کوئی بھلا رہے
ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو — سارا جہان نظم مری دیکھتا رہے
میں شاعری میں اتنی ہوں مشہور کبریاء — سورج کی طرح نام چمکتا مرا رہے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی آئندہ زندگی کے لیے شاعری کو اپنا فن اور مقصدِ حیات بنانے کا عزم کرلیا تھا۔ وہ شاعری میں نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ اپنے اس ارادے میں وہ اتنی پرجوش تھیں کہ انہوں نے شعری اظہار میں تعطل نہیں آنے دیا۔ ابتدا ہی میں انہیں جب یہ احساس ہوا کہ شوق میں کمی آرہی ہے تو انہوں نے خود کو سرزنش کی۔

پہلا سا شوق شاعری مجھ کو نہیں رہا — جیسا کہ پہلا شوق تھا اب وہ نہیں رہا
بلبل کو گویا آرزوئے گل نہیں رہی — یا شوق گلستاں کسی گل کو نہیں رہا

ان اشعار سے بھی ظاہر ہے کہ وہ شاعری کو اپنے لیے اتنا فطری سمجھتی تھیں جتنی بلبل کو گل کی آرزو یا پھولوں کا گلستاں میں کھلنا۔ چنانچہ ان کے ابتدائی اشعار ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ قدرت نے انہیں شاعری کا بے مثال جوہر عطا کیا تھا اور یہ جوہر ان کی شخصیت کا لازمی جز بن گیا تھا۔ ان کے معلمین ان کی اس براقیٔ طبع کو ان کی ابتدائی عمر میں ہی محسوس کرنے لگے تھے اور حوصلہ افزائی ہی نہیں تعریف بھی کرتے تھے۔ انیسہ خاتون لکھتی ہیں

''مرحومہ کے استاد مولوی محمد یعقوب صاحب بھی جو ایک معمر بزرگ اور اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز تھے اپنی کمسن شاگرد کی اثر آفرینیوں سے نہ بچ سکے اور خود بھی نہ صرف اشعار کہنے لگے بلکہ باقاعدہ اپنی شاگردہ رشید کو بطور اصلاح دکھانے لگے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

میری شاگرد زاہدہ بیگم
شعر گوئی میں ہے مری استاد

''......ا

ان کی نظمیں باقاعدگی سے ۱۹۱۱ء سے اخباروں اور رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ صرف سترہ برس کی عمر میں ان کے کلام میں پختگی اور فکر میں وسعت پیدا ہوچکی تھی۔ بہت جلد ان کی شاعری برصغیر کے تمام اخبارات و رسائل جن میں تمدن دہلی، عصمت دہلی، تہذیب نسواں لاہور، شریف بی بی لاہور، زمیندار لاہور کے علاوہ پردہ نشین، استانی، تبلیغ نسواں، خطیب، نظام المشائخ وغیرہ میں شائع ہونے لگیں اور ان کا نام علمی اور ادبی حلقوں میں نمایاں ہوگیا۔ اگرچہ انہوں نے اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھا مگر زخ ش کے نام کو مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے مشہور مسدس آئینہ حرم اور اس کے ساتھ دس اور نظمیں شامل کرکے ایک مجموعہ آئینہ حرم کے نام سے مرتب کیا جسے مولوی ممتاز علی نے دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع کیا۔ آئینہ حرم کے سرورق پر درج ذیل تحریر تھی۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاأَقُوْلُ لَكُمْ

اسلامی جذبات عالیہ کا مرقع

یعنی

آئینہ حرم

جس میں

فخر نسوانِ ہند محترمہ زخ ش صاحبہ کے گوہر بار تخیل نے شعر کے موتی صفحہ قرطاس پر بکھیرے ہیں اور حقوق نسواں کی حمایت اور ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔

۱۹۳۱ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

آئینہ حرم میں جو نظمیں شائع ہوئیں وہ ان کے مجموعہ کلام فردوس تخیل میں بھی شامل ہیں۔ فردوس تخیل کے عنوان سے نظموں کا مجموعہ انہوں نے اپنی زندگی میں مرتب کرلیا تھا۔ انیسہ خاتون لکھتی ہیں۔

''فردوس تخیل مرحومہ کے مطبوعہ اور بعض غیرمطبوعہ کلام کا مجموعہ تھا جس کو انہوں نے اپنے بھائی حیران

شروانی کے نام معنون کیا تھا اور اس کی طباعت و اشاعت کا اپنی زندگی میں جلد قصد رکھتی تھیں۔''.....۲

اس مجموعے کے دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس کا نام فردوس تخیل اور ترتیب وہی ہے جو زاہدہ خاتون نے خود مقرر کی تھی۔

یہ مجموعہ ان کی وفات کے اٹھارہ برس بعد دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ۱۹۳۰ء میں چھپا۔۲۸۲صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں قطعات ،رباعیات ،متفرق اشعار کے علاوہ ۱۲۰نظمیں شامل ہیں۔فردوس تخیل کا دوسرا ایڈیشن زخ ش کے بھانجی مدیحہ خانم شروانی نے ۱۹۹۵ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ سے شائع کروایا۔

انیسہ خاتون نے لکھا ہے کہ مجموعہ ان کے بھائی احمد اللہ خان حیران کے نام معنون ہے۔ یہ درست نہیں۔ فردوس تخیل میں انتساب کی جگہ پہلے صفحے پر صرف نذر لکھا ہے اور بریکٹ میں یہ عبارت تحریر ہے۔'' اصلی مسودے کے پہلے صفحے پر بطور عنوان صرف ''نذر'' لکھا ہوا پایا گیا۔ بے وقت موت نے مصنفہ کو یہ صفحہ لکھنے کی مہلت نہ دی۔ اس لیے اس صفحے کو یونہی سادہ چھوڑا جاتا ہے۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مجموعہ کسی کے نام معنون کرنا چاہتی تھیں۔ مجموعے کی پہلی نظم ''گرم گرم آنسو'' ان نظموں سے ایک ہے جو انہوں نے اپنے بھائی احمد اللہ خان حیران کی وفات کے بعد ان کے غم میں لکھی جیسا کہ حاشیے میں درج ہے۔ یہ نظم ۱۹۱۷ء میں لکھی تھی۔نظم کے عنوان کے نیچے بریکٹ میں (دیباچہ تعنون کے طور پر) تحریر ہے۔ یہ مجموعہ انہوں نے خود مرتب کیا تھا اس میں پہلی نظم بھائی کے نام رکھ کر یہ لکھ دینا کہ یہ دیباچہ اور تعنون کے طور پر ہے ایک طرف تو اس محبت کے حق کی ادائیگی ہے جو انہیں بھائی سے اور بھائی کو ان سے تھی۔ دوسری طرف حمد، نعت اور مناجات سے پہلے اس نظم کو رکھنے کا جواز بھی ہے۔ انہوں نے اس نظم میں جہاں بھائی کی محبت اور حوصلہ افزائی کا ذکر کیا ہے وہاں اس احسان کو اتارنے کی کوشش بھی کی ہے جو انہوں نے بہن کی تحریری مشاغل کی حوصلہ افزائی کی صورت میں کیا تھا۔ ان کا اعتراف ان اشعار میں دیکھیے۔

عزیزو، قدردانو آج اس کے نام نامی سے
مزین کر رہی ہوں اپنے مجموعے کے عنواں کو
اسی کی حوصلہ افزائی نے مجھ کو یہ جرأت دی
کہ دوں دستِ احبا میں ان اوراق پریشاں کو

وہ زیرِخاک ہے جو دیکھ کر خوش ہونے والا تھا
بھلا کیا خاک خوش ہوں دیکھ کر میں اپنے دیواں کو

اس نظم میں دیباچہ اورتعنون کی وضاحت کے بعد پہلے صفحے پر نذر لکھ کر چھوڑ دینا بلا وجہ نہیں۔ وہ نذر کسی اور کا احسان اتارنے کی خواہش بھی ہوسکتی ہے۔ بھائی کے بعد ایک اور محبوب شخصیت جو پیوند خاک ہوئی تھی وہ ان کے پھوپھی زاد بھائی اور منگیتر ابد کی تھی۔ یہ دونوں عزیز ہستیاں ان کے تحریری مشاغل میں ہمدم و ہمراز تھیں، جیسا کہ شان الحق حقی نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

''خاندان میں ایک صاحب ایسے ضرور تھے جو زاہدہ کے قلمی مشاغل سے نہ صرف واقف بلکہ بڑے مداح تھے۔ انہوں نے زاہدہ کو گاہے گاہے تعریفی خطوط لکھے اور ہر خط میں مختصر رسید کی فرمائش کی۔ لیکن ان کے قلم کو جنبش نہیں ہوئی۔ قضا عنداللہ موصوف جواں مرگ ہوئے۔ زاہدہ کو اس بات کا دکھ رہا کہ وہ ان کی فرمائش پوری نہ کرسکیں۔''

ان خطوط کی رسید نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان صاحب سے منسوب تھیں۔ ان کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی رازدار سہیلیوں سے خطوط میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ ان کے لئے گہرے جذبات رکھتی تھیں۔ تاہم مشرق کی روایات کے مطابق ان کا اظہار نہیں کرسکتی تھیں۔ قرین قیاس ہے فردوس تخیل کے مسودے پر ''نذر'' لکھ کر چھوڑ دینے میں بھی یہی روایتی حیا اور معاشرتی خوف شامل ہوگا۔

بھائی حیران اور منگیتر ابد یہ دو شخصیتیں ایسی تھیں جنھوں نے بچپن میں یعنی ینگ شروانیز ایسوسی ایشن کے قیام کے زمانے سے ان کے ہر تحریری اور سماجی کاموں میں معاونت کی۔ بحث ومباحثے میں شریک رہے، شعر وسخن میں حصہ دار تھے۔ کتاب و رسائل کی ترسیل بھی کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں دونوں شخصیتوں کا حزنیہ ذکر بار بار کیا ہے۔ ایک نظم میں جس کی ردیف ''دونوں'' ہے لکھتی ہیں۔

چھوڑی نہ کچھ نشانی ہاں دے گئے ہیں دل کو
داغ مفارقت کی ایک یادگار دونوں
دونوں بجائے خود تھے ذوق سخن میں یکتا
افسوں طراز دونوں معجز نگاہ دونوں

آگے لکھتی ہیں۔

نازک ہے حال نزہت صحت رہی نہ قوت
اس نے تری محبت پر کیں نثار دونوں

انہوں نے دنیاوی رسم و رواج کے دباؤ میں ابد سے متعلق اپنے جذبات کا ان کی زندگی میں اظہار بالکل نہیں کیا بلکہ ان سے رابطے میں بھی محتاط رہیں۔ اپنے اس رویے پر ان کی وفات کے بعد انہوں نے پشیمانی اور پچھتاوے کا اظہار کیا ہے اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ اپنے مجموعے کو وہ ان کی نذر کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن نام لکھنے کی ہمت نہیں کرسکیں اور نذر لکھ کر چھوڑ دیا۔ یہ بات اس لیے بھی ثابت ہوتی ہے کہ بھائی کے لیے نظم کو دیباچے کے طور پر مجموعے کے آغاز میں حمد و نعت سے پہلے جگہ دی تھی۔ پھر نذر لکھنے کی کوئی اور وجہ نہیں رہ جاتی۔ اس کے علاوہ اگر بھائی حیران کا نام لکھنا تھا تو وہ نذر کے ساتھ فوراً بلاجھجھک لکھ سکتی تھیں۔ والد بھی حیات تھے اگر ان کو نذر کرنا چاہتیں تو ان کا نام لکھنا بھی آسان تھا۔ ان کے علاوہ کوئی تیسری ایسی محبوب شخصیت ان کی زندگی میں نہیں تھی جس کے بارے میں گمان کیاجائے کہ مجموعے کا انتساب اس کے نام ہوسکتا تھا۔ وہ یقیناً نذر کے آگے وہی نام لکھنا چاہتی تھیں جسے آئندہ زندگی میں ان کے نام سے وابستہ ہونا تھا لیکن جواں مرگی نے اس باب کو بند کردیا تھا۔

فردوس تخیل میں نظموں کو تین ادوار، دورِ اول، ثانی، اور ثالث میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پھر مجمع احباب، بزم طرب، بزم عزا، حسن تضمین اور بکھرے ہوئے موتی کے عنوان سے مختلف حصے ہیں۔ دورِ اول سے پہلے نظم ''گرم گرم آنسو'' پہلی نظم ہے جس کا ذکر ہوچکا ہے پھر عقیدت کے سلسلے کی چار نظمیں خدا، رسول ﷺ، مناجات اور متفرقات کے عنوان سے ہیں۔ حاشیے میں درج ہے کہ اس سلسلے کی چاروں نظمیں تہذیب نسواں لاہور جنوری ۱۹۲۰ء کی مطبوعہ ہیں اور ۱۹۱۷ء کی منظومہ ہیں۔ ایک ہی بحر ردیف اور قافیے میں غیر معمولی سلاست کے ساتھ حمد ۲۱ اشعار، نعت ۱۶ اشعار، مناجات ۱۵ اشعار اور متفرقات ۱۴ اشعار پر مشتمل ہیں جو ان کی قادرالکلامی اور فکری وسعت کی آئینہ دار ہے۔ حمد لکھنا اور اس طرح نبھانا کہ کسی قسم کی لغزش معنی و اظہار میں سرزد نہ ہوجائے بہت مشکل ہے۔ حمد کا عنوان ''خدا'' ان کے فارسی زبان و روایت سے تعلق کا پتہ دیتا ہے۔ حمد کی تحریر بھی غزل کے انداز میں ہے۔ اس کے ابتدائی چند اشعار یہاں نقل کررہی ہوں۔

باہر ہے حد وہم سے ہستی الہ کی — واں تک نہیں رسائی کسی اشتباہ کی
گرہے زباں صاحب حجت کی تجھ کو چاہ — مجھ کو بھی ہے طلب دل اثبات خواہ کی
عینی ثبوت کا متلاشی ہے تو اگر — طالب ہے آفرینش ہستی نگاہ کی
ذرے سے تابہ مہر زمین سے سپہر تک — ہر چیز ہے دلیل وجود الہ کی

ہے رات دن روانی دریا کا بھی یہ شور — میں بھی ہوں مستحق نگہ گاہ گاہ کی
کس کے ہنر نے سلمہ ستارے کا کرکے کام — تزئین کی فلک کی ردائے سیاہ کی

حمد میں جہاں شعری روایت کا تمام التزام ہے وہاں ایک شگفتگی ان کی اپنی ذات کی انفرادیت کی بھی ہے۔ حمد میں یہ شعر لکھنا

کس کے ہنر نے سلمہ ستارے کا کرکے کام
تزئین کی فلک کی ردائے سیاہ کی

اظہار کا وہ خوبصورت پیرایہ ہے جو شاعرہ ہی کا ہوسکتا تھا۔ اتنی فطری انداز میں یہ شعر نسائی اظہار کا قابل ذکر نمونہ ہے۔ اس حمد سے زخ ش کی زندگی اور شاعری کا ایک اور رخ اجاگر ہوا ہے۔ وہ ہے تصوف کی طرف ان کا رجحان۔ اشعار دیکھیے۔

خالق کا خلق مادہ میں صاف ہے ظہور — دکھلائی گر نہ دے توخطا ہے نگاہ کی
حل کر سکا نہ مسئلہ علۃ العلل — ناحق کتاب فلسفہ تونے سیاہ کی
وہ آنکھ جو مشاہدہ حق سے ہے نفور — نور نگاہ ہے نگہ اشتباہ کی

تصوف کے مضامین ان کی شاعری میں بار بار آتے ہیں۔ جس سے ان کی ذات کے اس گوشے پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ جہاں اپنے عقائد میں سچی مسلمان تھی وہاں رویوں میں صوفیاء سے متاثر تھیں اور زندگی و شاعری دونوں میں ان کی مقلد تھیں۔

حمد کے بعد اسی بحر میں نعت بعنوان ''رسول ﷺ'' لکھی گئی ہے۔ حمد میں روانی کے ساتھ الفاظ کا شکوہ ہے اور عربی تراکیب بھی استعمال کی ہیں۔ نعت زیادہ رواں سادہ اور مکمل فارسی تراکیب سے مرصع ہے۔ یہ نعت اس وقت لکھی گئی تھی جب ان کے والد بچوں کے ساتھ آستانہ رسول ﷺ پر حاضری دینے کا ارادہ رکھتے تھے (اس ارادے کی تکمیل نہ ہوسکی)۔ انہوں نے خود کو چشم تصور میں وہاں موجود دیکھا۔ مطلع اور ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں۔

میں اور بارگاہ رسالت ﷺ پناہ کی — اے دل کہیں نہ ہو غلطی یہ نگاہ کی
وہ آستاں سپہر بریں جس کے آگے پست — شرمندہ جس کے نور سے ضوءمہروماہ کی
وہ آستاں محال جہاں پیر عقل کو — تمیز عبدومالک و میرد سپاہ کی

وہ آستاں جہاں نگہ پیر چرخ نے دیکھی سدا برہنہ سری کج کلاہ کی
مانوں یہ کس طرح کہ رسائی ہوئی یہاں مجھ سی غریق جرم۔ حریق گناہ کی
اب معترف ہوئی ہنر مہرو عشق کی اب معتقد ہوئی اثر اشک و آہ کی
صدقے میں داغ مہر محمد ﷺ کے گم ہوگئی کافور تیرگی مرے بخت سیاہ کی
اے نیر علوم و حکم اے مہ کمال صلوٰۃ تجھ پہ خالق خورشید و ماہ کی

اس نعت میں نسائی لہجہ عیاں ہے اور اپنے لیے صیغۂ تانیث اختیار کیا ہے۔ حمد کے مقطع میں انہوں نے اپنا تخلص نزہت لکھا ہے۔

نزہت ہو اور ترانہ توحید اے خدا
مدت ہو ختم جب تن و جاں کے نباہ کی

نعت کا اختتام دعائیہ شعر پر ہے۔

سرکار مجھ کو گنبد خضرا کے متصل
درکار ہے زمیں بس اک خوابگاہ کی

مناجات میں ان کا کمال فن عروج پر ہے۔ مناجات کے مقطع میں اپنا نام زاہدہ استعمال کیا ہے۔ مناجات میں اثر اور روانی بھی دیکھیے۔

طالب ہوں تیرے رحم سے یارب پناہ کی دل کانپتا ہے دیکھ کے ظلمت گناہ کی
ہیہات ساری عمر اڑاتی رہی ہنسی واعظ کی پندوموعظت و انتباہ کی
ہیہات کی سدا صفت کور پیروی نفس شریروسرکش و گم کردہ راہ کی
ہیہات مجھ سے ہو نہ سکا کوئی نیک کام رغبت کبھی نہ جانب خیر و رفاہ کی
آغاز عیش میں نہ کیا کبریا کو یاد انجام پر نہ بھول کے میں نے نگاہ کی
بالصبر والصلوٰۃ کو سوچا نہ آہ آہ کی وقت غم بلند صدا آہ آہ کی
شیطاں کا کیا قصور مقدر کی کیا خطا آپ اپنی عمر میں نے خراب و تباہ کی
لیکن ہوں وقف نازبدیں پستی عمل ہوں امتی محمد ﷺ گردوں پناہ کی
یہ کس کا نام تھا کہ ہوا سکتہ نطق کو آواز آئی قلب سے روحی فداہ ﷺ کی

مقطع ہے۔

یارب! سپیدۂ سحر حشر میں کہیں
قلعی کھلے نہ زاہدہ روسیاہ کی

اس سلسلے کی چوتھی نظم متفرقات پر غور کیا جائے تو یہ ایک مکمل غزل ہے جس میں شکوہ بھی ہے شیون بھی۔ غزل کی طرح اس کا ہر شعر معنی و مضامین میں مختلف ہے تاہم تمام اشعار کا مزاج اور تاثر ایک ہے۔ اسے مکمل نقل کر رہی ہوں۔

شکوے گلے کیے نہ فغاں کی نہ آہ کی — کیونکر اڑی خبر میرے حال تباہ کی
مدفون دل میں آرزوئے عزوجاہ کی — دیکھی نہ قدم جو لحد بادشاہ کی
خوف ریا سے جی دم طاعت ہے ڈوبتا — یا غرق موج اشک ہے کشتی گناہ کی
سوئے مقام اہل ریا چشم دل سے دیکھ — پائے گا بتکدہ کو جگہ خانقاہ کی
یاں مقصد و حیدِ سخن نشرِ صدق ہے — پروا نہیں ہے مجھ کو تری واہ واہ کی
زنجیرپا کبھی نہ ہوئی تھی نہ ہے نہ ہو — ہیبت کسی دنی سے دنی دزدراہ کی
احساں کسی سخی سے سخی مال دار کا — خاطر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کی
میں احتیاط سوز ہوں۔ وہ آتشیں مزاج — اہل حرم سے شکل نہیں کچھ نباہ کی
اے شیخ! ہے رسیدۂ درگاہ حق وہی — جس نے ہمارے ٹوٹے ہوئے دل میں راہ کی
کھانا قسم کا آج سے ہم کو ہوا قسم — سنتا نہیں ہے کوئی خدا سے گواہ کی
قرآن خواں کو کیوں ہو تلاش سکون دل — کی کو کیوں طلب ہو مقام پناہ کی
ہیں اہل طب مداومت کحل پر مصر — لاؤں کہاں سے گرد مدینے کی راہ کی
خوں کے سے گھونٹ واعظ دیں پی کے رہ گیا — مسلم کی مے کشی پہ جب اس نے نگاہ کی
حکمت چھنی، علوم چھنے، مال و زر چھنا — ہم لٹ گئے دہائی حبیب اللہ ﷺ کی

جاتا ہے ذہن ترکی بیمار کی طرف
آتی ہے جب کہیں سے صدا آہ آہ کی

یہ چاروں نظمیں ۳ جنوری ۱۹۲۰ء کو تہذیب نسواں میں سید ممتاز علی کے اس تعارف کے ساتھ شائع ہوئیں۔

''جناب مکرمہ و محترمہ زخ ش صاحبہ نے چار نظمیں، آستانِ رسالت ﷺ، اثبات واجب الوجود، مناجات، اور اخلاقی غزل ایک ہی ردیف و قافیہ میں لکھ کر ہمارے پاس بغرض اشاعت بھیجی ہیں۔ محترمہ موصوفہ کے کلام کی داد دینا تحصیل حاصل ہے۔ اچھا کلام اپنی تعریف خود کرالیتا ہے۔ انہوں نے خدائے تعالیٰ کے وجود کا جس قابلیت سے ان اشعار میں ثبوت دیا ہے اس کی قدر وہی بہنیں کرسکتی ہیں، جنہیں خدا کے فضل سے علم و فضل اور علمی مذاق صحیح حاصل ہے۔ محترمہ اس وقت بلاشبہ مسلمانِ خواتین ہند میں نہایت اعلیٰ پائے کی انشاپرداز اور شاعرہ ہیں اور طبقہ نسواں ان کی ذات پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔''

مجموعہ فردوس تخیل مرتب کرتے ہوئے ان کے آغاز میں یہ چاروں نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ پہلی اور دوسری نظم کے عنوانات تبدیل کرکے ''خدا'' اور ''رسول ﷺ'' لکھا گیا ہے۔ حمد کے مطلع میں مصرعہ ثانی بھی تبدیل ہے۔ رسالے میں یہ مصرعہ ''واں تک رسائی کب ہے کسی بادشاہ کی'' شائع ہوا ہے۔

متفرقات کو سید ممتاز علی نے بھی اخلاقی غزل کا عنوان دیا ہے۔ اس کے مقطع میں پہلے نزہت استعمال کیا ہے اور تہذیب نسواں میں یہ مقطع یوں چھپا ہے۔

جاتا ہے ذہن نزہت بیمار کی طرف
آتی ہے جب کہیں سے صدا آہ آہ کی

اس کی وجہ ان کا وہی محتاط رویہ ہے جسے وہ برصغیر کے سماج میں رہتے ہوئے اپنانے کے لیے مجبور تھیں۔ وہ یہ چوغزلہ مجموعے میں شامل کرنا چاہتی تھیں اور چوتھی غزل جو حمد، نعت، مناجات کے زمرے میں نہیں آرہی تھی قومی تاثر دے کر ان سے منسلک رکھا ہے۔ اٹلی نے ترکی پر حملہ ۱۹۱۱ء میں کیا تھا اور ۱۹۲۱ء میں مقطع میں سے نزہت ہٹا کر ترکی لکھنے کی اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ خاندانی اور سماجی دباؤ کی وجہ سے وہ غزلوں کو منظر عام پر نہیں لاسکتی تھیں۔

فردوس تخیل کے باب دور اوّل میں نو نظمیں شامل ہیں۔ ہر نظم کے آغاز میں صفحہ کے حاشیے پر اس کے منظوم ہونے یا شائع ہونے کی تاریخ درج ہے۔ اس طرح پتہ چلتا ہے کہ وہ نظمیں جو دور اول میں شامل کی گئی ہیں۔ ابتدائی شاعری ہے، ان کی تاریخیں بھی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک کی ہیں۔

فردوس تخیل کے باب دور اوّل میں نو نظمیں شامل ہیں۔ ہر نظم کے آغاز میں صفحے کے حاشیے پر اس کے کہے جانے یا رسالے میں شائع ہونے کی تاریخ درج ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ نو نظمیں جو دور اول میں شامل کی

گئی ہیں ابتدائی شاعری سے تعلق ہیں۔ ان کی تاریخیں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء پر مشتمل ہیں۔ پہلی مطبوعہ نظم پر اگست ۱۹۱۱ء کی تاریخ ہے جو تمدن دہلی میں چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ''ناشاد تماشائی'' یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان تاریخوں کی رو سے ان کی اس شاعری کی عمر جو شائع ہوتی رہی صرف دس برس بنتی ہے۔ ان دس برسوں میں فردوس تخیل جیسا نظموں کا مجموعہ اور ایک دیوان غزلوں کا مرتب کردینا ان کی زودگوئی اور قادرالکلامی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح ابتداء سے اختتام تک ان کی شاعری میں ارتقاء اور تنوع کو باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری کا انداز بالکل فطری ہے۔ بتدریج مضامین و معنی کا پھیلاؤ' ان پر گرفت کی مضبوطی اور شعری رونظموں کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ دور اوّل کی پہلی نظم میں ابتدائی عمر کی وہ حیرت عیاں ہے جو اطراف کے مناظر اور مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے۔ تاہم اس حیرانی میں خوشی کے بجائے ملال کی کیفیت ہے۔ وہ حسین مناظر جو آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں اور دل میں اُمنگ پیدا کرتے ہیں ان سے حزنیہ مضامین پیدا کرنا ایک طرف تو ان کی انفرادیت کا پتہ دے رہے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی ثابت کرر ہے ہیں کہ وہ ابتدائی عمر سے ملول اور اداسی میں مبتلا تھیں۔ نظم کا عنوان ''ناشاد تماشائی'' بذات خود اس طرف اشارہ کررہا ہے۔ یہ نظم اس زمانے کے مروجہ اسلوب کے مطابق ہے زبان و بیان بھی وہی ہے جو اس عہد میں رائج تھا۔ وہ اپنے معاصرین اور عہد سے بالکل جدا نہیں تاہم معنی و خیال میں جدت ہے۔ اگرچہ اس نظم میں گہری اداسی اور زندگی کے تاریک رخ کو دیکھنے کا رویہ ہے مگر اعلیٰ جمالیات اور خوبصورت لفظیات نے اس میں متضاد کیفیت پیدا کی ہے۔ نظم کا مطلع اور چند اشعار بطور نمونہ یہاں درج کررہی ہوں۔

کیا یہی ہے گلستاں جنت نشاں تفریح گاہ
دے رہی ہے یا مرے دل کی طرح دھوکا نگاہ

چشم طوفاں زا ہے؟ یا صحن چمن میں حوض ہے
اشک حسرت ہیں کہ شبنم؟ جائے غوروخوض ہے

لالہ کا داغ جگر عکس دل پُرداغ ہے
سینہ صد چاک ہے یاں گل؟ یہ کیسا باغ ہے

نرگس بیمار کو دیکھا تو حیرانی بڑھی
نکہت آوارہ سے دل کی پریشانی بڑھی

سنبل ژولیدہ موسے اور الجھن ہوگئی
دیکھ کر سوسن زباں پھر وقف شیون ہوگئی

جھومتا ہے کس لئے غصہ سے سرو گلستاں
اس نے کیا اہل وطن کی دیکھ لیں کج رائیاں

پائمال اُفتادہ غم کی طرح کیوں ہے حنا
کس لئے ہم رنگِ دل باطن میں پرخوں ہے حنا

دیکھتے ہی سبزۂ گلزار کو یاد آ گئی
بخت کا خواب گراں۔ احباب کی بیگانگی

ہے مرا ذوق ترنم بھی فقط وقف فغاں
بلبلوں آؤ اُٹھالیں مل کے سر پر آسمان

دوسری نظم میں بھی یہی حزنیہ رویہ موجود ہے اس کا عنوان ''عید کا چاند'' اور بریکٹ میں لکھا ہے ایک خانگی سانحہ کا تاثر۔نظم پر منظومہ ۱۹۱۱ء لکھا ہے۔ یہ نظم مسدس کے انداز میں ہے۔عید کا چاند دیکھ کر بجائے خوشی کے غم کی کیفیت منظوم کی گئی ہے۔ یہ خانگی سانحہ جس کی طرف ان کا اشارہ ہے ان کی محبت کرنے والی نانی کی وفات ہے جو ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ والدہ چونکہ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وفات پا چکی تھیں۔ اس لئے نانی سے ان کو ماں کی محبت ملی تھی۔نانی کی وفات پہلا سانحہ الم تھا جس سے وہ دوچار ہوئیں اور اس کا انہوں نے بے حد اثر قبول کیا۔آٹھ بند کے اس مسدس میں انہوں نے عید کا چاند دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے اس سے متضاد دکھ کا بیان کیا ہے اس غم کی وجہ بھی بتائی ہے۔ پہلے بند میں وہ لکھتی ہیں۔

عین انتظار میں نظر آیا مہ مبیں — اس وقت صائموں کی مسرت کی حد نہیں
لازم ہے مومنوں کو کریں عید کی خوشی — فتوے سنا رہے ہیں مجھے عالمان دیں
کرتی ہوں ہاتھ جوڑ کے ان ناصحوں سے عرض
دیدیں حضور ایک دل شاد کام قرض

پہلو میں دل نہ ہو تو خوشی کیا سرور کیا — اور جب خوشی نہ ہو تو جتانا ضرور کیا
سال گذشتہ ہم بھی تھے مسرور دوستو — کرتے ہو اپنی بخت وری پر غرور کیا
ایام عیش ہوگئے خواب و خیال حیف
اک دل ہے اور ہزار طرح کے ملال حیف

رخصت ہوئے جہاں سے محبانِ باصفا — ویراں کرکے ہم کو لحد کو بسالیا
پس ماندہ اقربا سے ملاتا نہیں فلک — صد حیف شکل ان کی ہوئی چاند عید کا

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر
(تضمین)

پہلی نظم ناشاد تماشائی کی طرح ایسے مناظر جو عام حالت میں خوش کن ہیں ان کی المیہ تصویر کشی کی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے اپنے غمزدہ ہونے کی وجہ بھی بتادی ہے اور شاعرانہ انداز میں ذات کے دکھ کو کائنات سے ملادیا ہے۔

تو ہے کمان تیر جفائے فلک ہلال ہے آسماں کا ظلم و ستم میں شریکِ حال
جب دیکھتی ہوں تیری طرف اے کمانِ چرخ چبھتا ہے آ کے سینہ میں اک ناوک ملال
یاد آتے ہیں وہ از منہ فرخ و سعید
جب تھا بلا مبالغہ ہر روز۔ روز عید

ان کے مزاج کی یہ یاسیت اس سے اگلی نظم میں اور زیادہ نمایاں ہوگئی ہے۔ اس نظم کا عنوان ''ہمارے بعد'' ہے۔نظم میں انہوں نے اپنی موت اور اس کے بعد کے حالات کی خیالی تصویر کشی کی ہے اور یاسیت کی اس انتہا پر ہیں کہ موت کے خیال میں نہ صرف سکون میں ملتا ہے بلکہ اس میں رومانس نظر آتا ہے۔ شاعروں کا موت میں رومانس تلاش کرنا کوئی غیر معمولی رویہ نہیں لیکن زخ ش کا اوائل عمر میں اس جانب راغب ہونا ابتدا سے ان کی یاس زدہ طبیعت کی ترجمانی کررہا ہے۔ اس نظم میں وہ زندگی کی بے ثباتی اور کائنات میں جاری و ساری نظام کو اسی طرح چھوڑ کر رخصت ہونے کی جانب توجہ دلاتی ہیں اور یہ سب کچھ وہ خود اپنی دائمی رخصت کے حوالے سے پیش کررہی ہیں۔ وہ عمر جب اُمنگ اور امیدیں اپنی انتہا پر ہوتی ہیں موت کی خواہش اپنے ماحول اور زندگی سے مایوسی کی دلیل ہیں۔ اور پھر اس پر ہی اکتفا نہیں کرتیں وہ موت کے خیال سے لطف حاصل کرتی ہیں جو کرب ناکی کی انتہا ہے۔شعر یہاں نقل کررہی ہوں۔

واہ کیا کیفیت آمیز زمانہ ہوگا جبکہ ہم بے خبرِ شورشِ دوراں ہوں گے
جب ستائے گا نہ دردِ غم ہجرِ احباب جب طبیبوں کے نہ شرمندہ اُحساں ہونگے
جورِ محبوب سے مجروح نہ ہوگا سینہ طعنِ ناصح نہ جراحت پہ نمکداں ہونگے
غمِ پامالی حسرت سے نہ دل خوں ہوگا نہ یہ امیدیں رہیں گی نہ یہ ارماں ہونگے

یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے اور غزل کے انداز میں ہے۔ دوسرے حصے میں انہوں نے اپنا تخلص اور نام

دونوں استعمال کیا ہے۔

شاخ پر بیٹھ کے مرغانِ خوش الحانِ چمن	صورت نزہتؔ مرحومہ غزل خواں ہونگے
ہاتھ میں ڈال کے ہاتھ آئیں گے ارباب نظر	سبزۂ ساحل دریا پہ خراماں ہوں گے
گر چھڑا تذکرۂ نقشہ کشانِ قدرت	واصفِ زاہدہ ہونگے جو سخنداں ہوں گے
گائیں گے ہوکے ہم آواز ہمارے اشعار	اور ہم ساکنِ اقلیمِ خموشاں ہوں گے

۱۹۱۲ء میں جبکہ ان کے اشعار کے اشاعت کی ابتداء ہی تھی۔ انہیں پورا شعور تھا کہ ان کی شاعری مقبولیت کے معیار پہ پوری اترتی ہے اور قبول عام ہوگی۔

اس دور کی اگلی نظم ''آنکھیں میری تجھے ڈھونڈتی ہیں'' عصمت دہلی کے شمارہ ستمبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ اس عنوان کے نیچے بھی بریکٹ میں وضاحت ہے۔(ایک حرماں نصیب ماں کی فرمائش پر) مختصر رواں بحر میں اس نظم میں چھ بند ہیں۔ ہر بند سات مصرعوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظم ایک ایسی ماں کا نوحہ ہے جو بیوہ ہے اور اس کا بیٹا نوعمری میں انتقال کر گیا ہے۔شوہر کی نشانی بیٹے کو کھو کر اس کی زندگی میں خوشیوں کی رمق باقی نہیں رہی۔اس نظم میں بھی اپنی ابتدائی نظموں کا انداز اختیار کیا ہے یعنی حسین مناظر فطرت جو خوش کن ہوسکتے ہیں اب دل کو زیادہ ناشاد کرتے ہیں کیونکہ ان مناظر میں اس کا پیارا بیٹا نہیں ہے۔ اس نظم میں سادگی و روانی کے ساتھ جمالیاتی احساس کی فراوانی ہے۔ خصوصاً نظم کے یہ دو بند اعلیٰ جمالیات کی مثال ہیں۔

رقاص صبا کے بانکپن میں	بلبل کے سرود پر محن میں
پھولوں کے جمال میں پھبن میں	نسریں میں سمن میں نسترن میں
سوسن کی زبانِ بے سخن میں	خوش چشمی نرگس چمن میں

آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

کہسار کی جاں فزا فضا میں	نظارۂ صبح دل کشا میں
زرپاشیِ مہر کی ادا میں	پھر اس کے غروبِ خوشنما میں
تاریکیِ شام خوف زا میں	مہتاب کی دل نشیں ضیا میں

آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں

اس دور کی پانچویں نظم ''قیدِ فرنگ کا خاتمہ'' خاتون علی گڑھ میں جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک

مختلف نظم ہے جس میں نپولین بوناپاٹ کے آخری ایام کو پراثر انداز میں منظوم کیا گیا ہے۔ نپولین بوناپاٹ (۱۷۶۹ء سے ۱۸۲۱ء) مشہور فرانسیسی جرنل تھا فرانس کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد مئی ۱۸۰۴ء میں اس نے اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس نے ۱۸۰۵ء میں آسٹریا اور ۱۸۰۶ء میں جرمنی کو شکست دی۔ اس نے اپنی باوفا بیوی جوزیفائین کو طلاق دے کر شاہ آسٹریا کی بیٹی ماری لوئیزا سے شادی کرلی تھی۔ نپولین کو ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو واٹرلو کے میدان میں شکست ہوئی اور سینٹ ہلینا کے جزیرے میں جلا وطن کردیا گیا۔ وہیں ۱۸۲۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ نظم قید فرنگ کے خاتمہ میں زخ ش نے نپولین کے آخری ایام کی خیالی تصویر کشی کی ہے اور اسے اپنے رویوں پر پشیمان پیش کیا ہے۔ بارہ بند کی اس نظم میں ہر بند تین اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک منظوم افسانہ ہے اس نظم میں زندگی کی بے ثباتی اور انقلاب زمانہ کی تصویر کشی کی ہے۔ اس نظم کے ابتدائی چار بند میں نپولین کا اس کی باوفا بیوی کو طلاق دے کر ایک بیوفا عورت سے شادی کرنے پر پچھتاوے کو قلمبند کیا گیا ہے۔ یہ نظم تصوراتی تصویر کشی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

سینٹ ہیلینا کا اُف وہ محبس مرطوب و تار — اور اس میں قید اک شاہنشہٗ عالی وقار
دیکھنا اس کا بآن خاموشی فریاد خیز — انتظارِ موت میں گردوں کی جانب بار بار
زندگی کے آخری لمحوں میں کہنا خود بخود — الوداع اے عمرِ فانی الفراق اے روزگار

تیرا احساں ہوگا اے پیغام برباد صبا — آسٹریا میں ہوکر تیرا گزر باد صبا
بادشاہِ آسٹریا کی تجھے نور نظر — آئے گی ایوان شاہی میں نظر باد صبا
کھینچنا سینے سے اس کے آگے آہ شعلہ بار — یوں دکھانا صورتِ سوز جگر باد صبا

پھر یہ کہنا بے وفا تو تو یہاں آزاد ہے — پائے در زنجیر تیرا شوہر ناشاد ہے
سچ بتانا تجھ کو آیا ہے کبھی یہ بھی خیال — سینٹ ہیلینا میں کس پر بارش بیداد ہے
تجھ کو رکھتا تھا کبھی جو جان سے بڑھ کر عزیز — میریا میں ہوں وہی نپولین کچھ یاد ہے

آہ وہ فردوس پیرس وہ لب دریائے سین — آہ وہ میری وفا خو جو سیفائین نازنین
آہ اے مہرِ مجسم آہ اے طاعت شعار — لوحِ دل پر نقش ہے تیری ادائے دلنشیں
عہد گل۔ عہدوفا۔ عہدشہید۔ عہدشباب — تیرے دم کے ساتھ ساری لذتیں وابستہ تھیں

اس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے خطے کے ساتھ یورپ کی تاریخ سے بھی دلچسپی تھی اور مطالعے نے انہیں ادراک و اظہار کی وسعت عطا کی تھی۔

فردوس تخیل کی چھٹی نظم ''ظہورِ امام'' کے حاشیے پر درج ہے۔ یہ نظم نظام المشائخ دہلی بابت ذی الحج ۱۳۳۰ھ چھپی ہے۔ اس کا عیسوی سن ۱۹۱۲ء بنتا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ بارہویں امام مہدی کے ظہور کی دعا ہے۔ احادیث صحیحہ کی رو سے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت سے پہلے جب ساری دنیا میں انتشار اور ابتری اپنے عروج پر ہوگی اور خصوصاً مسلمان زوال کی انتہا پر ہوں گے۔ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ ان کے ظہور کے بعد مسلمانوں کے حالات تبدیل ہوجائیں گے اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا۔ یہ نظم انہی عقائد پر مشتمل ہے اور اس وقت کے مسلمانوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے امام مہدی کی آمد کے لئے دعا ہے۔ یہ نظم مخمس کی شکل میں ہے اور آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ابتدائی دو بند یہاں نقل کر رہی ہوں۔

آرزوئے دل ناکام مسلماں! آجا　　یاور مومن و قوت و ایماں! آجا
منتظر ہیں ترے مسلم بدل و جاں۔ آجا　　ہاں اٹھا کر علَمِ شاہِ رسولاں آجا
صاحب معجزہ و حجت و برہاں! آجا

کیا کہوں حال تری قوم کی بربادی کا　　دشمنانِ شہِ دیں کی ستم ایجادی کا
پڑھ چکے نوحہ سب اسلام کی آزادی کا　　شور کر شور ''اَنَــا الْـمَهـدِیُ وَالْهَــادِیُ'' کا
دستِ اقدس میں لئے خنجر عریاں آجا

اگلی نظم ''معارف ملیہ'' کے حاشیے پر منظومہ ۱۹۱۱ء درج ہے۔ یہ نظم بھی دعائیہ ہے اور برصغیر کے مسلمانوں کے اس وقت کے حالات سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ یہ دور وہ تھا جب مسلم لیگ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس کے سالانہ اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے تھے۔ ڈھاکہ کا تاسیسی اجلاس ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوا تھا اس کے بعد دسمبر ۱۹۰۷ء میں کراچی میں؛ مئی ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں؛ ۱۹۱۰ء میں ناگپور میں اور ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کے جلسے ہوئے تھے۔ انگریز حکومت نے ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کردیا تھا۔ جس کی مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس میں کھل کر مذمت کی گئی تھی مسلمانوں میں یہ احساس پختہ ہو رہا تھا کہ انہیں اپنے وقار اور قومی تشخص کو برقرار رکھنے کیلئے اپنے آپ کو منظم کرنا ہوگا۔ یہ نظم ایسے ہی جذبات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کی اس شوکت وسطوت کا ذکر ہے جو ماضی کا حصہ بن گیا تھا اور دعا ہے کہ مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار پھر بحال ہو۔ معارف ملیہ سے ابتدائی چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کیا ہوئی اے مرے اسلام وہ شوکت تیری ہائے کس گوشے میں روپوش ہے سطوت تیری
دوست تو دوست مخالف تھا ترا مدح سرا ملک کیا چیز ہے؟ دل پر تھی حکومت تیری
تیری تعلیم نے انساں کو بنایا انساں دولت علم ملی اس کو بدولت تیری

آگے لکھتی ہیں۔

مذہبی جوش پھر اک بار دکھادے جلوہ درد اسلام پھر اُٹھ آ کہ ہے حاجت تیری
اے رسول عربی ﷺ اے شرف افزائے رسل اب بھی قرباں ہے ترے نام پہ امت تیری
جوش زن اب بھی دماغوں میں ہے سودا تیرا جلوہ گر اب بھی دلوں میں ہے محبت تیری
اے مہِ فیض! یہ اندھیر مٹا سکتی ہے
طرفتہ العین میں اک چشم عنایت تیری

برصغیر کے حالات کے ساتھ ساتھ ترکی پر اہل مغرب کی یلغار نے بھی ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کردیا تھا۔ اگلی دو نظمیں ''بصائرِ سیاسیہ'' مطبوعہ زمیندار لاہور ۵ اپریل ۱۹۱۲ء اور ''عالم خواب'' منظومہ دسمبر ۱۹۱۲ء مطبوعہ خاتون علی گڑھ جنوری ۱۹۱۳ء سیاسی نوعیت کی ہیں۔ عالم خواب ایک طویل نظم ہے جس کا پس منظر طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہے۔ اٹلی نے ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ترکی پر حملہ کیا۔ یہ جنگ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء تک جاری رہی۔ اٹلی نے جرمنی، آسٹریا، انگلستان، فرانس اور روس کے ساتھ معاہدے کرکے طرابلس لے لینے کی منظوری حاصل کرلی تھی اور بالآخر طرابلس میں فوج اتار کر الحاق کا اعلان کردیا۔

عالم خواب ستر اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ہے جس میں طرابلس پر اٹلی کی فوج کے قبضے کے بعد کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

انیسہ خاتون لکھتی ہیں کہ

''سلطنت عثمانیہ کے ساتھ جو والہانہ عقیدت ومحبت مسلمانانِ عالم کے دل میں تھی اس پر اٹلی کی حریصانہ فوج کشی نے اور بھی تازیانہ لگادیا تھا۔ مرحومہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جبکہ ایک عزیز ترین اسلامی سلطنت سے ایک فریب کار یورپی طاقت کا صرف ہوسِ ملک گیری کے لیے تصادم ہورہا تھا۔ اس زمانے کی ان کی معرکۃ الآراء مثنوی عالم خواب ہے۔ اس میں طرابلس کے اطالوی کیمپوں میں مسلمان قیدیوں کا بے باکانہ مکالمہ اطالوی جرنیل کے ساتھ دکھایا گیا

ہے اور انجام کار ان لوگوں کے فائز بہ شہادت ہونے کا منظر نظم کیا ہے۔ یہ سچے واقعات جو اخبارات میں وقتاً فوقتاً ان کو بطور اپنے چشم دید خواب کے بیان کیا ہے۔''......۳

یہ رزمیہ مثنوی ہے۔ بے حد رواں اور پرجوش ہے اس میں ان کی شاعری کا ایک اور رخ سامنے آرہا ہے جس میں سلاست اور روانی کے ساتھ جوش اور جذبے کی کیفیت بھی موجود ہے۔ مثنوی سے منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔ ؎

ہمارے دل پہ ہجوم غموم دنیا تھا — خدا کے گھر پہ کیا کافروں نے حملہ تھا

کہیں ملا نہ سفر کی بہت نگہ میں نے — بحال زار کیا قصدِ خوابگہ میں نے

بندھا کچھ ایسا تصور کہ دیکھتی کیا ہوں — طرابلس کے درختوں کے زیر سایہ ہوں

وہاں جو کچھ نظر آیا وہ ہے اصح صحیح — بہت سے نامہ نگار اس کی کرتے ہیں توضیح

بپا تھا سر بفلک کیمپ اٹلی والوں کا — تمام شہر پہ قبضہ تھا بدخصالوں کا

زباں سے نکلا کہ اے تیری شان کے قرباں — ریاض خلد میں! اور دخلِ لشکرِ شیطاں

مچا یہ شور کہ فخر اطالیہ آئے — یہ لو بنفس نفیس آپ کینوا آئے

ادائے طنز سے بولا اطالوی شیطاں — ابھی حضور کہاں۔ کافروں کا کیمپ کہاں؟

عروج ہی کو ہوا کرتی ہے زوال پہ فتح — صلیب کو ہوئی پھر کس طرح ہلال پہ فتح

بتاؤ اب ہیں وہ عثمانؓ و عمرؓ عاصؓ کہاں — کہاں ہیں آپ کے وہ فاتحانِ خاص کہاں

کہا کڑک کے انہوں نے خموش رہ کافر — جو خیر چاہے تو بس آگے کچھ نہ کہہ کافر

اطالوی بھی عدوئے شہ بشر ﷺ نکلے — خدا کی شان ہے۔ لو چیونٹی کے پر نکلے

خبیث! اسمِ شہ پاک ﷺ۔ اور تیرا منہ — صحابہ رضی اللہ عنہم شہِ لولاک ﷺ۔ اور تیرا منہ

نہیں ہے یاد تمہیں اپنی ذلت و توہین — تمہارے حلق تھے اور خنجرِ صلاح الدین

ہم اب بھی ہیں وہی سرشار جام لاغالب — ارے غلام محمد ﷺ ہوں رحم کے طالب

یہ سن کے دیوٹش پر غضب کا بھوت چڑھا — منہ اس کا سرخ ہوا جیسے آگ میں لوہا

کہا کہ ہاں ۔ مرے شیرو! انہیں سقر پہنچاؤ — چھٹی کا کھایا پیا باغیوں کو یاد دلاؤ

اس کے بعد شہادت کا حال ہے۔

بشر کو رب سے ملادیتی ہے شہادت ہی — ملائکہ سے بڑھادیتی ہے شہادت ہی

یہ باغ وہ ہے کہ ہے دیکھنے میں خار سے پُر　　　مگر ہے اصل میں گلہائے عطر بار سے پُر

یہ طور وہ ہے کہ پہلے ہونار کا دھوکا　　　قریب جاؤ تو ہے نور پاک ربّ علا

یہ جام وہ ہے کہ ظاہر میں خوں سے ہے لبریز

مگر پیو تو شراب طہور و لذت خیز

مجموعہ کلام فردوس تخیل کے دور ثانی میں ۱۸ نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک کے عرصے میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں کلام و بیان کی پختگی نمایاں ہے' ان کے مضامین میں سیاسی' سماجی مضامین کے ساتھ مناظرِ فطرت کا متوازن امتزاج ہے تاہم ان میں سیاسی اور سماجی شعور واضح نظر آتا ہے۔ خصوصاً اس حصے میں نسائی حوالے سے فکر و ادراک کی ایک نئی جہت بھی ہے۔ ان کا نسائی شعور غیر معمولی اور سچے احساسات و تجربات کے ساتھ اظہار کی سطح پہ قاری کو متاثر و متفق کرتا ہے۔ پہلی نظم ''اپیل'' ہے' اس کے نیچے بریکٹ میں بابت امداد ہلال احمر تحریر ہے۔ یہ نظم پردہ نشیں آگرہ میں فروری ۱۹۱۲ء میں چھپی پھر ترمیم کے ساتھ شریف بی بی لاہور میں ۲۸ مارچ ۱۹۱۳ء اور تہذیب نسواں لاہور میں ۱۲ اپریل ۱۹۱۳ء کو شائع ہوئی۔ اس نظم میں خواتین کو مخاطب کر کے ہلال احمر کو امدادی چندہ دینے کی اپیل کی گئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ یورپ کی طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ پر یلغار کردی تو ہندوستان کے مسلمانوں میں ترکوں کی امداد کا جوش و جذبہ جاگا۔ اور اس موقع پر برصغیر کا ہر فرد اپنی ترک بھائیوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ زخ ش بھی اس حادثے سے ملول و مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ متحرک بھی تھیں۔ انہوں نے جہاں خود اپنے اور خاندان کی طرف سے چندے کی رقم فراہم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہاں اس دوران ترکی کے حالات پر متعدد نظمیں لکھیں جو مقبول ہوئیں۔ یہ منظوم ''اپیل'' برائے امداد ہلال احمر متاثر کن رہی اور کئی متعدد اخبار و رسائل میں شائع ہوئی۔ اس طرح انہوں نے جنگ طرابلس اور جنگ ہائے بلقان کے دوران نہ صرف عملی طور پر چندے میں حصہ لیا بلکہ قلمی سطح پر بھی خدمت انجام دی۔ نظم اپیل میں ان کے زبان و بیان کی روانی کے ساتھ جوش و جذبے کا ایک ایسا انداز ہے جو ہر ایک کو متاثر کرتا ہے۔ خصوصاً برصغیر کی خواتین جو روایتاً خاموش تماشائی تھیں۔ انہیں بیدار کرنے کیلئے ایسی ہی باثر نظم کی ضرورت تھی۔ مخمس کے انداز میں یہ نظم چودہ بندوں پر مشتمل ہے اس میں اس وقت کے حالات جن سے ترک گزر رہے تھے تحریر کرنے کے ساتھ تاریخی حقائق اور ہندوستان میں انگریز حکومت کی منافقانہ پالیسی کا بھی ذکر ہے۔ اس نظم کے چند بند یہاں نقل کررہی ہوں۔

اے گوشہ گیر بہنو! اے پردہ دار بہنو　　　عفت مآب بہنو! عصمت شعار بہنو

کیوں آج ہورہی ہے ہر سو پکار بہنو　　　کیوں آج بزم دیں ہے ہنگامہ زار بہنو

کیوں آج اہل ملت ہیں سوگوار بہنو

سینہ زمین کا شق ہے گردوں کی چشم تر ہے
ہلتا ہے عرش اعظم جبرئیل نوحہ گر ہے

کیسی یہ ہائے و ہو ہے کیسا یہ شور و شر ہے
تم کو بھی کچھ خبر ہے؟ تم پر بھی کچھ اثر ہے

ہے دین پر مصیبت اے دیندار بہنو

دین محمدی کی وہ یادگار عظمت
وہ فاتحان عالم کی آخری حکومت

وہ سلطنت کہ ترکی کہتی ہے جس کو خلقت
وہ جس کے زیب کوشک ہے مسند خلافت

یورپ کی ڈپلومیسی کی ہے شکار بہنو

آخری دو بند میں لکھتی ہیں۔

ہے دل سے جاں سے زر سے اسلام کی اعانت
مسنون۔فرض۔واجب ارکان دین کی صورت

زر سے بھی گرنہ کی کچھ خدام دین کی خدمت
ہونا نہ شاہِ دیں ﷺ سے کل طالبِ شفاعت

لازم ہے کچھ خیالِ روزِ شمار بہنو

ہوسرخ روبناکر۔ بزمِ ہلال احمر
اس کام میں ہے مضمر۔ اجرِ جہادِ اکبر

قربان بھائیوں پر مال و متاع و زیور
ہے فانی اور محقر۔ ہم کیا کریں گے رکھ کر

کیا مال ہے بھلا زر۔ جاں ہے نثار بہنو

اس دور کی دوسری نظم ''شہرآشوب اسلام'' خاتون علی گڑھ میں اپریل ۱۹۱۳ء میں چھپی۔ یہ شہرآشوب اسلام شبلی کی مشہور مثنوی شہرآشوب اسلام سے متاثر محسوس ہوتی ہے۔ اگر چہ بحر اور ردیف شبلی سے مختلف ہے لیکن آخری شعر میں ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کی شہرآشوب نے انہیں بھی ایک شہرآشوبِ اسلام لکھنے کی تحریک دی۔ یہ طویل نظم ہے جو چارحصوں پر مشتمل ہے ہر حصے میں آٹھ اشعار ہیں اس طرح اس میں ۳۲ اشعار ہیں جن میں بلاغت و روانی اپنے عروج پر ہے۔ ابتداء میں عظمت اسلام کا مرقع پیش کیا گیا ہے اور اس اوج وکمال کا ذکر ہے جو مسلمانوں نے علوم، فنون، تجارت و سیاست میں حاصل کیے۔پھر اس تنزلی کا دکھ ہے جس سے اس وقت کے مسلمان دوچار تھے خصوصا ترکوں کی شکست اور سلطنت عثمانیہ کے زوال کا دکھ اس میں نمایاں ہے۔اس نظم سے چنیدہ اشعار یہاں نقل کررہی ہوں۔

ہوا کچھ ایسی ہے بگڑی کہ عقل حیراں ہے
الٰہی یہ چمنستاں ہے یا بیاباں ہے

نہ باغ کی روشوں سے ہے عقل چکر میں
نہ لالہ ہے نہ صنوبر نہ سرو وریحاں ہے

نہیں ہے ڈھیر گلوں کا رکھی ہے نعش بہار
کہ جس پہ بلبلِ ناکام مرثیہ خواں ہے

یہ کیسا باغ تھا سوچو ذرا مسلمانو
گری ہے کس پہ یہ برقِ بلا مسلمانو

یہ باغ۔ آہ یہ بادِ فنا کا سیل زدہ
ریاضِ مذہب اسلام تھا مسلمانو

وہ عندلیب ترانے تھے جس کے جانِ چمن
اُسے خوش آئی عدم کی فضا مسلمانو

وہ قوم جس سے ہے توحید زندہ نزع میں ہے
میانِ جنگ فنا و بقا مسلمانو

جوچاہو لبِ لباب اس کا ایک جملے میں
سنو کہ دینِ محمد ﷺ ہے آج خطرے میں

ہماری مشرق و مغرب میں تھی حکومت آہ
ہر ایک سمت چمکتا تھا اپنا کوکبِ جاہ

ہمارے علم کا تھا جلوہ گاہ نیشاپور
ہمارے مال کا تھا صقلیہ تجارت گاہ

ہمارا جاہ وحشم پوچھو قصرِ حمرا سے
ہماری شان کے غرناطہ کے کھنڈر ہیں گواہ

ہٹی اطاعتِ رب کی سپرجوسینوں سے
تو شیر بن کے مقابل ہوئے جو تھے روباہ

اٹھی وہ قوم جو تھی لیس کیل کانٹے سے
جو مسلموں کے تنزل کی دیکھتی تھی راہ

وہ قوم جس نے سدا تیشہِ مظالم سے
کیا شکستہ دلِ نائبِ رسول ﷺ اللہ عزوجل

نہ پوچھو ہم نفسو بار بار کیا ہیں ترک
سنو وجود خلائق کا مدعا ہیں ترک

خروش فتح کی ہیں گونج زیر گنبد چرخ
جیوشِ جاہ وحشم کے نشانِ پا ہیں ترک

خدا کے گھر کے ہیں جاروب کش بفضلِ خدا
مجاورِ لحد سیدالورے ﷺ ہیں ترک

نہیں ہے بحر عمیق جہاں میں ہولِ فنا
جہازِ ملت بیضا کے ناخدا ہیں ترک

اگرچہ خرمنِ جانِ عدو کو ہیں آتش
ہماری بزم میں فانوسِ پُر ضیا ہیں ترک

یہ قول شبلی علامہ حرفِ قسمت ہے
زوالِ دولتِ عثماں۔ زوال ملت ہے

تیسری نظم ''زندہ باد انور پاشا'' خاتون علی گڑھ میں مئی ۱۹۱۳ء کو شائع ہوئی۔انور پاشا ترکی جرنیل اورسیاستدان تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے میں سرگرم حصہ لیا تھاجنگ بلقان میں جب ترک شکست سے دوچار ہورہے تھے اس وقت کے مدارالمہام مصطفیٰ کامل کمزور شرائط پر مصالحت کیلئے کمزور آمادہ ہوگئے تھے جس پر ترکی میں ہنگامہ ہوگیا۔ انور پاشا نے اس موقع پر انجمن اتحاد وترقی کے جھنڈے تلے رفقاء کو جمع کر کے مصطفیٰ کامل کو استعفے پر مجبور کردیا اورعنان حکومت سنبھال لی۔ انہوں نے بلقانی ریاستوں پر حملہ کردیا۔ انور پاشا نے اسلامی سلطنتوں سے امداد لینے

کیلئے باضابطہ رابطے کیے اور ہندوستان میں اس تحریک کے فعال ہمدردوں کی بڑی تعداد ان کی مددگار ہوگئی۔ مولانا ظفر علی خان اس تحریک کے ہندوستان میں مرکزی رہنما تھے۔ اس طویل نظم میں زخ ش نے انور پاشا' انجمن اتحاد وترقی اور ان کے رفیقوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ترکوں کی جدوجہد خصوصاً جنگ بلقان کی پوری تاریخ بیان کردی ہے۔ اس طویل مسدس سے انتخاب یہاں پیش کررہی ہوں۔

ساکنانِ ارض کے لب پر ہے دن بھر زندہ باش
رات بھر کہتے ہیں چرخ و ماہ و اختر زندہ باش
اتحادی انجمن ہے جسم۔ روح جسم تو
ہیں اراکینِ وزارت پھول تو تو پھولوں کی بو
ہے ابھی محفوظ یاد خلق وہ دورِ سعید
جب طرازِ سلطنت تھے حضرتِ عبدالحمید
جامع الاوصاف تھی گو آپ کی ذاتِ مجید
پھر بھی تھی حریتِ افراد کی حاجت شدید
توہی شخصیت مٹانے میں ہوا تھا کامیاب
جس سے ترکی میں ہوا مشہورِ عالم انقلاب
آدمیت جب ہوئی جذباتِ حیوانی سے پست
امن جوئی کو ملی جب فتنہ زائی سے شکست
جب ہوا عدل و صداقت پر تعصب چیرہ دست
اہل اٹلی نے کیا جنگ و جدل کا بندوبست
کیسی وحشت سے کیا اسلامیوں کا قتلِ عام
ظالموں کے دل میں تھا کس دن کا جوشِ انتقام
یہ خبر سب نے سنی حرماں۔ قلق حسرت کیساتھ
تونے لیکن عزم استقلال اور ہمت کے ساتھ
جمع تونے ملک کے جنگی قبائل کو کیا
اور ہوا شان دلاویزی سے یوں نغمہ سرا

ساتھ لایا ان کو کفرہ سے بصد جاہ و جلال
کامیابی ہوگئی اٹلی کو القصہ محال

احمقوں کی ناقص العقلی ہوئی جب رونما
صدراعظم دولت عثماں کا جب کامل ہوا

مل گیا یوروپ کے قزاقوں سے کامل الغرض
ہاتھ اٹھایا دیں سے ڈھائی لاکھ پاؤنڈ کے عوض

اس نے بلقانی شرائط کو کیا تسلیم جب
سرویا۔ بلغاریا۔ یونان تھے وقفِ طرب

بھڑکی آخر تیرے دل میں آتشِ غیظ و غضب
اور وزارت کو کیا تبدیل لے کر نام رب

کارنامے لکھ سکے تیرے یہ کس کی تاب ہے
بارگاہِ حق میں اب عرضِ دل بے تاب ہے

نیراعظم سے جب تک دن کی آب و تاب ہے
دہر میں جب تک چراغ بزم شب مہتاب ہے

تجھ سے اے انور کریں کل اہل ملت کوکب نور
تو ہو مسلم کے لئے شمع رہِ عقل و شعور

دولت عثماں بعالم زندہ و پائندہ باد
نیر اقبالِ او رخشندہ و تابندہ باد

دوسرے حصے کی مذکورہ بالا تین نظمیں ''اپیل'' ۔''شہر آشوبِ اسلام'' اور ''زندہ باد انور پاشا'' ترکی پر یورپی ریاستوں کے حملے سے پیدا ہونے والے غم و غصے کے جذبات اور اس دور کے واقعات و حالات سے متعلق ہیں۔ ان نظموں میں ان کے دور کا خصوصا برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ نظمیں اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ ان کی لکھنے والی شاعرہ نہ کسی سیاسی تنظیم کی رکن ہیں نہ کسی مبلغ کے زورِ بیان سے متاثر ہیں۔ وہ اپنے گوشہ تنہائی میں حالات کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہوئے جو محسوس کرتی ہے اسے بلا کم و کاست بیان کررہی ہے۔اس طرح وجود کی آواز اپنی سچائی کی وجہ سے اس عہد کی آواز ہوگئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی جذبات ان کے ہم عصر شعرا کے یہاں بھی منظوم ہورہے تھے اور

نثری مضامین کا حصہ بھی بن رہے تھے۔ جب شبلی نے شہرآشوبِ اسلام میں لکھا۔

کہیں اُٹھ کر یہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئے

غبارِ کفر کی یہ بے مہابا آندھیاں کب تک

زوال دولت عثماں۔ زوال شرع و ملت ہے

عزیزو! فکر فرزندو عیال و خانماں کب تک

اسی وقت یہ شاعرہ بھی بہنو سے مخاطب ہوکر نظم اپیل میں کہہ رہی ہیں۔

فصلِ خزاں کے اندر دل باغ باغ کب تک؟ بہنو سکون کب تک؟ بہنو فراغ کب تک

کب تک یہ خواب غفلت؟ اے ہوشیار بہنو

اور شہر آشوبِ اسلام میں تو انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا۔

یہ قول شبلی علامہ حرفِ قسمت ہے

زوال دولتِ عثماں۔ زوالِ ملت ہے

تیسری نظم ''زندہ باد انور پاشا'' بھی دولتِ عثماں کیلئے ان کی دعاؤں کے ہی سلسلے کی کڑی ہے۔ ترکی میں اسلامی مملکت کو دوچار خطرات پر ان کی گہری نظر تھی ان کے حالات پر تکلیف کا احساس ہے اور مدد کا پر خلوص جذبہ ان کے دل میں موجزن تھا۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے برصغیر کے تمام مسلمانوں میں خصوصاً خواتین میں یہی جذبات جگانا چاہتی تھیں۔

چوتھی نظم ''مسجد کانپور کی باتیں'' کے حاشیے پر منظومہ اکتوبر ۱۹۱۳ء لکھا ہے۔ انیسہ خاتون حیات زخ ش میں لکھتی ہیں۔

''۱۹۱۲ء میں جب مسجد کانپور کے وضو خانے کا انہدام عمل میں آیا تو مسلمانوں میں بے حد جوش وخروش پیدا ہوا اور اہلچل مچ گئی۔ اس موقع پر زاہدہ خاتون کے جذبۂ احساس ملی کو بھی زبردست ٹھیس لگی۔''

اس واقعے پر برصغیر کے مسلمانوں میں شدید ردعمل پیدا ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اخبار الہلال میں اس اقدام پر سخت تنقید کی اور انہیں رانچی جیل میں نظر بند کیا گیا۔ اس حوالے سے مسلح تصادم بھی ہوئے جن میں جانیں ضائع ہوئیں۔ شبلی نے بھی اس سانحے پر ایک اثر انگیز نظم لکھی تھی؛ جس کا ایک مصرع زبان زد عام تھا۔

ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں

انیسہ خاتون کے مطابق واقعہ کانپور پر زخ ش نے متعدد نظمیں لکھیں جو اخبارات خصوصاً زمیندار لاہور میں چھپتی رہیں۔ انہوں نے ایک نظم ''عید کی خوشی میں غمزدگانِ کانپور کی یاد'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ نظم فردوس تخیل میں شامل نہیں۔ انیسہ خاتون نے پوری نظم نقل کی ہے جو درج ذیل ہے۔

حسرت فزا ہے اے مہ نو تیرا نور آج
ہے سنگِ غم سے شیشۂ دل چور چور آج

جنگ طرابلس نے کل آرامِ دل لیا
جاں لے رہا ہے معرکۂ کانپور آج

چھلنی ہوئے قلوب رعایائے شاہِ جارج
چہروں میں ٹرائیلر کے نہیں کچھ فتور آج

شملے سے رد ہوا جو ہمارا میموریل
سرجیمس و ٹائیلر کا فزوں ہے غرور آج

یاد آتا ہے غم و الم بیوگاں ہمیں
جو ہورہی ہیں زندگیوں سے نفور آج

یاد آرہے ہیں بھوک سے فاقوں سے مضمحل
بچوں کے ننھے ننھے دلِ ناصبور آج

یاد آتے ہیں پولیس کے چھپائے ہوئے شہید
جن کے نہیں جہاں میں نشان قبور آج

یاد آرہے ہیں ہم کو وہ مجروح سیف ظلم
جن کی نگہ میں تیغ ہے تیرا ظہور آج

یاد آتے ہیں سلاسل و زنداں کے وہ اسیر
مذہب کی پائے بندی ہے جن کا قصور آج

نزہت صحیح یہ ہے کہ نہیں مرجع و مفر
مسلم کا غیر درگہ ربِ غفور آج

اس سانحے سے متعلق ایک نظم ''مسجد کانپور کی باتیں'' فردوس تخیل میں شامل ہے اس نظم میں زخ ش کا سیاسی شعور پوری طرح سامنا آ رہا ہے۔ یہ نظم ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی تھی اور انہوں نے جاگتی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کا انگریز حکومت سے سرپرستانہ توقعات خیالِ خام ہے۔ چند اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

جب شہادت مسجدو خدام مسجد کو ملی
عرش تک پہنچوں گا میں مسلم کے شیون نے کہا

پھٹ گیا محکوم و حاکم کا لباسِ اتحاد
اَلفراق اے ہمنشیں۔ چولی سے دامن نے کہا

بیل یہ ہم کو منڈھے چڑھتی نظر آتی نہیں
ٹائکر نے سم نے اور سر جیمس مسٹن نے کہا

رفعتِ والاں سے پستی درجۂ مسجد کی ہے
زاہدہ! میرے دماغِ عرش مسکن نے کہا

اس دور کی پانچویں نظم ستمبر ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی۔ اس کا عنوان ہے ''جنگِ فرنگ'' ۔پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء میں چھڑی تھی اس میں یورپ کی تمام چھوٹی بڑی سلطنت برسرپیکار ہوگئی تھی۔ ترکی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس نظم میں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ یورپ کے غاصبانہ اور فاسقانہ رویوں پر تنقید طنزیہ انداز میں ہے۔ بہت ماہرانہ تخلیقی انداز میں اس نظم میں جنگ کی تاریخ بھی ہے' تنقید بھی اور اس پر اپنا ردِّعمل بھی۔ نظم سے کچھ اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

برپا کیا وہ حشر سپہ کے خرام نے
ہتھیار ڈالے امن نے فتنے کے سامنے

چرخِ زمانہ دیدہ لگا دل کو تھامنے
زیرِ زمیں پناہ کہا روحِ سام نے

مغرب کا نعرۂ مـــلـــن الـــمـــلـــک تھا غضب
اس مینڈکی کو مار ہی ڈالا زکام نے

جوہر دکھا پہن کے لباسِ برہنگی
شمشیر سے کہا یہ لپٹ کر نیام نے

کھیلا گیا وہ کھیل۔ زمیں جس سے ہل گئی
مانگی پناہِ رب فلک نیا فام نے

ہے زمہ دار قتلِ ملک زادہ سرویا
چھڑوائی جنگ اسی فرسِ بے لگام نے

جوزف فرانس کی حکومت کو کردیا
اندھا جنونِ ولولۂ انتقام نے

پایہ جو بیلجیئم نے قوی اپنی پشت کو
ٹھکرادیا پیام عدو خاص و عام نے

بھاری ہے ایک پلہ ترازو کا بے قیاس	جاپاں کو ورغلایا اسی طمعِ خام نے

دیکھا صف جدال میں مقصود کا جمال	لندن کے ہوشمند رجالِ کرام نے

جرمن پہ ہے تفوقِ برطانیہ کا طنز	سنداں کو کیوں رسید کیا لطمہ جام نے

بکرے کی ماں کا خیر منانا فضول ہے	دل سے کہا خلیفہ خیرالانام نے

بے اختیار دل سے نکلتا ہے ''لانگ لو''

تسخیر کر لیا مجھے قیصر کے نام نے

قیصر کے لئے ہاشیئے پر لکھا ہے''ذات خوش صفات شاہ جارج پنجم'' مراد ہے۔

چھٹی نظم''آمدورفت'' منظومہ یکم اپریل ایک وائسرائے کے جانے اور دوسرے کے آنے پر ہے۔نظم سادہ ہے۔اس سے پہلا اور آخری شعر نقل کر رہی ہوں۔

آتے ہیں لارڈ چیمسفرڈ جاتے ہیں لارڈ ہارڈنگ

ان کے لئے خوش آمدید۔ ان کے لئے ہے خیرباد

چاہیے ہم کو چشم داشت لطفِ خدائے پاک سے

حضرتِ چیمسفرڈ بھی یونہی کریں گے ہم کوشاد

ان دونظموں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے والد کی تنبیہ کو مدنظر رکھا ہے اور انگریز حکومت کے لیے ایک غیر جانبدارانہ سارویہ اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔

دورثانی کی ساتویں نظم''مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو احساں ہوتا'' ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی۔ جیسا کہ اس کے عنوان سے واضح ہے کہ یہ نظم ایک موضوع پر ہے اور وہ موضوع ہے انسان کا انسان پر احسان اچھا نہیں ہے۔ یہ غلامی اور محکومی کا ذریعہ بن جاتا ہے اپنے ان خیالات کو انہوں نے مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اشعار میں اُن کا زوربیان کمال پہ ہے۔ یہاں چند اشعار نقل کر رہی ہوں۔

اے خوشا انساں اگر منت کشِ انساں نہیں

اے خوشا غم غمگساروں کا اگر احساں نہیں

ہاں بشر پر بار احسانِ بشر اچھا نہیں

جیل اچھی۔ دار اچھی۔ یہ مگر اچھا نہیں

آگے لکھتی ہیں۔

اے خدا بے آبرو جینے سے مرجانا بھلا
ناخدا کی نازبرداری سے بہتر ڈوبنا

ہوجو ممنون بشر اس ہستی فانی پہ خاک
تشنہ لب مرنا گوارا۔ غیر کے پانی پہ خاک

اے خدا کیجو نہ مجھ کو غیر کا احسان مند
ہوں ترے در کے سوا کل خلق کے در مجھ پہ بند

وہ اپنے روزمرہ کے رویوں میں بھی دوسروں کے احسان لینے سے گریز کرتی تھیں اور یہی خیالات پوری شدت کے ساتھ اس نظم میں لکھے گئے ہیں۔

دور ثانی کی آٹھویں نظم ''دیارِ حبیب'' ستمبر ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی اس کے حاشیے میں تحریر ہے کہ ۱۹۲۰ء میں تقلیل و تکثیر ہوئی ہے۔ اس تبدیلی و اضافے کی وجہ نظم میں موجود ہے۔ اس نظم کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب ان کے والد نے بچوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں حاضری کا ارادہ کیا تھا۔ جس کی انہیں بے حد خوشی تھی اور چشم تصور میں انہوں نے خود کو مدینہ منورہ میں دیکھا بھی تھا۔اس نظم کے آغاز میں بھی یہی کیفیت موجود ہے۔ اس پروگرام پر عمل نہیں ہوسکا جس کی وجہ پہلی جنگ عظیم کا چھڑنا تھا۔ نظم دیارِ حبیب میں یہ وجہ بھی منظوم ہے۔ جیسا کہ نظم کے عنوان سے ظاہر ہے اس میں سرزمین یثرب سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس زمین کو وہ رفعت حاصل ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا روضہ اقدس یہاں واقع ہے۔ ساٹھ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی کی شکل میں ہے اس کے چار حصے ہیں اور چاروں حصوں میں اشعار کی تعداد یکساں نہیں ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی مختلف وقتوں میں لکھی گئی ہے۔ پہلے حصے میں سرزمین یثرب کی تعریف و توصیف پوری عقیدت کے ساتھ کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مسلمانوں کا مکہ سے ہجرت کے بعد یہاں پناہ دینے کی مدح سرائی ہے۔ تیسرے حصے میں حضور کے یہاں قیام کا حال اور ان کے اسوہ حسنہ اخلاق و عادات کی تعریف کا بیان ہے۔ چوتھے حصے میں اس زمین کی عظمت کا ذکر ہے جس کی وجہ حضور ﷺ کے مزار اقدس کا اس زمین پر ہونا ہے۔ مدینہ منورہ کی تعریف اس سے عقیدت اور وہاں اپنے دائم قیام کی دعا بہت پر اثر انداز میں اس میں منظوم ہوئی ہے۔ اس مثنوی سے منتخب اشعار یہاں نقل کررہی ہوں۔

اے زمین یثرب! اے محبوب فخرالمرسلین
منزل انوارِ رحمت! مہبط روح الامین

دیدۂ اہلِ نظر کا سرمہ تیری خاک ہے
اے دیارِ خاک تو ہم چشم عرشِ پاک ہے

جب گلِ باغ رسالت خار سے زخمی ہوا
اور عنادل بھی ہوئیں پابندِدام ابتلا

اے دیار پاک یثرب!مرحبا صد مرحبا
تونے مہمانوں کی خاطر سینہ فرش رہ کیا

آہ وہ دہ سالہ دور آسمان لاجورد
تجھ میں جب مسکن گزیں تھا ایک کمبل پوش مردﷺ

نقش ہے دل پر ترے اس شاہ کا جاہ و جلال
حشر تک ممکن نہیں جس کی حکومت کا زوال

تجھ کو یثرب! گنبد اخضر کی حرمت کی قسم
اس میں جو مدفون ہے۔ اس کی حقیقت کی قسم

مجھ سے کہہ اس ننھے منے گوشۂ دنیا کا راز
مجھ سے کہہ بزم رفیق ہستی اعلیٰ کا راز

ہند میں بیتاب ہوں ہر دم مدینہ کے لئے
جس طرح اُفتادۂ دریا ہر سفینہ کے لئے

یاد ہے اس جان موجودات کا کہنا مجھے
کی زیارت جس نے میری قبر کی۔ دیکھا مجھے

چھا گئی غم کی گھٹا دل پر مرے اب کی برس
ہاں برس دل کھول کر اے ابر چشم تر برس

مدینہ منورۂ میں حاضری کے ملتوی ہونے کا دکھ اور وجہ مندرجہ ذیل اشعار ہیں۔

راہ پر تقدیر مری آتے آتے رہ گئی
میں در خیر الوریٰ ﷺ تک جاتے جاتے رہ گئی

جنگ عالم سوز مغرب حیلہ آزار تھی
اصل میں تقدیر مجھ سے برسرپیکار تھی

اے فلک! منظور گر تجھ کو مراجانا نہ تھا
آتش شوق زیارت کو بھی بھڑکانا نہ تھا

کب مجھے آسائش قصر شہانہ چاہیئے
کوئے شہ میں اک بچھونے کا ٹھکانہ چاہیئے

ہو جہاں چشم عدو کی نیزہ بازی سے اماں
گفتگوئے ہمنشیں کی سحرسازی سے اماں

انقلاب دہر کی آفات گوناگوں سے دُور
اشتہار عام کے آلام روزافزوں سے دُور

یہ دل بیگانہ خو تنہائی سے بہلا کرے
خامشی چپکے سے یا رب دلا جایا کرے

راز ہو میری حقیقت لطف ہو میری نمود
شعر ہوں میرے مشاغل شعر ہو میرا وجود

جب تماشا گاہ عالم سے نگہ پھرنے کو ہو
ختم جب ہوجائے ناٹک پردہ جب گرنے کو ہو

جا ملے مطلوب سے جان سراپا انتظار
ماہیٔ تشنہ ہو بحر بیکراں سے ہمکنار

میری تربت ہو الٰہی۔ زیر پا یے مصطفٰے
یہ دعا مقبول ہو یا رب برایے مصطفٰے

مندرجہ بالٰی اشعار میں صرف ۲۱ برس کی عمر میں ان کا مذہب کی طرف ایسا رجحان نظر آتا ہے جس میں عقیدت کے ساتھ ایک والہانہ پن بھی ہے۔ حضور اکرم ﷺ روضہ کی زیارت بھی ان خواہشات میں سے ایک تھی جو اس زود رنج ہستی کی حسرت بن گئی۔

اختتامی بند میں یہ خواہش شدت کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے کہ وہ زندگی کے آخری ایام مدینہ منورہ میں روضہ رسول ﷺ کے قرب میں گزارنا چاہتی تھیں۔ یہ خواہش ہر مسلمان کی دلی تمنا ہوتی ہے اور زخ ش تو اوائل عمر سے ہی مذہب کی طرف مائل تھیں۔

اگلی نظم ''اضغاث احلام'' ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں ایک خواب پریشاں منظوم ہے۔ اس نظم کا عنوان خواب پریشاں بھی ہوسکتا تھا لیکن زخ ش نے اپنی نظموں اور نثر میں عربی محاورے اور تراکیب استعمال کی ہیں جن کا ماخذ زیادہ تر قرآن کریم کی آیات ہیں۔ اضغاث احلام بھی سورہ یوسف میں اس پریشاں خواب کیلئے استعمال ہوا تھا جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے بتلائی تھی۔ یہ نظم طنزیہ ہے۔ اس کے ہر شعر میں سماج' سیاست اور مذہبی جہالت پر چھبتا ہوا طنز موجود ہے۔ اس نظم میں روانی اور مشاہدے کی تیزی اور مزاح کی لطافت کے ساتھ ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے لیئے صیغہ تانیث استعمال کیا ہے۔ مخاطبت بہن سے ہے۔ اس لیے بجا طور پر یہ طنز مردانہ سماج پر ہے۔ اس نظم کے منتخب اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

صبح عشرت ہے۔ خلد ہے ہم ہیں — حور سے شب کا خواب کہتے ہیں
دُور ازحال دیکھتی ہوں اسے — جس کو دارِخراب کہتے ہیں
کچھ عجب حال ہے وہاں کا بہن — کہ خطا کو ثواب کہتے ہیں
رن میں جو غیر کی زمین چھینے — اس کو سب کامیاب کہتے ہیں
شان بیداد و ظلم کو حکام — شیوۂ رعب و داب کہتے ہیں
جرم کرتے ہیں بے حساب خطیب — منہ سے یوم الحساب کہتے ہیں
ان کا عالم ہی دوسرا ہے جنہیں — نکتہ گو نکتہ یاب کہتے ہیں
زہد میں پاتے ہیں وہ بوئے ریا — معصیت کوثواب کہتے ہیں

جیفہ دنیا ہے اور سگ طالب
سچ رسالت مآب ﷺ کہتے ہیں

ان کی اگلی نظم ''تتلی'' مطبوعہ شریف بی بی لاہور ہے۔ چھوٹی بحر کی مسدس کے انداز میں یہ نظم، تتلی کو موضوع بنا کر اس کے حسن کی تعریف سے شروع ہوتی ہے پھر عشق کے مضمون سے بڑھ کر عشق حقیقی پر ختم ہوتی ہے۔ اس طرح یہ چھوٹی نظم جو بظاہر تتلی کے موضوع پر ہے اپنے اندر معنی اور مضامین کی تہہ داری بھی رکھتی ہے۔ اس نظم میں وہ محمد حسین آزاد کی اس تحریک سے متاثر محسوس ہوتی ہیں جس میں انہوں نے نیچر کو شاعری کا موضوع بنانے اور زبان کی سادگی سے نظم کے ایک نئے دور کے آغاز کی دعوت دی تھی۔ ایسی شاعری کے فروغ کے لیے وہ مشاعرے بھی منعقد کرواتے تھے۔ زخ ش بامطالعہ اور اپنے دور کی تمام تحریکوں سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان سے منسلک بھی نظر آتی ہیں۔ ان کا رویہ مکمل علمی اور عملی ہے۔ وہ

شاعرانہ احساس کے ساتھ استدلالی ذہن بھی رکھتی تھیں چنانچہ معاشرتحریکوں سے خواہ وہ سماجی ہوں' سیاسی ہوں یا ادبی متاثر اور وابستہ رہیں۔نظم تتلی ان کے اس رویے کا ثبوت ہے اور اک بہت مختلف سادہ اور خوبصورت انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کے پانچ بند یہاں نمونتاً نقل کررہی ہوں۔

جانتے بھی ہو تتلی کیا ہے یہ اک عشقِ حسن نما ہے
ایک نیاز استغنا کش ایک سکوت شورش زا ہے
ایک طلسمی نقش کشیں
ایک مصورِ علمی جبریں
صانع کی اک صنعت زریں عاشق کا اک نامہ رنگیں
اک متشکل آہِ سوزاں اک متحرک اشک خونیں
شوخی فطرت کا آئینہ
درد محبت کا گنجینہ
ہے ہے عشق تو کوہ غم ہے ننھا سا دل اور عشق ستم ہے
عارض گل کو چومنے والی ماشاء اللہ تو کیا کم ہے
ایسی نازک نیچرل بیوٹی
اور فنا فی العشق کی ڈیوٹی
تیرے سر میں کس کی ہوا ہے کیوں تو آتشِ زیر پا ہے
تتلی! آخر تو کچھ بیاں کر کس کا دھوکا گل پہ ہوا ہے
کس کے تجسس میں ہے یہ جلدی
ایک منٹ سونگھا اور چلدی
تو اور اس کی دید کا ارمان جس سے قاصردیدۂ انساں
ننھی سی ہستی! آ میں سناؤں قصہ طورو موسیٰ عمراں
دید کو کس برتے پہ چلی ہے
نظارے کی طاقت بھی ہے؟

''رخصت بلبل'' اس دور کی اگلی نظم شریف بی بی لاہور میں ۱۵نومبر ۱۹۱۵ء کو شائع ہوئی۔ جہاں ایک بظاہر ایک بلبل کی باغ سے رخصت کا بیاں ہے وہاں استعاراتی نظم بھی ہے۔نظم میں ایک بلبل کا باغ سے جدا ہوتے ہوئے اس کے جذبات کا اظہار ہے مگر اس نظم میں کسی بھی ہستی کی ہجرت کا دکھ بھی محسوس کیاجاسکتا ہے۔خصوصا کسی لڑکی کی میکے سے رخصتی یا کسی خاتون کی عزیزو سے جدائی خواہ وہ موت کی شکل میں ہو یا کسی اور سانحے کی وجہ سے۔ چند اشعار یہاں درج ذیل ہیں۔

دیکھا ہے فرقت گل و بلبل کا جو سماں	رکھے گا یاد اسے دل درد آشنا سدا
ننھی سی عندلیب کا وہ شور۔ وہ فغاں	گونجا کرے گی کان میں اس کی صدا سدا
کہنا وہ رکھ کے سینہ صد چاک گل پہ سر	خنداں ہو تو چمن میں مرے دلربا سدا
تکلیف ہی رہی تری چاہت میں عمر بھر	بے چین ہی رہا یہ دل مبتلا سدا
ہر آنکھ میں کھٹکتی رہی ہے برنگ خار	اے گل تری یہ بلبل رنگیں نوا سدا
گلچیں سے باغباں سے صرصر سے برق سے	دل غم میں دکھ میں ہول میں ڈر میں رہا سدا
تنکے کا بھی مجھے نہ سہارا ملا یہاں	اجڑا کیا جھاڑو پھرا گھونسلا سدا
مل کرشکاریوں سے اسیری کی کوششیں	شرمائیگی فلک کو تری یہ جفا سدا
گلچیں کا ہاتھ دیکھ کے گل کی طرف دراز	ہاتھوں سے تھام تھام کے دل کو رکھا سدا
جاتی ہے تیرا داغ ستم دل پہ لے کے آج	بلبل نہ رہنے والی تھی او بیوفا سدا
سہنی پڑے گی تجھ کو ملامت ضمیر کی	یوں اپنی سختیوں پہ نہ اترائیگا سدا

اس دور کی اگلی نظم ''جوش محبت'' طویل نظم ہے اور چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے کے قوافی بدلے گئے ہیں۔ یہ نظم ایک واقعے سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ لندن میں نیوز ایجنسی رائٹر کے مالک نے اپنی بیوی کی موت پر خودکشی کر لی تھی۔ اس واقعے نے انہیں ایک طویل مختلف الجہتی نظم لکھنے کی تحریک دی۔ اس نظم ''جوش محبت'' کا آغاز لندن شہر کی تعریف' اس کی عمارات و مناظر کا تصوراتی ذکر اور وہاں اپنی نارسائی کا حوالہ دینے کے بعد دوسرے بند میں اس واقعہ خودکشی کا ذکر ہے۔تیسرے بند میں محبت و الفت کی تعریف ہے اور چوتھا بند عشق حقیقی کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ نظم شروع سے آخر تک خوبصورت ہے اس میں شوخی' بے ساختگی اور رجائیت نمایاں ہے۔اس نظم کا لب لباب یہ ہے کہ مذہب سے دوری اور الحاد نے نفسیاتی طور پر مغرب کو مایوسی کی طرف دھکیل دیا ہے اور وہ عشق کی آتش کوسہنے اور فراق کو برداشت

کرنے کے بجائے خودکشی کی صورت میں راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ شاعرہ نے اس نظم میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کے خوبصورت سفر کی راہ کو بھی اجاگر کیا ہے۔ نظم کے چاروں حصوں سے منتخب اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں تا کہ چاروں جہتیں نمایاں ہو جائیں۔

استادہ ہے خاموش۔ رعونت میں بھری ہے ‏ لندن نگہ شوق میں مغرور پری ہے
باتیں نہیں کرتا ہے یہ مینارِ فلک سے ‏ بیچارہ پہ طعنہ زن کوتاہ نظری ہے
ناپی ہوتو بتلاؤں عمارات کی رفعت ‏ یاں مرغِ نظر کو غمِ بے بال و پری ہے
باغوں میں کھلا رکھے ہیں انساں نے نئے گل ‏ ہر گل پہ گماں ہو کہ تصنع سے بری ہے
وہ ٹیمس کے ساحل پہ حسینوں کا ٹہلنا ‏ آئینۂ دریا میں عجب جلوہ گری ہے
ریلیں ہیں زمین دوز۔ فلک بوس غبارے ‏ حیرت سے پراگندہ دماغِ بشری ہے
روپوش ہے مذہب۔ نظر افروز ہیں گرجے ‏ راہب کو دعا سے گلہ بے اثری ہے
ہے رحلتِ دیں سے لبِ غافل متبسم ‏ انجام نگر آنکھ میں اشکوں کی تری ہے

قوموں کے لئے موت کا پیغام ہے الحاد
انساں کے لئے زہر بھرا جام ہے الحاد

لندن میں اسی خطہ معمور کے اندر ‏ ہیں آج کل اک واقعہ سے سب متحیر
مشہورِ زمن رائٹر ایجنسی کا مالک ‏ بے موت ہوا دائرۂ زیست سے باہر
جب اس کی زنِ ماہ وش ایڈتھہ نے قضا کی ‏ تاریک ہوا دہر نگاہوں میں سرا سر
سوچھا سرتابوت وہی کام اسے بھی ‏ کرتے ہیں جو سودا زدۂ زلفِ معتبر
جس دلبرِ جاناں کو دیا نقد دل اس نے ‏ آخر گہرجاں بھی کیا اس پہ نچھاور
وہ منبعِ الحاد جسے کہتے ہیں یوروپ ‏ واں روز نظر آتے ہیں یہ سین یہ منظر

تیسرے بند میں لکھتی ہیں ۔

مقصود رسی کی انہیں بتلاتی ہوں راہیں ‏ جو مدرسہ مہرووفا کے طلبا ہیں
ناکامی و حرماں میں بہت سہل ہے مرنا ‏ ہے مرد وہی جی کے جو الفت کو نبھائیں
ہے جانیں عطیات خداوندِ محبت ‏ بے بہرہ ہیں جو اس سے وہ بے برگ ونوا ہیں

ارباب نظر ان پہ ہیں سوجان سے قرباں جو جامع مہر و کرم و حسن وادا ہیں

ہے قول امیر ان پہ جو مائل نہیں ہوتا

کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

آرام دل و جان ہیں آلام محبت ہیں اہل بقا کشتہ صمصام محبت

جا پہلے زباں پاک کر آ ! لوث ریا سے طاہر ہے مقدس ہے نہ لے نام محبت

جز دوست کسی اور کے آگے نہ جھکا سر بچ شرک سے اے پیرو اسلام محبت

حج کعبہ مقصد کا مقصود ہے تجھ کو ہمت کی طرح باندھ لے احرام محبت

نزہت سے سرور اس مے بے دُرد کا پوچھو کہتے ہیں وہ ہے جرعہ کش جامِ محبت

ہر شے میں مرے پیارے کا جلوہ ہے نمایاں اے صل علی لذت انجام محبت

ہے منتظم محفلِ امکاں غمِ الفت

ہے ماحصلِ ہستی انساں غم الفت

اگلی نظم ''ایلبا سے پیرس کو'' ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے اس میں بھی نپولین بوناپاٹ کے آخری ایام افسانوی انداز میں منظوم کیے گئے ہیں۔ نپولین کے آخری ایام پر پہلے بھی ایک نظم ''قید فرہنگ کا خاتمہ'' اس مجموعے میں شامل ہے جس کا ذکر آچکا ہے یہ دوسری نظم انقلاب فرانس پر ہے۔ اس میں نپولین کی تعریف ہے۔ دو نظمیں نپولین سے ہمدردانہ انداز میں لکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کو تاریخ کا ہیرو سمجھتی تھیں اور اس سے متاثر تھیں۔ اس نظم انہوں نے نپولین کی وجاہت' وقار اور انقلاب فرانس کی تصویر کشی کے ساتھ اختتام ان اشعار پر کیا ہے۔

قائم نپولین نہ رہا گرچہ تخت پر اسباب ہیں زوال کے بالکل جدا مگر

کاہش ہی ماہ چار دہم کا مآل ہے دنیا میں ہر کمال کو اک دن زوال ہے

آتا نہیں کچھ اس سے خلل نام و ننگ میں ''گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں''

لیتے ہیں جوشِ ہمت مردانہ سے جو کام قرطاسِ روزگار کی زینت ہے انکا نام

رستم رہا زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا

''مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا''

(تضمین)

دوسرے دور کی آخری پانچوں نظمیں براہ راست خواتین سے متعلق ہیں۔ پہلی نظم اپریل ۱۹۱۵ء کو مسلم لیڈیز کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس نظم میں خواتین کو ان کے دینی' سماجی اور روزمرہ کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی نصیحت ہے۔ اس وقت جبکہ خود ان کی عمر بہت کم تھی عقل و دانش کا یہ رنگ جو اس نظم میں نظر آتا ہے پختہ شعور کی نشاندہی کر رہا ہے۔ چند اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

بہنو! خدا کے واسطے اٹھو نماز کو — رکھ دو درِ خدا پہ جبینِ نیاز کو

ہیہات اپنے ہاتھ سے کرتی ہو بند تم — روزے نہ رکھ کے خلد کے درہائے باز کو

کرلو ادائے فرض عدم کے سفر سے قبل — جب دوہزار جمع ہوں چل دو حجاز کو

قرآن کی تلاوت روزانہ ہے ضرور — بھولو نہ جسم و روح کے اس چارہ ساز کو

برقع پہن کے شوق سے نکلو ضرورتاً — بے علم ہے نہ مانے جو اس کے جواز کو

مل جائے گا خدا تمہیں شوہر کی چاہ سے — سمجھو ذرا حقیقتِ عشقِ مجاز کو

قصے کہو نہ طفل سے ابطالِ غرب کے — ازبر کراؤ سیرۃِ شاہِ حجاز ﷺ کو

مطبخ میں جا کے خود بھی پکایا کرو کبھی — پیچھے ہٹو نہ سونگھ کے لہسن کو پیاز کو

بگڑو نہ پندِ نزہت اخلاص کیش سے

سوچو شعارِ مالکِ نکتہ نواز کو

مندرجہ بالا نظم میں ایک قافیہ پیاز کا استعمال کوئی شاعرہ ہی کر سکتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کی لفظیات اس کے تجربے کی بناء پر مرد کی لفظیات سے قدرِ مختلف ہوتی ہے۔ جس میں کچھ نئے الفاظ و تراکیب داخل ہوتے ہیں اور کچھ خارج۔ مثلاً مندرجہ بالا نظم میں یہ مصرعہ ''پیچھے ہٹو نہ سونگھ کے لہسن کو پیاز کو''۔ مرد نہیں لکھ سکتے اور لکھے تو بے ساختگی غائب ہوگی۔ تاہم یہ پوری نظم قدران کی ابتدائی شاعری ہونے کی وجہ سے کمزور نظموں میں سے ہے جس میں مصرعے بھی سست ہیں۔

اگلی نظم ''بہنوں سے دو دو باتیں'' میں بھی اگرچہ ہدایات و نصیحت ہیں مگر ان کا لہجہ پہلی نظم سے بالکل مختلف ہے۔ پہلی نظم میں انہیں صرف فرائض ادا کرنے کی تلقین ہے جبکہ اس نظم میں انہیں دعوت عمل دی گئی ہے اور فرائض کے ساتھ حقوق کی بھی بات ہے۔ میدان عمل میں آ کر اپنا کردار ادا کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ فکر' گویائی' حصول علم کی پرزور نصیحت ہے۔ اس نظم میں انہوں نے خواتین کو ان کے روایتی کردار سے ہٹ کر اپنی پسماندگی دور کرنے کیلئے میدانِ

عمل میں آنے کی دعوت دی ہے۔خصوصاً تعلیم کے حصول کیلیئے خود کوشش کرنے پر زور دیا ہے اور اس سلسلے میں آواز اٹھانے کی نصیحت کی ہے۔اس نظم سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

لیا تم نے بہت شیریں کلامی کا مزا بہنوں
بس اب ہو تلخ کامی کی بھی لذت آشنا بہنوں

مرے مذہب میں ہے نشتر صداقت ، شکر گویائی
نہ شوقِ جاہِ و عظمت ہے نہ ذوقِ مرحبا بہنوں

غضب ہے ۔ قہر ہے۔ اندھیر ہے جہلِ زنِ مشرق
نتائج اس کے خود روشن ہیں۔ میں بتلاؤں کیا بہنوں

اگرچہ ذمہ داری جہل نسواں کی ہے مردوں پر
خطا بخشو مری تم بھی نہیں ہو بے خطا بہنوں

ہمارے پائے کوشش میں نہیں جب مطلقاً جنبش
تو کیوں ہو مرد ناحق دردِ سر میں مبتلا بہنوں

برنگ زلف گویہ مسئلہ ہے سخت پیچیدہ
پریشاں ہو مگر اس واسطے اُن کی بلا بہنوں

ہمیں ہیں اپنے ہم جنسوں کے حالِ زار سے غافل
کریں پھر بھائیوں کا آہ کس منہ سے گلا بہنوں

نہ آئے گی نہ آئے گی نظر صورت ترقی کی
نہ ہوں گے ہم جو میدانِ عمل میں رونما بہنوں

زخ ش اپنے مضامین' روزنامچے اور ذاتی زندگی میں خواتین کی پسماندگی کے خلاف نہ صرف آواز اٹھاتی رہیں بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے مسلسل ان کی حق تلفی اور معاشرے کے غلط سلوک کو دلائل سے ثابت کرتی رہیں۔انہوں نے مذہب وشرع کے حوالے سے بھی اس بات کو اجاگر کیا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے خواتین کے سلسلے میں غلط رویہ اختیار کیا ہے۔ پنجاب میں خواتین کو والدین کی میراث میں ترکہ نہ دیئے جانے کے رواج کو قانون کی حیثیت سے منظور کروانے کی کوشش کی جارہی تھی جس میں کونسل کے چند مسلمان اراکین بھی شامل ہوگئے تھے۔ صنفی امتیاز کی تمام قبیح رسمیں جو برصغیر کے مسلمانوں نے اپنائیں ہوئیں تھیں ان کی وجہ خود غرضی' حرص اور کچھ حلقے میں جہالت تھی۔ لیکن کونسل کی سطح پر ایسا قانون

بنانا جس کی اسلام بھی اجازت نہیں دیتا اس بات کی علامت تھی کہ عورتوں کے حقوق کے باب میں مردانہ رویہ معاندانہ اور خودغرضی پر مبنی ہے۔اس حوالے سے ز خ ش نے نظم ''تصادم رواج و شرع'' کہی۔نظم درج ذیل ہے۔

''جو حق پرست تھا وہ ہے دُنیا پرست آج
مسلم شراب حرص و ہوا سے ہے مست آج
روزِ جزا کی فکر دماغوں سے دُور ہے
جس طرح دل سے عظمت یومِ الست آج
اے آسمان پھٹ نہیں پڑتا تو کس لیے؟
دُنیائے دون دین پہ ہے چیرہ دست آج
اسلام کے وجود میں ہے اختلاف رائے
ہستی میں ہے مباحثۂ نیست ہست آج
خود کام چاہتے ہیں کہ پائے رواج فتح
شرع محمدی کو ہو رن میں شکست آج
رائج ہو زن کو ترکہ نہ ملنے کی رسم بد
ہو فیصلہ شریعتِ حقہ کا مسترد''

دسمبر ۱۹۱۵ء میں زمیندار میں ان کی نظم ''عالم نسواں کا انقلاب'' شائع ہوئی۔اس نظم کی ابتداء میں قبل از اسلام دور میں عورت کی زبوں حالی اور مرد کے ظلم و جور کی مکمل تصویر کشی ہے۔پھر اسلام کی آمد کے بعد پیغمبر اسلام کا خواتین کو انسان کا مرتبہ دینا حصول علم کا حق اور مردوں کے برابر حیثیت عطا کرنا۔اس طرف واضح اشارہ ہے کہ برصغیر کے مسلمان اپنے مذہبی رویئے میں پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے دور ہوگئے ہیں۔وہ انانیت میں مبتلا ہیں اور مذہب سے روگردانی کررہے ہیں۔

کفر جب نا آشنائے خطرہ ایمان تھا
کیا کہوں تم سے جو حالِ محفلِ امکان تھا
فرد تھا خونخواری و وحشت میں ہرفرد بشر
مختصر یہ ہے کہ جو انسان تھا۔ حیوان تھا
یوں تو ہر مغلوب تھا غالب کے ہاتھوں دردمند
سب سے بڑھ کر زخم خوردہ فرقۂ نسوان تھا

عورتوں کے حق میں ہر مذہب کا۔ ہر ملت کا مرد
جانور تھا۔ دیو تھا۔ عفریت تھا۔ شیطان تھا

باپ ہو یا بھائی ہو۔ شوہر ہویا فرزند ہو
مرد کل اشکال میں فرعون بے سامان تھا

مرد کی نا آشنا نظروں میں عورت کا وجود
ایک مورت۔ اِک کھلونا۔ اک تنِ بے جان تھا

اس کے اک اک فعل میں۔ سو سو طرح ہتک زناں
اس کا ہر ہر حرف۔ اف اف۔ تیغ تھا پیکان تھا

اپنے جان ومال پر مطلق نہ تھا عورت کا حق
مرد ہی ذی اختیار و صاحب فرمان تھا

مرد ہی تھا مایہ دارِ روح و احساساتِ دل
مرد ہی حق دار گنجِ عیش و اطمینان تھا

لیکن آخر دل ہی دل میں گھٹنے والی بد دعا
کر گئی وہ کام جس سے ہر بشر حیران تھا

اک سراپا نورِ حق۔ اک پیکر روشن رواں
دہر کے ظلمت کدہ میں ان دنوں مہمان تھا

دیکھ کر یہ ظلم، یہ اندھیرا، یہ عاجز کشی
سینے میں وہ دل کڑھا جو خازنِ قرآن تھا

زن کو فرمایا خصوصیت سے اس نے بہرہ ور
کل جہاں پر عام جس کا سفرۂ فیضان تھا

ترزباں رہتا تھا عورت کی حمایت میں سدا
وُہ۔ کہ جس کا ہر سخن شیریں ترازرمان تھا

عورتیں حریت کامل کی ٹھیریں مستحق
بسکہ پاس اقتضائے فطرت انسان تھا

فرض ٹھیرا عورتوں پر علم مردوں کی طرح
گو عرب انوارِ علمیہ کا گورستان تھا
تین چیزیں جو خصوصیت سے تھیں مرغوب طبع
صاف ثابت ہے اک ان میں فرقہ نسوان تھا

اے حقیقت جو! ذرا پڑھ خطبہ حج وداع
عورتوں پر مرحمت کا اس کو کتنا دھیان تھا
اس وجود پاک کی مشکل کشائی سے کُھلا
غیرممکن کہتے تھے جس امر کو آسان تھا

بن کے بت کیوں سنتے طعن مَـالَكُمْ لَاتَـنْـطِقُوْنَ
نطق کی نعمت کا کب لازم ہمیں کفران تھا
اس بیاں کو شرع کی تحریک کہنا ہے غلط
جیسے یہ کہنا کہ بے جانوں کا اعلان تھا

مندرجہ بالانظم بے حد پرجوش اور رواں نظم ہے۔ اس میں ان کی فکر کی اڑان اور زبان پر عبور کے علاوہ جذبے کی سچائی بھی موجود ہے۔ خصوصاً یہ تین اشعار نسائی شاعری کی اعلیٰ ترین مثال ہیں جن میں سچائی اظہار کے ساتھ برجستگی و روانی بھی موجود ہیں۔

عورتوں کے حق میں ہر مذہب کا۔ ہر ملت کا مرد
جانور تھا۔ دیو تھا۔ عفریت تھا۔ شیطان تھا
باپ ہو یا بھائی ہو۔ شوہر ہویا فرزند ہو
مرد کل اشکال میں فرعون بے سامان تھا

مرد کی نا آشنا نظروں میں عورت کا وجود
ایک مورت۔ اِک کھلونا۔ اک تنِ بے جان تھا

خواتین کے حالِ زار پر اُن کی مسدس ''آئینہ حرم'' ان کی زندگی ہی میں مقبول ہوگئی تھی۔ ساٹھ بندوں پر مشتمل یہ مسدس ۱۹۱۵ء میں کتابچے کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ آئینہ حرم ایک ایسی نظم ہے جسے کسی بھی ادبی شہ پارے کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ شان الحق حقی لکھتے ہیں

اس نظم میں ''انہوں نے مردوں اور عورتوں کو بڑی دلسوزی سے انقلاب پر ابھارا ہے خاص طور پر عورتوں کو اپنے حقوق طلب کرنے اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی بڑی پرجوش تلقین کی ہے۔ اُن کا طول طویل مسدس آئینہ حرم اقبال کے شکوے کا ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔'' ۴

شان الحق حقی نے صحیح لکھا ہے اس نظم میں اقبال کے شکوے کی بازگشت ہے اور اُن کی شاعری میں اکثر مقام پر اقبال کا رنگ نظر آتا ہے جس کا ہونا غیرفطری نہیں کیونکہ ہم عصر ادب میں بین المتنیت' یکساں شعور اور ہیئت کی تقلید عام رویہ ہے۔ ز خ ش اپنے عہد کے تمام اکابرین سے متاثر تھیں اور ان کے اُفکار و خیالات کے ساتھ سیاسی و ادبی طرز عمل پر بھی نظر رکھتی تھیں۔ انہوں نے حالی' شبلی' آزاد' اکبر اور علامہ اقبال کی تائید و تقلید کی ہے۔ لیکن اپنے تجربے اور مضامین میں ان سب سے مختلف اور منفرد اس لیے ہیں کہ ان کی نظموں میں ایک واضح نسائی شعور کی رو گامزن رہتی ہے۔ خصوصاً مثنوی ''آئینہ حرم'' اس حوالے سے کمال پر ہے۔ یہاں اس کے کچھ حصے نقل کر رہی ہوں۔

میں نے مانا کہ خموشی ہے بیاں سے بہتر لب خاموش لب شہد فشاں سے بہتر
صبرشیون ہے شکیبائی فغاں سے بہتر دل ہے اسرار کے رہنے کو زباں سے بہتر
پر ہر اک شے کیلئے حد ہے مقرر آخر
ضابطہ شکوہ ہو کب تک دل مضطر آخر

بھائیو آہ رہے سینہ میں مدفوں کب تک دل ہی دل میں گلہ طالع واژوں کب تک
آستیں سے ہو نہاں دیدہ پرخوں کب تک غم کو پوشیدہ رکھے خاطرِ محزوں کب تک
حالِ دل کیوں نہ کہیں منہ میں زباں رکھتے ہیں
ہم بھی پہلو میں دل اور جسم میں جاں رکھتے ہیں

دل کو ارماں۔ کہ زنِ ہند کا کچھ حال لکھوں طبع حیراں۔ کہ میں الفاظ کہاں سے لاؤں
میں پریشاں۔ کہ پشیماں نہ کرے بختِ زبوں ہاں۔ کہی بات پرائی ہے کہوں یا نہ کہوں
آگیا لب پہ مگر ذوقِ تکلم سے سخن
منہ پہ آئی بھی کہیں رکتی ہے اے مشفقِ من

کیا کہوں کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم خستۂ جور ہیں ہم۔ کشتۂ بیداد ہیں ہم
تختۂ مشق سناں بازیٔ صیاد ہیں ہم آدمی کا ہیکو ہیں۔ پیکرِ فولاد ہیں ہم

بے حس و بے حرکت۔ بے بس وسرافگندہ

بچہ دردست جواں۔ مردہ بدست زندہ

ہم کو کیا علم کہ کیا شے ہے مزا دنیا کا نہ یہ معلوم۔ ''خوشی'' نام ہے کس چڑیا کا

آہ بے جرم ہمیں صنفِ قوی نے تاکا تختۂ مشق بنایا ستمِ بے جا کا

آج انساں کے فضائل سے ہیں دونوں محروم

ایک تفسیر جھول۔ ایک ہے تفسیر ظلوم

آگے لکھتی ہیں

ان کو رہ رہ کے ستاتا ہے یہ بے اصل خیال گھر میں پڑھ لکھ کے خواتین کا رکنا محال

کہیں اٹھے نہ مساوات کا غم خیز سوال کہیں ہوجائے نہ مردوں کی حکومت کا زوال

ہائے ان خود غرضوں کو نہیں اتنی بھی خبر

زوجہ جاہلہ ہے آفتِ جانِ شوہر

آگے ایک جاہل گھرانے کا بہت تفصیلی اور دلچسپ نقشہ کھینچا ہے اور اس کی جہالت و پسماندگی کی افسوسناک تصویرکشی کے بعد بتایا ہے کہ وہ اکابرین جو باہر حالت حاضرہ کے غم میں مبتلا ہیں اپنے درون خانہ مسائل سے کتنے بے پرواہ ہیں۔ دو بند دیکھئے۔

ماتم ترکی و ایراں سے وہاں جامہ دری یاں پھٹے چیتھڑے اور مشغلہ بخیہ گری

شیر سے معرکہ آرا ہے وہاں مرد جری دیکھ کر غوک کو یاں ''ہائے مری ہائے مری''

شوق طیارہ میں اڑنے کا شب وروز وہاں

ریل کے نام سے اٹھتا ہے یہاں دل میں دھواں

تیری اہلیہ جو بے علم ہے مرد معقول پسرِ خادم ملت کی توقع ہے فضول

ماں کی آغوش ہے بچے کا وہ پہلا اسکول جس کے اسباق کی تامرگ نہیں ممکن بھول

دور ہوتا اثر جہل گر اس مکتب سے

ہم نہ رہتے صفِ اقوام میں پیچھے سب سے

پھر یہ بتایا ہے کہ اسلام کے عہد آغاز اور عروج کے زمانے میں عورتوں نے اپنے بھائیوں دوش بدوش کیسے کیسے کارنامے انجام دیئے ہیں۔

ہم سے خالی نہ تھی یوں انجمن قال و اقوال ۔۔۔ نہ کرایا تھا ہمیں صورتِ حرفِ معلول
عائشہ کے دہن پاک سے جھڑتے تھے جو پھول ۔۔۔ آج تک ہیں وہ بہارِ چمن شرع رسول
عرصہ جنگ میں بھی ہم نے کیئے کاروقیع
صنف نازک سے نہ تھی خولہ جانباز و شجیع؟

بزم میں مخفی و خنسا کی فصاحت دیکھو ۔۔۔ رزم میں اردہ واسا کی شجاعت دیکھو
چاند بی بی کی رضیہ کی حکومت دیکھو ۔۔۔ نور ایوانِ جہانگیر کی سیرت دیکھو
علم کی بھوک میں لیتے تھے کنیزوں سے جوخوراک
ابن ہارون کبھی اور کبھی ابن سماک

پھر جناب رسالت مآب ﷺ سے مدد کی التجا ہے:

کب تک آزار کش قید ہوں بہکان حرم ۔۔۔ المدد المدد اے بیخ کن رسم ستم
کنج در بند میں گھٹ گھٹ کے مرے جاتے ہیں ہم ۔۔۔ تیری بخشی ہوئی حریتِ کامل کی قسم
اتنی رخصت بھی نہیں دل میں ہو جب سوزوگداز
جاکے مسجد میں گھسیں ناصیہ عجز و نیاز

مجموعہ فردوس تخیل کا دور ثالث اکتالیس نظموں پر مشتمل ہے۔ اس دور کا آغاز اپریل ۱۹۱۶ء میں ان کے بھائی احمد اللہ خان حیران کی وفات سے ہوتا ہے۔ اس دور میں ان کی آخری عمر تک لکھی ہوئی نظمیں شامل ہیں۔ بھائی کی وفات کا صدمہ اتنا بڑا تھا جسے برداشت کرنا اُن کے لئے ناممکن ہوگیا تھا۔ اس حادثے نے ان کی زندگی کا رخ تبدیل کردیا تھا۔ جس کے اثرات اُن کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں۔ اس سے قبل اُن کے موضوعات سیاسی اور سماجی تھے۔ اب ان میں ذاتی دکھ اور اندوہ شامل ہوگئے۔ بھائی کی وفات نے ان کی زندگی میں ایک بڑا خلاء پیدا کردیا تھا۔ ان کا وہ واحد ساتھی جو سیاسی نظریات اور ادبی مصروفیات میں اُن کا برابر کا شریک تھا جدا ہوگیا۔ بھائی کی محبت اس بڑے نقصان کی تلافی دونوں ہی ممکن نہ رہیں۔ چنانچہ تیسرے دور کے آغاز میں ہی وہ اپنے اس نقصان کا اظہار کرتی ہیں اور نظم ''اللہ اصمد'' میں تسلی دینے

والوں کو مخاطب کر کے بتاتی ہیں کہ اتنے بڑے صدمے کے لیے تسلی کے کلمات اور پند و نصائح بے معنی ہیں۔ انہوں نے واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ بھائی کی موت نے انہیں بے معنویت اور ایسی یاسیت میں مبتلا کر دیا ہے جس میں خوشی کی کوئی رمق نہیں۔ اللہ اصمد طویل مسدس ہے اسے ایک پر اثر مرثیہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نظم میں میر انیس کے مرثیئے کا انداز نمایاں ہے۔اس کے چند بند یہاں نقل کر رہی ہوں۔

تھا مرا بھائی مرا احمد محمود خصال　　مرکز آرزو و نقطہ پر کار خیال
بسکہ دونوں کا وفا جوئی میں تھا ایک ہی حال　　درمیاں میں من و تو کا نہ رہا کوئی سوال
دو مکانات تھے اک روح کے گویا دونوں
مدت العمر رہے یک دل و یک جاں دونوں

اتفاقاً جو پس ہجر ملا کرتے تھے　　پہلے گھنٹوں غم فرقت کا گلا کرتے تھے
دیکھنے والے تعجب سے سنا کرتے تھے　　ہو کے پھر متفق اللفظ کہا کرتے تھے
ایسی الفت کہیں دیکھی نہ سنی مشفق من
ہم نے ان آنکھوں سے کیا دیکھے نہیں بھائی بہن

ایک موتی تھا گرا ہاتھ سے اور پھر نہ ملا　　ایک مٹی کا کھلونا تھا گرا ٹوٹ گیا
رہ گئی دیکھتی کی دیکھتی چشم بینا　　کیا ہوا کیا نہ ہوا۔ کچھ نہ سمجھ میں آیا
نہ ہوئے عہدہ بر آ بخت نگونسار سے ہم
رہ گئے سر کو ٹپکتے درودیوار سے ہم

آگے لکھتی ہیں

قدر داں کوئی نہ اس فن کا ملا اس کے بعد　　دل مرا شعر سے بیزار ہوا اس کے بعد
کوئی محرم کوئی ہمدم نہ رہا اس کے بعد　　دل سا غمخوار بھی پہلو سے گیا اس کے بعد
مردہ ہی سمجھو ہمیں موت میں کیا باقی ہے
کیا ہوا سینے میں گر سانس ذرا باقی ہے

اس نظم کو انہوں نے ایک مکمل مگر ننھی سی داستان غم کی تمہید لکھا ہے۔ یہ ۱۹۱۷ء میں لکھی گئی۔ اس کے بعد

پے در پے کئی نظمیں اسی دکھ کے اظہار میں لکھیں۔ اگلی نظم جس پر جولائی ۱۹۱۷ء کی تاریخ ہے کا عنوان ''شکوۂ احباب'' ہے۔ وہ اداسی اور یاسیت جس میں وہ مبتلا تھیں۔ اس نے انہیں اپنے گردوپیش سے بددل کر دیا تھا۔ شاعری ویسے بھی اس دور میں خواتین کے لیے وجہ افتخار تو کیا ہوتی وجہ رسوائی سمجھی جاتی تھی اور صدمات نے انہیں داخلیت پسندی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ چنانچہ اپنے اطراف کے لوگوں سے جن کے رویے عموماً طور پر حساس فرد کیلئے خوشگوار نہیں ہوتے اتنے ناروا محسوس ہونے لگے کہ اس کا اظہار انہوں نے اس نظم میں بڑی دلسوزی سے کیا۔ چند اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

دن رات یاں وفا ہے حس ہے نہ واں اثر ہے
فولاد ہے کہ دل ہے؟ پتھر ہے یا جگر ہے

دنیا کو چھان مارا۔ ہر شے کو دیکھ ڈالا
تو اسے وفا کہاں ہے۔ اے مہر! تو کدھر ہے

ان کی جفائے بیجا ہے مجھ کو وجہ شکوہ
خُلقِ حمید جن کا دنیا میں مشتہر ہے

وجدانیاتِ شاعر بے بس ہیں ان کے آگے
ہر اک دلیل پرور۔ ہر اک فلاسفر ہے

بے وجہ یہ جفا ہے۔ بے جرم یہ سزا ہے
پیغام ہے نہ قاصد۔ خط ہے نہ نامہ بر ہے

کی میری شاعری کی۔ اس طرح قدردانی
یہ فن بادنجی۔ منحوس و پُرضرر ہے

مجبور ہیں سنیں کیا۔ احوال میرے دل کا
فرصت نہیں ہے گاہے۔ اور گاہ دردِ سر ہے

اپنے غبارِ دل سے سمجھے ہیں بے خبر وہ
آئینہ ہے مرا دل - یہ بھی انہیں خبر ہے

شکوے گلے کا دفتر۔ اک دوست کو دکھا کر
میں نے کہا یہ کیا ہے۔ بولیں تمہارا سر ہے

اگلی نظم ''تیرے بعد'' جو اکتوبر ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی۔ اس کے نیچے بریکٹ میں حادثہ ہائلہ اپریل ۱۹۱۶ء کی

تاریخ ہے۔ یہ ان کے بھائی کی وفات کی تاریخ ہے۔ یہ نظم غالب کی زمین میں ایک پر اثر نوحہ ہے۔ لیکن اس کو صرف رسمی نوحہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں معنی و مضامین کی وسعت' اظہار کی پختگی کے ساتھ غزل کا رنگ ہے۔ کیفیت کی فراوانی اور غم کی شدت ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ان کے پھوپھی زاد بھائی اور منگیتر ابد بستر مرگ پہ تھے اور اعزاء نے یہ خبر اُن سے پوشیدہ رکھی تھی۔ اُن کے احباب و اعزاء اپنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ان کے دکھوں میں اس خاموشی نے اور اضافہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اس دکھ کی شدت اس نظم میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ بھائی کے جدا ہونے کے بعد احباب نے بھی منہ پھیر لیا ہے۔ بھائی کی وفات پر انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہے جن میں گرم گرم آنسو سے اس مجموعے کا آغاز ہوا ہے مگر اس نظم کی شدت اور کیفیت زیادہ ہے۔ اس نظم سے اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

کوئی مخلص مجھے تجھ سا نہ ملا تیرے بعد
یاد آتی ہے بہت تیری وفا تیرے بعد

ہم اجل سے ہیں اجل ہم سے خفا تیرے بعد
ہم سے دل دل سے ہے آرام جدا تیرے بعد

کوئی جامع نہ رہا منتشر آتے ہیں نظر
علم و فن ۔ دانش و دیں۔ صدق و صفا تیرے بعد

دولت فقر امیروں میں نہیں ملتی اب
پھرتے ہیں جھانکتے در در فقرا تیرے بعد

بے سبب تجھ سے وفادار نے منہ موڑ لیا
منہ دکھاتے نہیں اب اہلِ وفا تیرے بعد

بحث رہتی تھی کہ ہے کون وفا کا پابند
حیف یہ عقدہ سربستہ کھلا تیرے بعد

حد کو پہنچی تھی محبت میری تیرے آگے
ہوگئی حد سے یہ کم بخت سوا تیرے بعد

یہ عیاں ہے کہ اٹھا دہر سے تو۔ پر یہ بتا
ہوگیا بیٹھے بٹھائے مجھے کیا تیرے بعد

شوق تھا ہنسنے ہنسانے کا ترے آگے مجھے
بھاگئی رونے رُلانے کی ادا تیرے بعد

تھا تیری ذات پہ موقوف مرا نازو غرور
خاکساروں میں شمار اب ہے مرا تیرے بعد

نہ رہا غلبۂ سودائے بیانِ غالب
داغ ہے پائی دلِ تفتہ میں جا تیرے بعد

دوست رکھتی تھی ہمیشہ ترے ہر دوست کو میں
ہوگئے اپنے احبا سے جدا تیرے بعد

بے حیائی ہے اگر زاہدہ لے شعر کانام
آہ اے قدر شناسِ شعرا! تیرے بعد

اگلی نظم ''اے باپ'' رسالہ استانی میں چھپی یہ نظم والد سے شفقت ومحبت کا اظہار ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب بھائی کی جدائی میں بیمار اور نڈھال رہنے لگیں اور زندگی میں دلچسپی چھوڑ دی تو والد کی طرف سے پرشفقت تنبیہ اور ان کی پریشانی کو محسوس کر کے یہ نظم لکھی ہے۔ تمام شفیق ہستیوں کے بچھڑ جانے کے بعد لامحدود تنہائی میں صرف باپ میں انہیں ایسی ذات نظر آتی تھی جس کی شفقت کے سائے میں وہ پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ مگر محبت کرنے والوں کے دائمی فراق کی تپش اتنی شدید ہے کہ وہ موت کو ہی ہر درد کا مداوا قرار دیتی ہیں۔ اب جب کہ شفیق باپ کے علاوہ اُن کی زندگی میں کوئی نہیں رہا تو وہ چاہتی ہیں کہ ان کی موت باپ کی آغوش میں ہو۔ یہ ایک عجیب خواہش ہے جو کوئی بیٹی اپنے والد سے کرسکتی ہے۔ پوری نظم محبت کے خوبصورت جذبات سے معمور ہے۔ والد کی شفقت سے متاثر احساسات کی آئینہ دار ہے۔ تاہم ایک گہرا حزن اس میں نمایاں ہے۔ اس نظم میں اُن کی زندگی کا مکمل المیہ منظوم ہے۔

شب کو جب ہوتا ہے حاصل فکر دنیا سے فراغ
یادِ عہد رفتہ سے معمور ہوتا ہے دماغ

اس تماشا گاہ میں کل واقعات رنج و فرح
گھومنے لگتے ہیں چلتی پھرتی تصویروں کی طرح

دیکھ کر چھن جانے والے گوہر نایاب کو
دیکھ کر چھپ جانے والے روئے عالمتاب کو

مشتعل ہوتا ہے دل پہلو میں انگارے کی طرح
مرتعش ہوتا ہے رخ پر اشک سیارے کی طرح

کھینچتی ہوں سینہ سوزاں سے آہِ پرشرر
پوچھتی ہوں جانبِ گردوں اٹھاکر چشم تر

سچ بتا اے ماہتاب! اے عابد شب زندہ دار
تونے دیکھا ہے کبھی، مجھ سا حزیں۔ مجھ سا فگار

ہاں مری مونس ہے وہ جانِ گرانقدر وعزیز
گنجِ ہفت اقلیم جس کے آگے بیقدرو پشیز

جس کا رخ مرہم ہے زخم فرقت احباب کا
بوسہ شیریں ہے جس کا تلخیٔ غم کی دوا

اے مرے پیارے۔ مرے بے انتہا پیارے پدر
کیا نہیں تجھ کو مرے جوشِ محبت کی خبر

تو نظر آتا ہے پاک و برتر و دل کش مجھے
ساری دنیا۔ سارے عالم ۔ساری مخلوقات سے

تیری الفت۔ تیری طاعت۔ تیری تقلیدِ صفات
میری راحت۔ میری جنت۔ میری تدبیر نجات

ہر غرض سے بے غرض ہے تیری شفقت اے پدر
مجھ سے تو میرے لیے رکھتا ہے الفت اے پدر

تیرے ڈر سے وقفِ حفظ جسم و جاں رہتی ہوں میں
تیرے خوش رہنے کی خاطر شادماں رہتی ہوں میں

کاش میں یونہی رہوں خوش تو یونہی راضی رہے
کاش مستقبل سدا آئینہ ماضی رہے

آہ میں ہرگز نہ بھولوں گی وہ ایام طرب
جب مجھے حاصل تھا ''بچہ'' کا محبت زالقب

جب مجھے آتے تھے دنیا کے یہی دوچار کام
کھیلنا۔ کھانا۔ پہننا۔ شادماں رہنا مدام

تھی نظر سے دور اک معصومہ۔ اک حورِ جناں
میں سمجھتی تھی کہ میرا باپ ہی ہے میری ماں

شب کو اکثر تجھ کو سرہانے کھڑا پاتی تھی میں
پیار کی نظروں سے جھک کر دیکھتا پاتی تھی میں

لوٹ آ۔ اے عشرتِ ایام طفلی! لوٹ آ
پھر مجھے اک بار۔ بس اک بار۔ اپنا منہ دکھا

اے پدر! آغوش ہے تیری وہ دارالانقلاب
جس میں ہوتا ہے مبدل عہدِ طفلی سے شباب

تو وہی رہبر وہی استاد ہے میرے لئے
میں وہی بچی وہی نافہم ہوں تیرے لئے

مہر لب ہے گرچہ تیرا پاسِ جذبات اے پدر
کہہ رہا ہے دل زبانِ بے زبانی سے مگر

جب کہوں میں خیرباد اس عالم حق پوش کو
روح چل دے سونپ کر قالب تری آغوش کو

اگلی دو نظمیں ''حقائق'' اور ''دقائق'' منظومہ فروری ۱۹۲۰ء ایک ہی بحر' قافیے' ردیف اور تسلسل میں ہیں۔ پہلی نظم حقائق میں اُن رویوں کی شکایت ہے جو بحیثیت شاعرہ انہیں برداشت کرنے پڑ رہے تھے۔ وہ تنگ بند اور اوسط ذہنی استطاعت رکھنے والے جن کا ادب' سماج اور مذہب پر دسترس کا دعویٰ تھا ان سے مخاطب ہوکر انہوں نے واضح کردیا کہ وہ جہل میں مبتلا ہیں اور خود کو صرف اس لیے برتر سمجھتے ہیں کہ اُن کے مقابلے میں ہند کی مسلمان عورت ہے۔ نظم کے آخری اشعار میں لہجے کی کاٹ نمایاں ہے۔ مصرعے چست اور مضامین منفرد ہیں۔ بلکہ پہلی بار اس لہجے میں کسی عورت کی سچی آواز اردو شاعری میں سنائی دی ہے۔

نہیں کہتی ہوں تم سے لائق تعظیم و عظمت ہوں
بجا کہتے ہو واعظ قابل نفریں و نفرت ہوں

مریدوں ہی سے لینا داد اپنی غیب دانی کی
مجھے چکمے نہ دینا پیرومرشد میں بھی حضرت ہوں

مری تکذیب پر کیوں طفلِ مکتب ہے کمربستہ
نہ گردوں ہوں نہ یزداں ہوں نہ مذہب ہوں نہ قسمت ہوں

گرایا ہے مجھے بھی بارہا کم علم انساں نے
دبستانِ جہاں میں ہم نصیب حرفِ علت ہوں
سراپا جرم ہوں کس کس گنہ کا نام لوں نزھت
مسلماں ہوں۔ صداقت کش ہوں۔ ہندی ہوں۔ عورت ہوں
کہا بزم تصنع پروری میں شعر نزھت نے
چھپوں کس کنج میں جاکر کہ سرتاپا حقیقت ہوں

اس نظم کے ایک شعر میں انہوں نے اپنی دائمی رخصت کی پیش گوئی کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے دور اور قریب کے لوگوں سے بلا تخصیص شکایت تھی کہ خواتین کے سلسلے میں ان کا رویہ تکذیب کی حد تک جاہلانہ ہے۔ وہ شعر ہے۔

نہ اکتا مائلِ اتمام حجت پاکے اے ہمدم
کہ اس مہمانسرا میں میہمانِ چندساعت ہوں

دوسری نظم ''دقائق'' میں انہوں نے انہی خیالات کا اظہار زیادہ کھل کر براہ راست کیا ہے اور پہلے شعر میں مغرب کی خواتین کو مخاطب کر کے یہ کہا ہے۔

نہ پوچھو مغربی بہنوں کہ کیوں زیر حراست ہوں
خطا ناگفتنی ہے تاجِ عالم ﷺ کی امت ہوں

یہ نظم ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک بڑا ہی طنز ہے کہ وہ جو اس رسول کریم ﷺ کے نام لیوا ہیں جو سارے عالم کا نجات دہندہ ہے۔خود اس کی امت کی خواتین سماجی جبر کا شکار ہیں۔جنھیں مذہب کے نام پر قید میں رکھا گیا ہے اور انسانی حقوق کے دروازے مقفل کردیے گئے ہیں۔ وہ دیکھ رہی ہیں کہ مغرب میں خواتین تعلیم سے آراستہ ہیں اور ان سے مردوں کا رویہ وہی ذہنی وفکری سطح پر برابری کا ہے۔ اس نظم میں غزل کی طرح ہر شعر اک نیا موضوع پیش کررہا ہے مگر پوری نظم دائرہ بناتی ہے اور تیکھے لہجے میں ہے۔ اس نظم میں انہوں نے مغربی بہنوں کو مخاطب کیا ہے اور لہجہ قدرے باغیانہ ہے لیکن اپنے جذبہ بغاوت کی مدافعت بھی کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

علم بردار حریت ہوں حکم شاہ عالم سے — نہ سمجھو مجھ کو باغی تابع قانون قدرت ہوں
اسی کی سمت چل دینے کی ٹھانی ہمتِ دل نے — کہا جس رہ گذر نے معرضِ خوفِ ہلاکت ہوں

اپنی موت کا ذکر یہاں بھی رجائیت کے ساتھ کیا ہے۔

مرے رخ کو چھپا کر خاک سے جب اقربا پلٹے پکاری معنوی صورت کہ زندہ ہوں سلامت ہوں

محبت کا مضمون بھی بڑے خوبصورت پیرائے میں آتا ہے۔

کہا میں نے کہ جنت پر رضائے دوست فائق ہے رضائے دوست بولی' بے خبر میں ہی تو جنت ہوں
شہادت گاہ الفت میں کھڑی ہوں سربکف کب سے نکل اے خنجر قاتل کہ مشتاق زیارت ہوں
مرے الفاظ فہرست مضامین حقیقت ہیں میں اک مجموعہ تحقیق معنی ہائے صورت ہوں

ان دونوں نظموں میں ان کا اپنی شاعری پر اعتماد کا عنصر نمایاں ہے۔ انہیں خود بھی احساس ہے کہ وہ جو کہنا چاہتی ہیں اسے باآسانی شعر کے قالب میں ڈھال سکتی ہیں۔ ان کی زندگی کے یہ ایام وہ تھے جب طبع میں روانی آ گئی تھی اور شاعری ہی ان کا واحد مشغلہ رہ گئی تھی۔ اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اک اک بحر اور زمین میں دو دو نظمیں مجموعے میں شامل ہیں۔ ''حقائق'' اور ''دقائق'' کی طرح اگلی دو نظمیں ''تحفہ درویش'' اور ''لذت عرفان'' بھی ایک ہی بحر اور قافیے میں ملتے جلتے موضوعات پر لکھی گئی ہے۔ اب ان کا رجحان عشق حقیقی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ غم دنیا سے فرار حاصل کرنے کیلیے وہ خالق حقیقی کی بارگاہ میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ وہ محبت جو انہیں اپنی عزیز ہستیوں سے تھی۔ خالق حقیقی کے نیاز اور اس کے محبوب کے عشق میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ تحفہ درویش ستمبر ۱۹۲۰ء میں لکھی گئی اور اس میں اس بات کا اعتراف ہے کہ خود کو غم دنیا سے بالاتر کرنے کیلیے بارگاہ یزداں میں پناہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

بحر غم میں ہے سخت طغیانی سر سے اوپر گزر گیا پانی
کب تک اے نزہت برشتہ جگر ''شہریار'' سے عرش جنبانی
رونے دھونے سے جان کھونے سے کہیں بنتے ہیں کام۔ دیوانی!
دردِ دل درد آفریں کو سنا کر گزر۔ جی میں ہے جو کچھ ٹھانی
دشتِ وحدت ہے۔ دشت وحدت ہے دیکھ آہستہ کر فرس رانی
بے خبر پہلے نقش کر دل پہ عظمت بارگاہ یزدانی

''لذت عرفان'' میں بھی لذت دنیا سے پہلوتہی اور عرفان حقیقت ابدی کا اظہار ہے وہ اس نظم میں دنیائے فانی کی کشش سے نکل کر اس راہ پر گامزن نظر آتی ہیں جو صوفیوں کی گزرگاہ ہے۔

حسنِ باقی نے دل کو کھینچ لیا رخصت اے حسن ہستی فانی
دل ہے وقفِ رجائے رحم و کرم جاں ہے نذر رضائے ربانی
اب میں سمجھی کے ہے فنائے خودی انبساطِ بہشت لافانی

اس نظم کے اگلے اشعار نعتیہ ہیں۔

حسن احمد ہوا ظہور پذیر تھی یہ کس نور کی خود افشانی

اس نظم میں مذہب کی عطا کردہ فیوض و برکات اور آگہی و عرفان سے حاصل ہونے والے سکونِ و راحت کے احساس کو مدلل پیش کیا ہے۔ان کا یہی رویہ مزید نمایاں ہوکر اگلی نظم ''سلک مروارید'' میں اظہار پاتا ہے جس میں وہ کہتی ہیں۔

اسیر بیکاریٔ دل و جاں! کر اُٹھ کے عزمِ دیارِ جاناں
تلاش کر وہ متاعِ درماں جو حصہ اربابِ درد کا ہے
پسند کر گوشۂ سلامت یہ تجھ کو عارف کی ہے نصیحت
اُٹھ اور سلیماں کی ڈھونڈھ شوکت یہ تجھ کو طائر کا مشورہ ہے
ہر اک کا ہے مقصد محبت۔ حصول گنج صباحِ قربت
مگر طلسمِ شب جدائی میں گنجِ مقصد مرا چھپا ہے
ہوس کا دل پر نہ چلنے دے بس۔ ہو اصفت ہو نہ ہمدمِ خس
کہ اس سے عاشق کا کیشِ اقدس جدا ہے اور مطلقاً جُدا ہے
ہمیشہ خواب وسکوں سے دوری۔ ہمیشہ پاسِ نفس میں ساعی
یہ اصفیا کی ہے زندگانی۔ یہ زندگانی کا مدعا ہے
جولوحِ تقدیر پر رقم ہے وقوع میں بیش ہے نہ کم ہے
پھر اس کا کیا مجھ کو خوف وغم ہے کہ عیش حاصل نہیں ہے یا ہے
نصیب ہو تجھ کو لذتِ غم تو سجدۂ شکر کر اسی دم
کہ اس کو دیتا ہے بادشہ سم جو صاحب شہرت وعلا ہے

ان کے مذہب اور تصوف کی طرف رجحان کے بارے میں انیسہ خاتون شروانیہ لکھتی ہیں۔

''جس جگہ مذہب اور اس کے متعلقات کا ذکر ان کے قلم پر آیا ہے وہاں تو خصوصیت کے ساتھ ذوق و شوق محبت وعقیدت اور حسن بیان کے گویا فوارے اچھلنے لگتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ نے کسی خاص و جدانی کیفیت میں ڈوب ڈوب کر یہ اشعار لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے پر بھی ایک خاص تاثیری کیفیت طاری ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اس ضمن میں ان کی متعدد نظموں کا نام لیا جاسکتا ہے جن میں حمد' نعت' روحانیت' معرفت اور تصوف سب قسم کا مواد موجود ہے' اور حسب معمول ہر مضمون میں تاثیر اور جوش پایا جاتا ہے' خصوصاً معرفتی اشعار سے ان کی خداداد صوفیانہ ذہنیت کا بہ طور خاص پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ باوجود دوسرے مسائل سے حد درجہ دل بستگی اور شغف رکھنے کے وہ تصوف سے کس قدر قریبی تعلق رکھتی تھیں اور اس کے نقوش ان کے دماغ پر کتنے عمیق تھے۔ بعض صوفیانہ نظموں کے نام یہ ہیں۔؟ لذتِ عرفاں تحفہ درویش' سلک مروارید' زمزمہ حیات وغیرہ۔ ان میں سے جو اخباری دنیا میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے اہل علم سے کافی خراجِ تحسین وصول کیا۔'' ۵

اس کے بعد کی نظم ''تاراجی چمن'' منظومہ فروری ۱۹۱۹ء خطیب دہلی میں چھپی ہے۔ یہ ایک تمثیلی نظم ہے جس میں انہوں نے ایک چمن کا نقشہ کھینچا ہے جسے اجاڑ دیا گیا ہے اور جس کی وجہ سے پرندے وہاں سے ہجرت کر گئے ہیں اور وہ تمام رونق ختم ہوگئی ہے جو نظارۂ فطرت کی وجہ سے تھی۔ اس نظم میں تاراجی چمن کا سہارا لے کر ان تمام ظلم کرنے والوں کو متنبہ کیا ہے جو بستے بستے گلشن کو اجاڑتے ہیں۔ یہ گلشن گھر کا استعارہ بھی ہوسکتا ہے اور خود ان کی زندگی بھی مراد ہوسکتی ہے۔ یہ طویل نظم ہے جو ان دو اشعار سے شروع ہوتی ہے۔

ذرا دیکھ اپنے چمن کو تو مالی — نظر آرہا ہے یہ کچھ خالی خالی
نہ پھولوں کا ہنسنا نہ بلبل کا رونا — نہ رنگیں جمالی۔ نہ شیریں مقالی

اور ان اشعار پر ختم ہوتی ہے۔

بہت جلد خوں رنگ لائے گا اس کا — نہ فریاد بلبل کی جائے گی خالی
پڑیں گے اسے اپنے جینے کے لالے
چھپے گی نہ گلچیں کے دامن کی لالی

اگلی نظم ''جلوہ شب'' مارچ ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی اور ۱۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو زمیندار میں شائع ہوئی۔ یہ نظم فارسی میں ہے۔ رات کے حسین مناظر کی تصویر کشی ہے۔ اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے اس میں روانی اور سرشاری کی کیفیت ہے۔ اس

نظم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں فارسی زبان و اظہار پر مکمل عبور حاصل تھا۔

گشت زعشوہ بے نقاب۔ لیلیٰ خوش ادائے شب
سیل بہ پائے بوس کر دگیسوے مشکسائے شب
تخت نشیں و مال دار۔ فاقہ کشِ عیال دار
بے خبر ندو بے الم جملہ بہ فیضہائے شب

آخری شعر ہے۔

دیدۂ نگر شود۔ محرمِ حسنِ ایں حرم
رازِ جہاں عیاں کند۔ جلوۂ حق نمائے شب

اس نظم کا ایک مصرع عربی سے مرصع ہے۔ یہ بھی ان کا ایک خاص انداز ہے اور تصوف کی طرف مائل رجحان کا آئینہ دار بھی۔

اس سے اگلی نظم ''مصطبۂ قدرت میں شاعر کا نغمۂ مستانہ'' ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ فطرت کے میکدے میں شاعر بے خودی میں جو گیت کی لے بلند کر رہا ہے اس کی گونج اس نظم میں ہے۔ سرشاری اور بے خودی کی کیفیت میں لکھی اس نظم پر جنوری ۱۹۲۰ء کی تاریخ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب کے اس مصرعے کے مطابق 'درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا' کی صورت ان کی زندگی میں پیدا ہوگئی ہے۔ جس آگہی اور عرفان کی طرف ان طبیعت گامزن تھی وہ انہیں مل گئی ہے۔ یہ نظم خوبصورت شاعری کی بے حد کامیاب مثال ہے اس میں کیفیت' روانی اور جمالیات عروج پر ہے۔ اس کی نغمگی اور ایک گونا بے خودی کا انداز پڑھنے والوں کو سرشاری کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پوری نظم میں کیفیت کا یہ تسلسل کلائمکس کی طرف جاتا ہے اور اس کا اختتام عرفان ذات پر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ پوری نظم تسلسل میں ہے مگر منتخب اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

کہسار پری کس کے لیے؟ میرے لئے ہے
ذوق نظری کس کے لئے ؟ میرے لئے ہے
منظور زمیں کو ہے مری تازگی چشم
سبزے سے ہری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

پتے۔ گلِ سرخ۔ اوس۔ ہیں دُر۔ لعل۔ زمرد
دولت یہ دھری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

ہے برف سے ملبوس سرِ کوہ صنوبر
چاندی یہ کھری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

مہرِ لب شاعر دلِ لالہ میں بنی داغ
بریاں جگری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

نکہت کی طرح اڑتی ہوئی راگنیوں کی
جادو اثری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

اب بھی رہے لب خشک تو افسوس ہے مجھ پر
مے خم میں بھری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

ہے غم سے بھری اہلِ ہوس کے لئے دنیا
اور غم سے بری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

انجامِ فسوں سازیٔ احباب پہ گریاں
شمع سحری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

اور آخری دو اشعار۔

ہے جلدہ گری دوست کی کس سمت؟ ہر اک سمت
یہ جلدہ گری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

میں نکتہ سرا کس کے لئے؟ حق کے لئے ہوں
تو نکتہ دری کس کے لئے؟ میرے لئے ہے

زخ ش نے حیرت انگیز طور پر متنوع موضوعات کو شاعری میں برتا ہے۔ اگلی دو نظمیں ''برسات اور کسان'' اور ''کسان کا گیت'' جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے کسان سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں نظمیں ساتھ لکھی گئیں۔ ان نظموں کا ذکر اُن کے روزنامچے میں ۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ میں ہے۔ لکھتی ہیں۔

مدت بعد مقصد حیات (شعر و سخن) کی طرف توجہ کی اور نظم ''کسان اور برسات'' کو خدا کے حکم سے مکمل

کردیا۔ یہ نظم اصل میں ''سچی کہانی'' کا ایک شاخسانہ ہے۔ جس میں تمہیداً نیند اچٹنے کی گھبراہٹ مناظر زرعیہ کے تصور سے دفع کی گئی تھی۔ اس طرح

دل کو آخر نغمہ دہقان سے بہلانے لگی
تاکہ اس منترے عفریتِ توہم ہو فرار
آج تو کیوں شادماں ہے اے حبیب غمگسار
کیا نظر میں ہے کسی شاداب وادی کا نکھار

دوتین اشعار لکھنے کے بعد خیال آیا کہ یہ مضمون جداگانہ نظم تیار کرنے کے قابل ہے۔ اس طرح دونوں نظمیں جھگڑے میں پڑگئیں۔ ایک ہی وزن اور قافیہ کی پابندی نے جی اچاٹ کردیا آج بڑی مشکل سے ایک نے پیچھا چھوڑا اب دوسری کی طرف (جسکا بڑا حصہ موزوں ہوچکا ہے) توجہ کی جائیگی۔ اس میں ہندوستان کی سیاسی' اقتصادی' تمدنی اور علمی حالت ایک خاص قسم سے بیان کی گئی ہے۔

''برسات اور کسان'' کسان کے شب و روز اس کی محنت اور خوشی وغم کے کیفیتوں کی آئینہ دار ہے۔ اس میں کی محنت کی تعریف کی گئی ہے اس کے حالات سے ہمدردی ہے مگر پوری نظم میں مناظر فطرت کا حسن اعلیٰ جمالیاتی احساس نمایاں ہے۔''......٦

آج تو کیوں شادماں ہے اے حبیب غمگسار
کیا نظر میں ہے کسی شاداب وادی کا نکھار
چارسو اُبھری ہوئی مینڈوں کی نرم آغوش میں
شبنم آگیں سبز پودوں سے مزین کشت زار
وسعت منظر ہے یا حد بصارت کی محیط
یا نظر ہے ساحر خوبی کے زیر اقتدار
سچ تو یہ قیمتی ہے۔ لاکھ درجے قیمتی
کل جہاں سے ایک دہقاں کی حیاتِ مستعار
شہر سے۔ ہاں عاصی و رنجورو نالاں شہر سے
دُور۔ بالکل دُور۔ اس کی ذات اس کا کاروبار

دن بھر اس کا ہاتھ ہے اور خدمت انساں کا شغل
دن بھر اس کی آنکھ ہے۔ اور بزم قدرت کا سنگھار

پاک ہے۔ اجلا ہے پانی بہنے والی نہر کا
پاک مثل اشکِ حب۔ اجلا برنگِ روئے یار

اس نظم کیلئے شان الحق حقی لکھتے ہیں۔

''ان اشعار کا خلوص اور سادگی قابل لحاظ ہے۔ کشتِ زار نظم میں خیالی ہل نہیں چلایا گیا نہ کسان کے کاندھے پر بیل کو لادا گیا ہے۔'' ۷

یہاں شان الحق حقی نے جوش کی نظم کسان پر طنز کیا ہے۔ اگر چہ اس طنز کی کوئی وجہ نہیں۔ جوش کی نظم اردو ادب میں زبان، بیان، مشاہدے اور عمیق مطالعے کے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ز خ ش نے نہ صرف جوش کو پڑھا تھا بلکہ ان کی تعریف بھی اپنے روزنامچے میں کی ہے۔

''جوش ملیح آبادی کی کتاب ''روح ادب'' موصول ہوئی جس کی سرسری ورق گردانی نے اس کی ظاہری و باطنی حسن کا گرویدہ کردیا۔ گو دنیا کی زندہ و مکمل زبانوں کے لیے روح ادب غیر معمولی چیز نہ ہو۔ مگر ہماری غریب اردو کے لیے تو غیر مترقبہ نعمت ہے۔ امید ہے کہ نوعمر ادیب اسی دن مکمل شاعر بن جائے گا اور اس کا کلام استادانہ رنگ حاصل کر کے اپنے پر جوش مداحوں کا صداقت کے ساتھ قوت صداقت پیش کر سکے گا۔ مجھے اگر اس بلند پایہ کتاب کے کسی فقرے نے متحیر کیا تو وہ یہ ہے کہ ''جوش کی عمر ۲۶ برس کی ہے۔'' روح ادب اس وقت میری آغوش میں آرام کر رہی ہے۔ اس لیے اس کا جوش نہیں بلکہ میرا جوش مجھے مزید اظہار کی ترغیب دے رہا ہے۔ لیکن مجھے الفاظ بالا پر ''بس'' کے علاوہ کسی اور لفظ کا اضافہ نہ کرنا چاہیئے۔'' ۸

واضح رہے کہ اس وقت خود ان کی عمر بھی ۲۶ برس تھی۔

اگلی نظم ''کسان کا گیت'' جس کا ذکر روزنامچے میں نغمۂ دہقان کے عنوان سے ہے۔ ایک اور شہکار ہے جو اس عظیم شاعرہ نے تخلیق کیا۔ یہ بالکل نئے موضوع پر خوبصورت گیت ہے جس میں ہند کے کسان کی حالتِ زار کی پوری تصویر کشی اُس کے بیل سے مکالمے کی صورت میں ہے۔ اس نظم کے لیے انہوں نے روزنامچے میں لکھا تھا کہ اس میں ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی، تمدنی اور علمی حالت ایک خاص قسم سے بیان کی جائے گی اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔ اس

کے دو بند دیکھئے۔

بے کسی کے غم سے گو رونے پہ ہوں تیار میں
دیکھتے ہی تجھ کو ہنس پڑتا ہوں اے غمخوار میں
سر اٹھانا گو نہ ہو ممکن ہجومِ کار میں
آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتا ہوں تجھے ہر بار میں
اس جہانِ بے مروت سے ہوں گو بیزار میں
بیل! پیارے بیل!! تیری حُب میں ہو سرشار میں
آمری جاں! آ تجھے لپٹا کے کرلوں پیار میں

یہ زمیندار اور اس کے اہلکار بد شعار
بھینٹ اور بیگار پر کرتی ہے راضی جن کی مار
ڈپٹی صاحب جن کے دورے دل کو کرتے ہیں فگار
نہر کے حکام، پٹواری، پولیس، تحصیلدار
دم میں آٹے دال کا ہو بھاؤ ان پر آشکار
ہو اگر آسودہ تو۔ بیٹھوں اگر بیکار میں
آمری جاں! آ تجھے لپٹا کے کرلوں پیار میں

اگلی نظم ''جنگل'' منظومہ ۱۹۲۲ء اسی کیفیت اور سرمستی میں لکھی گئی ہے جس میں مناظر فطرت کو ''جلوۂ شب،'' اور ''مصطبہ قدرت'' میں منظوم کیا ہے۔ ان نظموں میں وہ مناظر فطرت کے تخیل اور تصور سے لطف اندوز ہوتیں اور دوسروں کو اس میں شریک کرنا چاہتی ہیں۔ جیسا کہ اُن کے حالات زندگی اور روزنامچے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ ایام تھے جب وہ بیمار اور گھر میں اپنے کمرے تک محدود ہوگئیں تھیں جہاں کوئی ان کا رفیق نہیں تھا۔ ان نظموں میں ایسی فضا نظر آتی ہے جو انہوں نے خود کو شاد رکھنے کیلئے تخلیق کرلی تھیں۔ تخیل اور تصورات کی دنیا جن میں مناظر قطرت اور کائنات کی تمام حسین شے خواہ وہ بلبل ہو یا کسان کا بیل ان کے ساتھی تھے۔ ''جنگل'' میں اس تصوراتی دنیا میں سرشاری کی کیفیت کے ساتھ ایک اور زندگی کی طرف گامزن ہونے کا تصور زیادہ ابھر کر آتا ہے۔ یہ تصور تیسرے دور کی نظموں میں جگہ جگہ موجود ہے اور نظم جنگل میں عروج پر ہے۔ انیسہ خاتون لکھتی ہیں

''آخری نظم جو مرحومہ کے قلم سے نکلی جنگل تھی''

اس نظم میں انہوں نے شاعر کو مغنی اور قاصد پروردگار کہا ہے۔ شاعری کے اس دور میں ان کی نظموں میں الہامی کیفیت شامل ہوگئی تھی۔ اُن کی موت کی خواہش میں رجائیت آ گئی تھی۔ اس نظم کا خود انہوں نے بھی ذکر ۹ جنوری ۱۹۲۲ء کے روزنامچے میں کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔

''آنکھوں کی شکایت مشغلہ سخن پر وہی اثر کرتی ہے جو سورج ہر پھول پر۔ جب میں لکھنے پڑھنے۔ سینے پرونے غرض کل نگاہی کاموں سے محروم ہوتی ہوں تو پوری فراغت' پورے شوق اور انہماک کے ساتھ چہل قدمی میں شعر موضوع کرتی ہوں اور اپنے وقت کا بڑا حصہ اس روحانی مصروفیت کی نظر کرتی ہوں۔''

آگے لکھتی ہیں۔

''آج کل میں شعر گوئی میں مصروف ہوں۔ آج ایک نظم ''جنگل'' کے عنوان سے مکمل کرلی جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔''

واہ کیا جاں بخش ہے صحرا کا منظر وقت شام
کھل گیا دل اے ہوا کے سرد جھونکو مرحبا
چھوڑ کام۔ اے بیوفا دولت کے شائق چھوڑ کام
جلد آ۔ اے شاہد قدرت کے عاشق! جلد آ

تیرہ بند کی اس نظم کا دوسرا اور آخری بند ان کے مجموعہ سے نقل کررہی ہوں۔

الوداع اے شہر کے ہنگامۂ گفت و شنید
ہے تخیل تجھ سے شاکی۔ جیسے پالے سے گلاب
اے بیاباں! اے مجسم شعر! تیری پاک دید
دل کشا ہے جیسے بعدِ ابرو باراں آفتاب
تیری امواج تخیل سنتے ہی لیں گی اُڑا
بلبلِ شیریں نوا کا نغمۂ اعجاز بار
پھر یہ نغمۂ مژدہ تسکینِ دل کہلائے گا
اور مغنی یعنی شاعر۔ قاصد پروردگار

اگلی نظم ''ماہ مبارک کے مناظر'' ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو تہذیب نسواں میں شائع ہوئی تھی۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ نظم ماہ رمضان کی آمد پر لکھی گئی ہے۔ اس دور کے بارے میں انہوں نے خود لکھا ہے کہ وہ وہم سے فرار حاصل کرنے کیلئے عالم تصور کا رخ کرتیں تھیں۔ انیسہ خاتون کے مطابق عمر کے آخری حصے میں وہ عالم استغراق میں گنگناتی ہوئی محسوس ہوتیں اور پھر ایک مکمل نظم املا کروادیتیں۔ اس دور کی نظموں میں روانی طبع اور تصوراتی کیفیت نمایاں ہے۔ اس نظم میں ماہِ رمضان کا استقبال اس مہینے کی برکتیں، عبادتیں اور مؤمنوں کی زندگی میں اس ماہ میں آنے والی رونقیں خوبصورتی کے ساتھ منظوم کی گئی ہیں۔ یہ نظم پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصے میں اس ماہ کی ایک نئی جہت منظوم کی گئی ہے۔ میں یہاں ہر حصے سے پہلا اور آخری شعر نقل کررہی ہوں جس سے ان کی فکری و تصوراتی اُڑان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بزمِ استقبال کے ممبر کھڑے ہیں خاک پر
اور نگاہیں لگ رہی ہیں عالمِ افلاک پر

بن گیا رخ کے لئے گلگونہ۔ روحانی سرور
اور پیشانی کا زیور۔ پاکیٔ باطن کا نور

شب کے نصفِ اولیں میں عالمِ خاکی سے دور
منعقد ہے خامشی سے جلسۂ اجرامِ نور

فرش پر ذی روح کو تڑپا رہی ہے تیری لے
عرش پر اللہ کو خوش آرہی ہے تیری لے

دیدنی ہے نصف آخر کی بہارِجاں فزا
ہوگیا ہے مرگ آسا خامشی کا خاتما

جو یہ کہتے ہیں لذائذ سے ہے لازم اجتناب
سفرۂ مسلم پہ دیکھیں وصلِ خرما و ثواب

مومنوں کے غل سے چونکی صبح کی ہنس مکھ پری
بر میں پوشش برف گوں تھی تاج سر پر آتشی

صاحب مقدور بھوکے! رب عزت کی قسم
چاہیے کھانی تری خوبی قسمت کی قسم

شاہِ خاور تھک گیا دن بھر کے کاروبار سے
شکل کلفت ہے نمایاں زردیٔ رخسار سے
کچھ نہ پوچھو اس خوشی کی۔ روح بھی خوش۔ جاں بھی خوش
فرش پر بندہ بھی خوش ہے۔ عرش پر یزداں بھی خوش

اگلی نظم منظومہ اگست ۱۹۱۷ء ہے۔ اس کا عنوان ''ہم تین ہیں'' ہے۔ نظم کے نیچے یہ آیت تحریر ہے۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَافِی الْغَارِ اِذْقَالَ لِصَاحِبِهٖ لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے کہ اس نظم کا موضوع ہجرت نبی کریم ﷺ ہے۔ یہ ایک کمزور نظم ہے اور آخری دور کی نظموں کے بیچ اس کی یہ کمزوری زیادہ واضح ہورہی ہے۔ اس کی تیکنیک انگریزی نظم کی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک انگریزی نظم جس کا عنوان ''ہم سات ہیں'' سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ اس نظم کا مزاج بھی ان کی دیگر نظموں سے مختلف ہے۔ اس میں ساتواں مصرع جو ہر بند میں ٹیپ کا مصرع ہے۔ نظم کی بحر سے الگ اور وزن سے خارج ہے۔ اس مقدس موضوع کے لئے لفظیات بھی کمزور استعمال کی گئیں ہیں۔ پہلا بند نقل کررہی ہوں جس میں آغاز میں ہی چھکے چھڑانے کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے جو اس سنجیدہ نظم میں بے محل ہے۔

یہ غار جسکی ظلمت وحشت دلا رہی ہے — یہ غار۔ جسکی تنگی چھکے چھڑا رہی ہے
جس کی عفونتِ گل۔ بدبو سنگھارہی ہے — یہ غار۔ سانس جس میں گھٹ گھٹ کے آرہی ہے
بے عقل ہیں۔ گر اس میں اندوہ گیں ہیں ہم — کوسِ اجل خموشی جس میں بجارہی ہے
اے دوست! دو نہیں ہیں واللہ تین ہیں ہم

اگلی نظم ''بی بی آمنہ کا بستر مرگ'' جولائی ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی اور تہذیب نسواں میں ۲۰ ستمبر ۱۹۱۹ء کو شائع ہوئی۔ یہ مسدس ہے اور اس میں وقت مرگ بی بی آمنہ کے جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو ان کے اس چھ برس کے بچے کی آئندہ زندگی کے اندیشوں سے وابستہ ہیں جو پہلے ہی باپ کی شفقت سے محروم ہے۔ یہ نظم اثر انگیز ہے اور ان جذبات کی ترجمانی کوئی شاعرہ ہی کرسکتی ہے۔ اس نظم سے ابتدائی تین بند یہاں نقل کررہی ہوں۔

یہ آج جسم میں کیوں روح تلملاتی ہے   یہ دل کی کیوں حرکت سست ہوتی جاتی ہے
رگیں سی کھنچتی ہیں رک رک کے سانس آتی ہے   الٰہی خیر۔ زباں بھی تو لڑ کھڑاتی ہے

کہیں یہ کشمکش موت و زندگی تو نہیں
وہ وقت جس کا خطر تھا کہیں یہی تو نہیں

نہیں یہ غم کہ جوانی میں پارہی ہوں وفات   نہ یہی الم۔ کہ ہوا ختم روح و جسم کا ساتھ
ذرا بھی مجھ کو نہیں خوف ہادم اللذات   کہ تلخیِ غمِ شوہر سے بے مزہ ہے حیات

خیال ہے تو فقط ایک ننھی سی جاں کا
ملال ہے تو فقط اک یتیم ناداں کا

ضیائے مہر میں جب اس نے آنکھ کھولی آہ   نہ دیکھی والدِ مشفق کی مہر پاش نگاہ
زمین پہ جلوہ نما جب ہوا یہ غیرتِ ماہ   نہاں تھے خاکِ لحد میں جنابِ عبداللہ

ہزار حیف۔ کہ منہ اس سے ماں بھی موڑ چلی
ملول و مضطرب اک بے پدر کو چھوڑ چلی

اس سے اگلی نظم ''فرشتوں کی محفل'' کے عنوان سے ہے جس کے حاشیے پر لکھا ہے مطبوعہ زمیندار لاہور مورخہ ۴ جون ۱۹۲۰ء۔ یہ انہی نظموں کے سلسلے کی ایک کی کڑی ہے جو انہوں نے وفات سے قبل عالمِ تخیل و استغراق میں لکھی ہیں۔ اس میں بھی تصورات کا ایک جہاں آباد ہے جس میں فرشتوں کی محفل سجی ہے۔ اس محفل میں ایک خاتون پیش ہوتی ہیں جو پہلی جنگِ عظیم میں شہید ہونے والے ایک ترک سالار کی بیوہ ہیں۔ یہ نظم منظوم افسانہ بھی ہے جس میں شوہر کی شہادت کے بعد بیوہ کو دشمن کی طرف سے شادی کا پیغام ملا مگر اس نے اسے رد کر کے موت کو گلے لگالیا۔ جنگِ عظیم دوئم کے دوران اخباروں میں چھپنے والے واقعات کی تصوراتی تصویر کشی انہوں نے کئی نظموں میں کی ہے۔ اس نظم میں بھی ایک باوفا بیوی اور باعزت خاتون امۃ سلمہ کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں ان کے تخیل کی اڑان ان تین شعروں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

عروس زندگی خوابیدہ تھی۔ عالم شبستاں تھا
تعجب ہے مرے اسپ تخیل پوہاں تھا
گیا لے کر مجھے حیرتِ گہِ بزم ملائک میں
صبا تھا؟ برق تھا؟ کیا تھا؟ ابھی یاں تھا۔ ابھی واں تھا

نہ تھا موجود وہ ذرہ جسے ''خورشید'' کہتے ہیں
مگر انوار عرفاں سے۔ جدھر دیکھو چراغاں تھا

اور اگلی نظم ''سپاسنامہ اردو'' بحضور بانی جامعہ عثمانیہ ''ستارہ صبح'' لاہور میں ۱۹ جنوری ۱۹۱۸ء کو شائع ہوئی۔ یہ ایک معرکہ آراء نظم ہے اس کو اردو نظموں کے انتخاب میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔ اس نظم کے بارے میں انیسہ خاتون شروانیہ لکھتی ہیں۔

''۱۹۱۸ء میں جب ازراہِ کمال عاقبت بینی و معارف پروری وعلم نوازی حضور پرنور اعلیٰ حضرت شہریار دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ نے جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اردو زبان کو حیات تازہ مرحمت فرمائی تو یہ ممکن نہ تھا کہ قومی شاعرہ ز۔ خ ش کے جذباتِ احسان مندی و سپاس گزاری بیدار نہ ہوں؛ چنانچہ انہوں نے نہایت سرور وتپاک کے ساتھ اس خوش آئند خبر کا خیر مقدم کیا اور عنوان متذکرہ سے ایک زور دار نظم بہ طور خراج عقیدت کے خود اردو زبان کی طرف سے لکھی اور اخبارات کے ذریعے ملک کے طول وعرض میں شائع کرائی۔ مصنفہ نے اس کے دو ذیلی عنوان قائم کیے ہیں۔ پہلا ''ذکر کلفت'' دوسرا'' شکر نعمت''۔......۹

اس نظم کی تعریف میں شان الحق حقی لکھتے ہیں۔

''یہ اس دور میں اپنی قسم کی بڑی اچھوتی، بڑی دلکش اور اثر انگیز آواز تھی۔ یہ نظم کچھ تو اپنے موضوع (یعنی اردو کی مقبولیت کی وجہ سے اور کچھ اپنے انداز کے اچھوتے پن کے باعث ایک یادگار نظم بن گئی ہے۔ آگے لکھتے ہیں۔ اس نظم کے پڑھنے والے عموماً واقف نہ تھے کہ اس کا لکھنے والا کون ہے۔ عنوان پر اردو کا لیبل لگا ہوا تھا۔ یعنی یہ اردو کی زبان سے ایک فریاد تھی۔ لہٰذا اس نظم نے جو توجہ پائی وہ اوپری تھی۔ اردو کا دکھڑا دل کو لگتا ہوا سا مضمون تھا۔ لیکن نظم کے مطالب میں اثر آفرینی کے کچھ اور بھی سامان تھے۔ بشرطیکہ ذہن ان کی طرف رجوع ہوسکتا۔ اس کے مطالب تہ در تہ ہیں جو اردو کے اس ادب پارے کی وقعت کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ یہ اردو کی فریاد بھی ہے عورت کی فریاد بھی اور خود زاہدہ خاتون شروانیہ کے دل کی فریاد بھی۔''......۱۰

شان الحق حقی نے صحیح تجزیہ کیا ہے۔ نظم کی اثر آفرینی میں ان کی وارداتِ قلب کی کیفیت بھی شامل ہے۔ یہ وہ دور تھا جب بھائی اور منگیتر دونوں کا انتقال ہوگیا تھا اور زندگی میں کوئی دلکشی اُن کے لئے باقی نہیں تھی۔ اُس وقت انہوں نے بڑی ذہانت سے اردو کی فریاد اور اپنے دل کی آواز کو ہم آہنگ کردیا۔ اس نظم میں شاعری کا وہ معجزانہ اثر ہے جو

ہر ایک کے دل کو متاثر کرتا ہے اور یہ اثر شدت جذبات کے بغیر نہیں پیدا ہوسکتا۔ بلاشبہ یہ نظم ان کا شہکار ہے میں اس کو دونوں حصے یہاں مکمل نقل کر رہی ہوں۔

ذکرِ کلفت

میں شانہ سے درگذری۔ آئینہ سے باز آئی
اب دل ہی نہیں جس میں ہو ذوق خود آرائی

ہر چند کہ صورت میں۔ ہوں نور کی مورت میں
ناظر نہ ہو جب کوئی۔ کس کام کی رعنائی

ہو کوئی اگر مائل۔ کردے وہ مجھے قائل
میں خود ہی تماشا ہوں۔ اور خود ہی تماشائی

اک لعل ہوں گدڑی میں۔ اک چاند ہوں بدلی میں
اک حسن ہوں دیہاتی۔ اک پھول ہوں صحرائی

ہے خاک میں زرمدفوں۔ ہے بحر میں درمکنوں
ہے شمع تہ دامن۔ ہے دشت میں شہنائی

زنداں میں ہے کیوں یوسف۔ پنجرے میں ہے کیوں بلبل
یہ کونسی حکمت ہے؟ یہ کونسی دانائی

کیا منظر عبرت ہے۔ حیرت کو بھی حیرت ہے
تصویر فلاکت ہے۔ اک پیکر زیبائی

مشاطہ اگر کرتی۔ آراستگی و تزئیں
ہر اہل خرد ہوتا۔ اس زلف کا سودائی

ہاں۔ بزم حریفاں میں جو شمع ہوں گریاں میں
با اینہمہ زیبائی با اینہمہ رعنائی

وہ فخر زمانہ ہیں۔ ہر فن میں یگانہ ہیں
ہر طالب علم ان کا سوجاں سے ہے شیدائی

بیکار ہیں۔ ناقص ہیں۔ کل مصطلحات اپنی
ذکر آیا تقابل کا۔ اور میری قضا آئی

وہ لفظ نہ جب پائے۔ جو بات مری رکھتے
کیا تم سے کہوں۔ کیسی یہ عاجزہ جھنجھلائی

اس دھن میں۔ کہ ہاتھ آئے۔ دامن کسی کامل کا
اس دھن میں۔ کہ ہوجائے شاید کہیں شنوائی

ہر منہ میں زباں ہوکر۔ میں چلتی رہی برسوں
کل ہند کی وسعت میں۔ کی بادیہ پیمائی

پر اہل زباں میرا منہ تکتے تھے اس صورت
دی ہی نہیں خالق نے گویا انہیں گویائی

گر ہو بھی گیا مائل۔ پردیس میں کوئی دل
گھر والوں کی نخوت نے کی حوصلہ فرسائی

دہلی کی یہ شیرینی یہ لکھنوی رنگین
تھیں وقفِ سخن چینی۔ کیا ذکرِ دل افزائی

شکر نعمت

آخر در محسن تک قسمت مجھے لے آئی
ہاں تجھ کو بشارت ہو۔ اے ذوق جبیں سائی

جوں شمس و قمر روشن ہے اسم شریف اس کا
ہے نامِ خدا جس میں نورین کی یک جائی

ہے آج بصد زینت ہر کان کا آویزہ | عثمان علی خاں کا آوازہ یکتائی
عثماں کی حیا نے کی۔ آکر مری غمخواری | دیکھی نہ گئی اس سے۔ یہ ذلت و رسوائی
جاں از سر نو بخشی میرے تن مردہ کو | پھر زندہ کیا اس نے اعجاز مسیحائی
کی بن کے غنی آخر۔ شاہانہ ادا ظاہر | اک جامعہ کی یعنی تاسیس ہے فرمائی
خواہان ترقی ہو۔ رخشندہ ہے مستقبل | اے حالِ قنوط افزا! ماضی ہو تمنائی
اے روزِ سیہ! کر بھی اپنا کہیں منہ کالا | کافور ہو اب بھی۔ ہاں اے شبِ تنہائی
قاصد ہے اک اردو کی ۔ نزہت کو نہیں شاہا | دعوائے زباں دانی۔ مشقِ سخن آرائی

مندرجہ بالا نظم میں لفظ ''شانہ'' کے استعمال نے بھی مجھے علامہ اقبال کے ایک شعر کی طرف متوجہ کیا۔ یہ شعر اقبال کے پہلے مجموعے ''بانگ درا'' کی چوتھی نظم ''مرزا غالب'' میں ہے

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

''......''

اقبال کی تقلید میں اردو زبان کی طرف سے یہ کہلا کر میں شانہ سے درگزری آئینے سے بعض آئی۔ انہوں نے ایک طرف نہ صرف اس لفظ کے استعمال کی خوبصورتی بڑھا دی ہے۔ دوسری طرف نسائی اظہار کی ایک بہترین مثال پیش کی ہے۔

اگلی نظم ''زبانِ داغ'' بھی اردو زبان کے بارے میں ہے جو اگست ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی۔ داغ نے لکھا تھا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اسی زبان داغ کو موضوع' قافیہ اور ردیف بنا کر انہوں نے یہ نظم اردو زبان کی تعریف میں لکھی ہے۔ اس نظم میں قصیدے کے تمام لوازم تشبیب' گریز اور مدح موجود ہیں زبان کے ساتھ ساتھ اس میں استاد داغ کی تعریف بھی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

روشن ہے مہرو ماہ سے نام و نشانِ داغ　　انجم سے ہیں عدد میں فزوں و اصفانِ داغ

کافور تیرہ بختی علم ادب ہوئی　　چمکا جو ماہتاب تجلی فشانِ داغ

گلزارِ داغ دیکھ کے دل کو شگفتہ کر　　سینہ ہے گرترا چمن بے خزان داغ

ہیں متفق علیہ احادیثِ منقبت　　کب ہے ضعیف راویٔ زور بیانِ داغ

حیرت کی انتہا نے کیا سرمہ درگلو　　ہو کس زباں سے مدحتِ لطفِ زبان داغ

مشکل ہے سادہ معنی رنگیں میں ہو زباں　　مشکل پسند ہے تو نہ چھوڑ آستانِ داغ

کسبِ فروغ اس سے کرینگے سدا فصیح　　قرطاسِ دہر سے نہ مٹے گا نشانِ داغ

تجویزِ جام صحت اُردو ہے بزم میں　　ہے جامِ نو میں کہنہ مے ارغوان داغ

اگلی نظم ''شیخ الاسلام ہند'' اپریل ۱۹۲۰ء میں لکھی گئی۔ یہ نظم مولانا محمود الحسن شیخ الہند اسیر مالٹا کی مدح میں ہے جوتحریک آزادیٔ وطن کے علمبرداروں میں سے تھے اور جامعہ ملیہ علی گڑھ کے بانی تھے۔ ۱۹۱۵ء میں مکہ مکرمہ چلے گئے تھے مگر انگریزوں کے دباؤ پر شریف مکہ نے انہیں واپس کردیا۔ اور انگریزوں نے انہیں مالٹا میں نظر بند کردیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ وطن واپس آئے ۔ اس نظم میں اُن کی تعریف و توصیف بھی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے رویوں پر اظہارتاسف بھی۔ نظم حسب ذیل ہے۔

کون کہتا ہے کہ ملت کا مکمل ہے نظام　　کون کہتا ہے کہ باقاعدہ ہیں قوم کے کام

کون کہتا ہے کہ ہم رکھتے ہیں ابطال سے عشق　　کون کہتا ہے کہ ہم کرتے ہیں انکااکرام

کون کہتا ہے کہ مسجد میں جلے گھی کے چراغ　　کون کہتا ہے کہ پر نور ہیں صحن و در وبام

کون کہتا ہے فلک بوس ہے ملت کا علم　　کون کہتا ہے زمیں بوس ہیں لبہائے عوام

کون کہتا ہے جگر دوز ہے اپنی آواز　　کون کہتا ہے عدو سوز ہے اپنا پیغام

کون کہتا ہے بجا لائے ہم اشراطِ عمل　　کون کہتا ہے نہیں سعی میں اب جائے کلام

دیکھ لو مفتیٔ بے باک ہیں محمود حسن
لیکن اب تک نہیں باضابطہ شیخ الاسلام

اگلی نظم ''جرم عشق'' جو یکم جون ۱۹۱۸ء کو مرشد دہلی میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے بارے میں انیسہ خاتون

شروانیہ لکھتی ہیں۔

''علی برادران سے ان کو خاص عقیدت تھی۔ اُن کی نظر بندی پر پر اثر نظم لکھی۔''جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

کمند غم سے یہ دل گو کبھی رہا نہ ہوا ہزار شکر کہ شرمندۂ بکا نہ ہوا
فغاں ہے آج اسی لب پہ مہر تھی جس پر وہ عقدہ آج کھلا ہے کبھی جو وا نہ ہوا
مسز بسنت نے صد شکر پائی آزادی ہزار حیف ''محمد علی'' رہا نہ ہوا
ہمارے راہ نماؤں کو چھوڑ دو صاحب کہ پیش چشم ہے تاریک کل زمانہ ہوا
فروغ طالع ملت سے ان کا پاک وجود شب سیاہ میں ثابت چراغ نہ ہوا
بری شرورفتن سے رہے وہ باطن میں نہ ظاہر ان کا کوئی فعل باغیانہ ہوا
''.....۱۲

زخ ش غیر معمولی ذہنِ رسا رکھتی تھیں۔ اگرچہ ان کا باہر کی دنیا سے رابطہ براہ راست نہ تھا۔ لیکن اخبارات' رسائل اور کتابوں کے ذریعے حالاتِ حاضرہ کا پورا ادراک انہیں تھا۔ انہوں نے نہ صرف کسانوں کی حالتِ زار پر آواز اٹھائی مزدوروں کے بھی دکھ کو محسوس کیا اور اُس وقت لکھا جبکہ ترقی پسند تحریک کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ۱۹۲۰ء میں مزدور پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ کرنل ویجوڈ ین جب ہندوستان آئے تو انہوں نے ان کے خیرمقدم میں ایک نظم لکھی۔ جو خطیب دہلی میں چھپی' اس کا عنوان ''کرنل ویجوڈ کا خیرمقدم'' ہے۔اس کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

مرحبا اے اجل طنطنۂ نازو غرور مرحبا اے اثر آہ وبکائے مزدور
متکفل ہے غریبوں کا علیلوں کا طبیب، تو ستم کش کا معاون ہے منادی کا مجیب
تو ہے سرمایہ رنج و غم سرمایہ فزا اجرتِ کوشش مزدور ہے نظارہ ترا
کذب پر مضحکہ فرما ہے تبسم تیرا صدق کا دبدبہ افزا ہے تکلم تیرا

چونکہ کل ہند تری دید سے ہے وقف سرور
شعرا کو غزل آرائی ہے اس وقت ضرور

مزدور سے اپنے جذباتِ ہمدردی اور محبت کا اظہار انہوں نے اگلی تخلیق میں کیا ہے جسے ''غزل'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ واحد غزل ہے جو نظموں کے اس مجموعے میں شامل ہے اس کی ردیف مزدور ہے۔ اس کے لئے شان

الحق حقی نے لکھا۔

''شاعرہ کی اس شوخیِ طبع کو دیکھیے کہ اُس نے بائیس اشعار کی خاصی طویل نظم کو ''غزل'' کا عنوان دیا ہے اور سارے مجموعے میں بس یہی ایک غزل نظر آتی ہے۔ صنفِ غزل کی قلب ماہیت کا حوصلہ اور کسی نے نہیں کیا۔''

انیسہ خاتون لکھتی ہیں۔

''غزل جس کی ردیف مزدور ہے۔ جذباتِ ہمدردی اور بلاغت بیان کے اعتبار سے قابل دید ہے۔ اس میں مزدوروں کی مشقت وتعب، نکہت و زبوں حالی اور سرمایہ داروں کی ظلم و زیادتی اور تغافل و بے احساسی کا صحیح نقشہ نہایت موثر اور درد انگیز الفاظ میں کھینچا ہے۔''......۱۳

احسان دانش کو اردو میں شاعرمزدور کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مزدور ے حوالے سے ان کی بعض نظمیں بہت مشہور ہوئی ہیں۔ خصوصا ''دختر مزدور کی رخصت'' لیکن احسان دانش کی نظموں سے بہت پہلے ۱۹۲۲ء میں زخ ش مزدور کو شاعری کا موضوع بنا چکی تھیں۔

اس نظم سے انتخاب درج ذیل ہے۔

شاہد ارض کرے کیوں نہ دعائے مزدور — بہرزینت ہے وہ محتاجِ بقائے مزدور

علم و تہذیب و ترقی و سکون و تفریح — ہیں ظہورِ عمل سحر نمائے مزدور

ثبت جس پرزہ پہ ہے ملکیتِ سرمایہ — کس کا مرہونِ کرم ہے وہ سوائے مزدور

حجرو خشت کار کھو آکے سروں پر انبار — نرد بانوں پہ چڑھاتی ہے قضائے مزدور

کارخانے میں جو بارود کے بم آکے پھٹا — جل گیا پیکر بے جرم و خطائے مزدور

غلہ ڈھونے سے پسینے میں نہائے سو بار — جب ہوا پارہ ناں روزہ کشائے مزدور

گر تناقص نہ ہو مزدوروقبا میں تو کہوں — کہ تن چوب پہ ڈھیلی ہے قبائے مزدور

کلۂ برف دسمبر میں ہے سر کے اوپر — فرشِ آتش ہے مئی میں تہ پائے مزدور

خوابگہ بھی ہے وہی۔ مطبخ و مزبل بھی وہی — دیکھنا کلبہ محروم ضیائے مزدور

شرح جو رشب بارش کی نہیں کچھ حاجت — خستہ چھپر سے ٹپکتا ہے عنائے مزدور

طفل کی فکرِ شکم۔ زن کا غمِ عریانی — شبِ تاریک میں ہیں خواب ربائے مزدور

قرض خواہو! در مرحوم کا پیچھا چھوڑو	وارث بے و رمی ہیں ورثائے مزدور
کل جہاں اس کے لئے جیل ہے پھانسی گھر ہے	خاص کر ہند تو دوزخ ہے برائے مزدور
شاید اے مالک سرمایہ نہیں تجھ کو خبر	ناظرو قادر و عادل ہے خدائے مزدور
سخت حیرت ہے مہ و خور ہیں صحیح وسالم	روزگو دیکھتے ہیں صبح و مسائے مزدور
قربِ شہ کا سرِہم چشم کو ہے گر سودا	دلِ نزھت کو بھی ہے فخر دلائے مزدور

زخ ش کی اس نظم کے ایک مصرعے ''ناظر و قادر و عادل ہے خدائے مزدور''۔نے مجھے اقبال کا ایک شعر یاد دلایا۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

زخ ش کی نظم اقبال سے قبل کی ہے لیکن ایک عہد میں خیالات و الفاظ کی ہم آہنگی کی مثالیں عام ہیں۔

اگلی نظم ''ثنائے خادمِ اسلام''(۱۸۹۳تا۱۹۶۰ء) فرمانروائے افغانستان امان اللہ خان کی مدح میں فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔

''امان اللہ خان اپنے والد امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد ۱۹۱۹ء میں کابل کے تخت پر بیٹھے۔ چند ماہ بعد افغانستان کی تیسری جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں برطانوی افواج فتحیاب ہوئی مگر معاہدہ راولپنڈی کی رو سے برطانیہ نے افغانستان کی مکمل خودمختاری کی توثیق کی اور دونوں حکومتوں میں مساوی درجے کے تعلقات قائم ہوگئے۔ امان اللہ خان روشن خیال حکمران تھے۔ انہوں نے افغانستان میں مغربی طرز کا نظم ونسق قائم کرنے کی کوشش کی۔''.....۱۴

اس نظم کے بارے میں وہ ۱۳دسمبر۱۹۲۰ء کو اپنے روزنامچے میں لکھتی ہیں۔

''تازہ برطانوی و افغانی معاہدے کی خبر سن کر(جو صریحاً دولت خداداد افغانستان کی بہتری سے معمور ہے) کچھ شعر کہے تھے۔مگر انتشارِ طبیعت نے نظم کی تکمیل نہ ہونے دی۔ آخر مدت بعد آج اس ضروری کام سے فراغت نصیب ہوئی۔ اس مختصر نظم میں اس عمیق و صادق عقیدت کا اظہار ہے جو اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان دام ملکہ کی ذات سے اس ''بد نام کنندہ نکونامہ چند'' افغانی الاصل کو حاصل ہے۔درحقیقت اس دورِ ظلمت میں ہمارے موجودہ امیر کا تابناک وجود ستارۂ صبح ہے۔''

مذکورہ نظم سے پانچ اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

بشاہراہ ثنائے شہاں نمی پویم ثنائے خادم اسلام گویم۔ ارگویم

نویسم از بخطا شرح وصف ہیچو خودے بہ موجہ عرق شرم دفترش شویم

چرابہ سیم فروشم ضمیر طاہر خویش چو حق کشاد درگنج روح بررویم

مراچودید دلیرانہ محو خود بینی بگفت خسرو کابل ''نگاہ کن سویم''

جمال آں ملک ملک فقر ہوش ربود نمود عشوہ چشمش اسیر جادویم

اگلی نظم ''زنانہ آواز'' مئی ۱۹۱۹ء کو خطیب دہلی میں شائع ہوئی۔ یہ نظم پہلی جنگ عظیم کے اختتام اور ''انجمن اقوام'' کے قیام پر کہی گئی۔ اس انجمن کے قیام سے انہیں امید ہوگئی تھی کہ اب دنیا میں امن و امان قائم ہوگا۔ خصوصاً ترکی کے حالات سے وہ دل گرفتہ رہتی تھیں۔ انہوں نے زنانہ آواز میں ان معاہدوں کی بھی یاد دلائی ہے جس کے تحت مقامات مقدسہ کے محفوظ ہونے کی امید بندگئی تھی۔ انیسہ خاتون لکھتی ہیں۔

''انعقادِ لوزان کانفرنس کے موقعہ پر وزیراعظم انگلستان کو ان کا ابتدائی وعدہ ''زنانہ آواز'' میں اس طرح یاد دلاتی ہے۔

مقاماتِ مقدس میں نہ دست اندازیاں ہوں گی
اب اس وعدے کا ایفا لازم اے سرکار والا ہے
مسیحی ہو۔ مسیحائی کرو بیمار ترکی کی
بڑے نازوں سے جس کو مادر گیتی نے پالا
نہ سمجھو دل کو تم بے غم نہ سمجھو غم کو مصنوعی
ہمارا درد بے پایاں ہمارا از خمِ اعلیٰ ہے

اس وقت اس انجمن اقوام کا قیام یورپ میں دوامی امن حاصل کرنے کی غرض سے عمل میں آیا تھا۔ اس پر لکھا ہے۔

نوید اے اہلِ دل قائم ہوئی اقوام کی مجلس
نئے سانچے میں جس نے صورت ہستی کو ڈھالا ہے

بحمداللہ تہ و بالا نہ ہوگی جنگ سے دنیا

اب اس فتنہ کو تم نے وعدہ محشر پہ ٹالا ہے۔''

۱۵......

تاہم اس نظم میں طنزاور یورپ کی سیاست پر عدم اعتماد بھی موجود ہے۔

سیاسیات مغرب کی طلسمی نقشہ آرائی

سمجھ سے اپنی باہر ہے۔ خرد سے اپنی بالا ہے

نظر آیا ہمیں گرداں میں کالا۔ تو حیرت کیا

ان آنکھوں سے جہاں میں ہم نے بھی کچھ دیکھا بھالا ہے

اگلی نظم ''موصل کا تیل'' یکم اگست ۱۹۲۰ء کو روزنامہ زمیندار' لاہور میں شائع ہوئی۔ یہ ایک طنزیہ اور بامعنی نظم ہے۔موصل عراق کا شہر ہے جہاں تیل کے کنویں ہیں۔ آج بھی جبر اق جنگ اور خانہ جنگی کی لپیٹ میں ہے تیل ہی اس کی وجہ ہے تو اس نظم کی معنویت اس میں چھپا ہوا طنز اور آنے والے حالات کی پیش بینی اور مزید قابل تعریف ہوگئی ہے اور شاعرہ کی غیر معمولی فراست اور سیاسی بصیرت کا ثبوت دے رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ صرف ۲۶ برس کی عمر کی ایک لڑکی جو گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں گئی بلکہ اس دور میں تو وہ تقریباً اپنے کمرے تک محدود تھیں۔ حالات حاضرہ سے نہ صرف آشنا بلکہ ان کے تجزیے اور پیش بینی کا اعلیٰ شعور رکھتی تھیں۔ نظم کی وجہ تسمیہ جنگ عظیم اول کے بعد عراق پر انگریزوں کا تسلط ہے اور جس کی وجہ موصل شہر میں تیل کے ذخائر تھے۔اس نظم میں سے اشعار دیکھیں۔

بزم میں مثل تبرک بٹ گیا موصل کا تیل

اے خلافت! تیرا ہم قسمت ہوا موصل کا تیل

محرم اسرار قیمت جب کلیمنشو ہوئے

پیٹ کر سر چیخ اٹھے''ہے ہے مراموصل کا تیل''

موسیو بھی۔ سینٹر بھی۔ اور پریسیڈنٹ بھی

ہاتھ ملتے ہیں کہ مسٹر لے اُڑا موصل کا تیل

کیوں ڈریں درد آفرینی عراق و ہند سے

کیا نہیں پاس ان کے مالش کی دوا موصل کا تیل

کیا اثر ہو اشک کے قطروں کا لائڈ جارج پر

کر چکا ہے آپ کو چکنا گھڑا موصل کا تیل

آہ۔ اے برطانیہ! نایاب تھی خلعت تری

گر نہ ہوتا داغِ دامانِ قبا موصل کا تیل

اگلی نظم ''ترانہ اتحاد'' ربیع الاول ۱۳۳۸ھ میں استانی دہلی میں شائع ہوئی۔ عیسوی سن میں یہ سال ۱۹۱۹ء بنتا ہے۔ اس نظم میں ہندو مسلم اتحاد کا ترانہ ہے۔ انیسہ خاتون نے اسے ملکی اتحاد کا ترانہ اتحاد کہا ہے۔ اس کی زمین وہی ہے جو اقبال کے ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اقبال سے متاثر نظر آتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ایک عہد کی صورت حال یکساں دونوں پر اثرانداز ہورہی ہے۔ اس نظم کے بارے میں اپنے ایک خط میں انہوں نے لیلیٰ خاجہ بانو کو لکھا۔

''یہ چند اشعار اقبال کے شہرہ آفاق ترانے آج ہی رات کہے گئے تھے۔۔۔۔۔ اس ترانے کو مرد و عورت دونوں فریق کی نظر سے گزرنا چاہیے۔ اس لیے اگر خطیب کے کالموں میں بھی استانی میں چھپنے کے بعد منتقل کردیا جائے تو بے جا نہ ہوگا''......۱۶

اس نظم سے ابتدائی سات اشعار نقل کررہی ہوں۔

جنت کی دید سے ہے دل شادماں ہمارا شکر خدا وطن ہے ہندوستاں ہمارا

روشن ہے جوہری پر موتی کی قدر و قیمت تاریخ دان عالم ہے قدرداں ہمارا

کہتے ہیں ہم کو ''ہندی'' حب وطن ہے ایماں کیا پوچھتے ہو دین و نام و نشاں ہمارا

آلامِ مسلماں پر بولے تڑپ کے ہندو سودوزیاں ہے انکا سودوزیاں ہمارا

درد نفاذِ دم الا خوین چاہتا تھا شاکر ہے قاتلوں کا آرام جاں ہمارا

روتے ہیں ہم جو مل کر گنگ و جمن کی صورت شاداب ہوکے ہنستا ہے گلستاں ہمارا

ہوجائے کاش ثابت روحونگی کوچہ گردی بن جائے کاش گاندھی ہر نوجواں ہمارا

اگلی نظم ''ترانہ ملت'' جو استانی دہلی میں جمادی الاول ۱۳۳۸ھ کو چھپی اور یہ نظم بھی ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی۔ اس نظم میں انہوں نے ملتِ اسلامیہ کو مخاطب کیا ہے اور یہ نظم بھی علامہ اقبال کی پیروی ہے جس کا حوالہ اس نظم کے تیسرے شعر میں موجود ہے۔ نظم میں ملتِ اسلامیہ کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ خود اپنے علاج کی تدبیر کرے۔ اپنے اسلاف کے کارناموں اور قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرے۔ اس نظم میں رجائیت اور رزمیہ کیفیت موجود ہے۔

ہم خوش ہیں کہ دل غم سے ہے صد پارہ ہمارا　　روٹھے کو منائے گا یہ کفارہ ہمارا

اسبابِ مرض سے نہیں آگاہ معالج　　کیا خاک کرے چارہ یہ بیچارہ ہمارا

اے شاہدِ اقبال! حیا کی کوئی حد بھی　　صدیوں سے ہے دل طالب نظارہ ہمارا

قرآن ہے جب رہبریٔ عام کو موجود　　کس ذھن میں ہے پھر قافلہ آوارہ ہمارا

اعدا کے تملق کو کریں لطف پہ محمول　　ایسا بھی دماغ اب نہیں ناکارہ ہمارا

ہے نسلِ بشر اپنی رہا کردہ کنیزک　　ہے ملک جہاں راندہ صدبارہ ہمارا

بننے کو ہے طوطی کی صدا شور حریفاں　　بجنے کو ہے آفاق میں نقارہ ہمارا

لاتا ہے ابھی ذہن رسا عرش کی خبریں　　بے کار رہے گا نہ یہ ہر کارہ ہمارا

اُڑتا ہے ابھی جوش ہمیں لے کے فلک پر　　تیار ہے تیار ہے طیارہ ہمارا

اگلی نظم ''لاتقنطو'' سیاسی نظم ہے اور مسلمانوں کے حالِ زار پر افسوس ہے۔ اس نظم میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ کے غلبے اور ملت اسلامیہ کی زبوں حالی کا ذکر ہے۔ یہ ایک عام سی مختصر نظم ہے اور قرآنی آیات کا زیادہ استعمال اس کے اثر کو زائل کررہا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے یہ کمزور نظم ہے۔

اگلی نظم ''فریاد یا الٰہی'' جنوری ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی اور استانی دہلی میں شائع ہوئی۔ یہ مسلمانوں کے زوال کا نوحہ ہے۔ ہیئت میں یہ ایک رواں مخمس ہے اور اثر رکھتی ہے۔ اس نظم کا پہلا اور آخری بند نقل کررہی ہوں۔

فرعون تخت زر پر ہے شاد یاالٰہی　　جنت بنا رہا ہے شداد یاالٰہی

شبیر ہے شہیدِ بیداد یاالٰہی　　قید یزید میں ہے سجاد یاالٰہی

فریاد۔ یاالٰہی۔ فریاد۔ یاالٰہی

ہر نغمیاں ہے نالہ مثل جرس ہمارا　　اک آد پر شرر ہے یاں ہر نفس ہمارا

ہم بلبلِ ارم ہیں۔ دنیا قفس ہمارا　　یاں داد رس نہ کوئی فریاد رس ہمارا

فریاد۔ یاالٰہی۔ فریاد۔ یاالٰہی

اگلی نظم ''زمزمہ حیات'' دو حصوں پر مشتمل ہے اور پہلے حصے میں کائنات کی اُن نعمتوں کا ذکر ہے جن کا جلوہ حیات دکھلاتی ہے اور دوسرے حصے میں ان نعمتوں سے فیضیاب ہونے والی قوموں کی تاریخ ہے۔ لیکن اس بات کا دکھ بھی ہے کہ مسلم قوم حیات کی عاشق و شیدا نہیں۔

ہے جہاں جلوہ گہ شاہد رعنائے حیات
ہر جگہ پیش نظر ہے رخ زیبائے حیات

ارتقائے بشری نامیہ کا مظہر ہے
روشنی علم کی ہے شمع تجلائے حیات

دوڑنے کھیلنے۔ غل کرنے کی شائق موجیں
بنتی ہیں بحر میں نقالِ ادا ہائے حیات

آفرینش میں نظر جلوۂ شادی آیا
جب کہ آدم نے لیا بوسۂ سیمائے حیات

طالبِ زیست بشر سے وہ نہ ہو کیوں راضی
حی و قیوم ہے خود خالقِ یکتائے حیات

دوسرے حصے میں لکھتی ہیں۔

زیست سے گر متنفر ہے تو بس اک مسلم
ہاں وہی تھا جو کبھی عاشق و شیدائے حیات

آہ اے منتظرِ ساغر زہراب فنا
آہ اے بے خبرِ لذت صہبائے حیات

طفلِ مکتب تھے ترے رمز شناسِ فطرت
کھیل تھا تیرے لئے حل معمائے حیات

کون کہتا ہے کہ ہو اٹھ کہ خراماں یکدم
کچھ تو لیکن حرکت کر بہ تقاضائے حیات

اگلی نظم ''البلاغ المبین'' ۱۹۱۹ء لکھی گئی۔ یہ فارسی میں طویل نظم ہے۔ اس میں لہجہ ناصحانہ ہے۔ اس میں قوم کو فارغ و بیکار اور عیار دشمن سے غافل نہ رہنے کی نصیحت ہے اور علم و عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ مطلع ہے۔

اے قوم! چند فارغ و بیکار بیٹھنا غافل زکیدِ دشمن عیار بیٹھنا

یہ ایک طویل خوبصورت نظم ہے۔ آگے لکھتی ہیں۔

بازورِ علم و فضل نہ باقوتِ حسام خواہم جہاں ستان و جہاندار بنیمت

اگلی نظم بھی قومی نوعیت کی ہے اور فارسی میں ہے جو اگست ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی اور مارچ ۱۹۲۰ء میں کہکشاں لاہور میں شائع ہوئی۔نظم کا عنوان ہے''چیست یارانِ طریقت! بعد ازیں تدبیرِ ما'' نظم کے تین حصے ذیلی عنوان کے تحت ہیں۔''استصوابِ عام''۔''طبقہ انتہا پسند''۔''طبقہ اعتدال پسند''یہ نظم بھی ان کے سیاسی وسماجی شعور کی آئینہ دار ہے۔

مجموعہ فردوس تخیل کے دور ثالث کا اختتام پانچ ایسی نظموں پر ہوتا ہے جن میں اُن کے مذہبی جذبات عروج پہ ہیں۔ پہلی ''شیون محمدیہ'' منظومہ اکتوبر ۱۹۱۷ء فارسی میں ہے۔ یہ دعائیہ نعت ہے۔مطلع اور آخری دو اشعار نقل کررہی ہوں۔

یا محمد ﷺ نامِ پاکت قفلِ دلہارا کلید
ہم چو بسم اللہ کہ شد مفتاحِ قرآنِ مجید

یا شفیع المذنبیں ﷺ! یا رحمۃ للعالمیں ﷺ
اندراں دم۔ یک نگاہِ مرحمت دارم امید
شافم شو پیشِ حق ہنگام گیر و دارِ حشر
یا نبی ﷺ! بہر بتول پاک و حسنین شہید

دوسری نعت''ذکر حبیب'' کے عنوان سے فروری ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی ہے۔یہ بھی فارسی میں ہے اور عنوان کے نیچے وضاحت کردی گئی ہے کہ قاآنی کے رنگ میں ہے۔ یہ حمدِ باری تعالیٰ سے شروع ہوکر نعت رسول میں ڈھل گئی ہے۔اس طویل نعت سے ابتدائی اور آخری دو دو اشعار نقل کررہی ہوں۔

بہ چرخ و ارض و۔برو۔ بحر غیر ذکر اللہ ہو
ہمہ ملعوں۔ہمہ مفتوں۔ ہمہ افسوں۔ ہمہ جادو
لسانؑ عاجز۔ وہاں قاصر۔ زبان الکن۔ بیان کوتہ
زوصفِ رب۔ زمدحِ شہ ۔ زحمدِ ایں۔ زنعتِ او
برِ مداحِ تو باغ و نگارو۔ بادۂ و۔ شیشہ
بود ہاموں۔ بود مضموں۔ بود فکرت۔ بود زانو

مبارک بلبل و شیداؤ۔ شوی و بزمِ و صفت را
گلِ خوشبو۔ بتِ خوشرو۔ زنِ خوشتو۔ منِ خوشگو

تیسری نعت ''عشقِ رسول ﷺ'' بھی فارسی میں ہے اور چھوٹی بحر میں خوبصورت نعت ہے جو فروری ۱۹۲۰ء میں لکھی ہے۔ اس کے دو اشعار اور مقطع نقل کر رہی ہوں۔

زہر موئے تن شور ''الحمد'' خیزد خوشالطفِ عشق و ملالِ محمد ﷺ
الاگر تو داری سر روئیت حق بیادر بہشتِ خیالِ محمد ﷺ

بود باد دردست مداح شاہاں
سپس نزھت و مدح آل محمد ﷺ

چوتھی نعت بعنوان ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' نومبر ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی۔ یہ معراج رسول مقبول پر لکھی گئی ہے اور ایسی نعت ہے جو میلاد کی محفلوں میں پڑھی جاتی ہے۔ رواں بحر میں اور سادہ ہے۔ ابتدائی اشعار نقل کر رہی ہوں۔

چرخ سے بالا جائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
مہر نشان پائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کان میں آواز آتی ہے پیہم صلی اللہ علیہ وسلم
کون ہے مدح آرائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کیا دلکش ہے بزم کا منظر۔ آویزاں ہے دیواروں پر
چوکھٹے میں طغرائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

طاہر۔ ذاکر۔ قائم۔ قاسم ناطق۔صادق۔ داعی۔ ہادی
پیارے ہیں کیا اسمائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

پانچویں نعت ''یارسول'' دعائیہ ہے یہ نومبر ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی۔ اس دعائیہ نعت میں اُن کا دکھ' اُن کی طلب اور ان کی کیفیات مذہبی عقیدت کے ساتھ مل کر تاثر انگیز بناتی ہیں۔ انہوں نے دعا کے ساتھ حالات کا شکوہ بھی کیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

آئی ہے در پہ ایک طلب گار یارسول ﷺ بس اک، نگاہ لطف ہے در کا یارسول ﷺ
کر میرے غم پہ۔ درد پہ۔ تکلیف پہ۔ نظر یا خیرِ خلق۔ یا شہہ ابرار۔ یارسول ﷺ

برسا رہا ہے دل پہ مرے ہر طرف سے آگ ۔۔۔ مایوسیوں کا لشکرِ جرار یارسول ﷺ

ڈر ہے کہ۔ گر نہ جائے درِ قلعۂ سکوں ۔۔۔ ڈر ہے کہ۔ ہو نہ جاؤں گرفتار یارسول

ہوں مثل حمزہ اہل وطن کی شہید جور ۔۔۔ یہ تن ہے۔ اور ہندِ جگر خوار یا رسول

سن کر نوید ''طالح ' ل'' آئی تیرے پاس ۔۔۔ تیری کنیز۔ تیری گنہگار یا رسول

زہادِ خشک مغز ہیں کوثر کے مستحق ۔۔۔ ساقی کی ہوں میں تشنۂ دیدار یا رسول

اے جذبِ دل! لپک کے خبر کر حضور کو
گریاں ہے در پہ نزھتِ خونبار یارسول

ان پانچ پر عقیدت نظموں پر دورِ ثالث کا اختتام ہوا ہے۔ مجموعے کا اگلا باب ''مجمع احباب'' کے عنوان سے ہے۔

فردوس تخیل کا چوتھا باب ''مجمع احباب'' کے عنوان سے ہے اس میں ۵ نظمیں شامل ہیں جیسا کہ اس باب کے عنوان سے ظاہر ہے یہ نظمیں ان کے احباب اور رفقاء سے متعلق ہیں۔ اس میں منظوم خطوط بھی ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان ''نامرادی'' ہے جو اپریل ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ یہ ایک منظوم خط ہے جس میں رابعہ کو مخاطب کیا گیا ہے اور حاشیے میں ان کا پورا نام رابعہ سلطان بیگم میر طاہر علی صاحب انجینئر سلطنت آصفیہ تحریر ہے۔ رابعہ خاتون ز خ ش کی معاصر انشاء پرداز تھیں اور تہذیب نسواں میں اُن کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ ز خ ش کی اُن سے دوستی مسلسل خط و کتابت تھی۔ اُن سے متعلق کئی منظوم خطوط مجموعے میں شامل ہیں۔ اس نظم ''نامرادی'' کا پس منظر اتیہ خاتون نے تحریر کیا ہے۔

''ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ یہ بیگم صاحبہ اپنے کسی بزرگوار کی پابند ہوکر زنانہ گرلز کالج دیکھنے کے لیے چند گھنٹے علی گڑھ کو آئیں آگرہ، دہلی وغیرہ کی سیاحت کے دوران میں یہ زمانہ ان دونوں کی باہمی خط و کتابت کا ابتدائی زمانہ تھا اور ہندوستان میں موٹر کار کے رواج کی بھی ابھی بالکل ابتدا تھی۔ انہوں نے قبل بغیر اطلاع کے قلعہ جدید سے موٹر طلب کی جو کہ کسی نقص کی وجہ سے نہ جا سکی۔ اس لیے رابعہ صاحبہ مرحومہ بغیر ملاقات کے ناکام واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد پھر کبھی ان کے اس نواح میں آنے کا اتفاق نہ ہوا اور نہ کبھی دونوں دلی دوستوں میں باہم ملاقات ہوسکی۔ اگر چہ بارہا جانبین سے بلاوے رہے۔''......۱۷

نظم نامرادی سے چند اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

اے نسیم صبح کہیو رابعہ سے جاکے یوں ۔۔۔ بد نصیبی۔ نامرادی، مانعِ دیدار تھی

وائے ناکامی کب آئی باغ میں فصل بہار | جب قفس میں عندلیب بے بس (کذا) و ناچار تھی
جب سنا میں نے ''ہوئیں رونق فروز کول تم'' | اس گھڑی میری خوشی ناقابل اظہار تھی
وہم کتنا تھا''غلط''۔ امید کہتی تھی ''صحیح'' | ساکنانِ دل میں باہم دلنشیں تکرار تھی
کچھ نہ پوچھو اس گھڑی کی جب گھڑی پر تھی نظر | شاق تھا اک اک منٹ اک اک گھڑ دشوار تھی
خانۂ دل بھی سجا آنکھیں بھی فرشِ رہ ہوئیں | ہوگئی مشغولِ کاروبار گو بیمار تھی
نقصِ موٹر سن کے اک بجلی سی دل پر گر پڑی | تھا قصورِ بخت کب تقصیر موٹر کار تھی

اے نسیم صبح! کہیو اس کے بعد اک بار پھر
بد نصیبی۔ نامرادی مانعِ دیدار تھی

نظم میں پورا واقعہ منظوم ہے اور اس دکھ کا بھرپور اظہار بھی ہے جو سہیلی سے ملاقات کا موقع ضائع ہونے پر ہوا۔ اس نظم سے انداز ہوتا ہے کہ وہ حساس و ذہین شاعرہ جسے اپنے خیال وفکر کو عام کرنا تھا۔ ہم عصر خواتین ادیبوں سے بھی ملاقات نہ کرنے کی پابند تھیں۔ ان کے رابطے صرف خطوط تک محدود تھے۔ اس حصے کی دوسری نظم ''پیام'' بھی رابعہ خاتون کیلئے ہے جو اپریل ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی۔

الم کشوں کی ہے تو غمگسار بادصبا | بنالے مجھ کو بھی منت گزار بادصبا
قسم ہے سینۂ عارف کے آئنہ کی تجھے | نکال دے جو ہو دل میں غبار باد صبا
سحر کو پایۂ تختِ دکن کا رخ کیجو | لقب ہے جس کا عروس الدیار باد صبا
پڑے گا سابقہ اک دائم المرض سے تجھے | دم مسیح کو لے مستعار بادصبا
مری مہذبہ کے گھر سلیقہ سے چلنا | نہ جھوم جھوم کے مستانہ دار بادصبا
مگر کچھ ایسے دکھانا کمالِ رقاصی | کہ ہنس ہی جائے وہ بے اختیار بادصبا
ہنسی ہنسی میں اسے خاک اڑا کے دکھلانا | کچھ انتشارِ دلِ خاکسار بادصبا
پھر اس کے بعد ہمارا سلام پہنچانا | پیاری رابعہ کو یہ پیام پہنچانا
دل افسردہ کو اب طاقت قرار نہیں | نگاہِ شوق کو اب تابِ انتظار نہیں
ہمیشہ وعدے کئے اب کے مل ہی جا آکر | حیات و وعدہ و دنیا کا اعتبار نہیں

لکھوں خط طلبی۔ بس یہ اختیار میں ہے مٹاؤں خط مقدر۔ یہ اختیار نہیں
دکھاتی اپنی محبت کو چیر کر سینہ مگر نمود مرا شیوۂ و شعار نہیں
گلے میں طوق پڑا ہے اسیرئ غم کا جو تیرے ساعد سیمیں گلے کا ہار نہیں
مری بہن! مری محبوبہ! حب عجب شے ہے جہاں میں خاک نہیں کچھ۔ جو دوست دار نہیں
وہاں سے تم جو نہ آئیں۔ جہاں سے چل دونگی پھر اس کا غم ہو تمہیں۔ تو میں ذمہ وار نہیں
جو اس پیام سے دی تو نے اس کو آگاہی کروں گی تادمِ آخر تری ہوا خواہی

اس نظم میں والہانہ محبت کا اظہار اور ملاقات کی شدید خواہش موجود ہے۔ بین السطور معذرت بھی موجود ہے جو ملاقات نہ ہوسکنے کی وجہ سے ان کے احساس کا حصہ بن گئی۔ اگلی نظم ''معذرت'' ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی ہے۔ یہ چھوٹی بحر میں فارسی زبان میں ہے۔ جیسا کہ نظم کے حاشیے میں لکھ دیا گیا ہے کہ مخاطبت رابعہ سے ہے۔ یہ مختصر نظم ہے جو میں یہاں نقل کر رہی ہوں۔

الا اے کہ گفتی بکن ظلم کم الا اے فغاں سنج خوے بدم
الا اے کہ گفتی زبہر کتب مکن ترک ارسال خط یک قلم
تو دانی۔ کہ دارم دلے پر الم تو دانی۔ کہ وارم دو چشمانِ زار
بحالیکہ غمگینم ازدردِ چشم زحرفِ شکایت میفزائے غم
دل نارم را مپندار سنگ ایا طرح اندازِ قصر ستم
فغانم ز مکتوبِ لوحِ جبیں نہ بہر کتب با بخشم اندرم
کرم گسترا! عذر نزہت بنہ
کہ عذرا ست مقبولِ اہلِ کرم

مذکورہ بالا تین نظمیں دوسرے دور کی ہیں۔ یعنی اپریل ۱۹۱۶ء سے قبل کی جب اُن کے بھائی حیران کا انتقال نہیں ہوا تھا۔ اس حصے میں چوتھی نظم ''آ دیکھ مجھے'' مارچ ۱۹۱۷ء میں لکھی گئی۔ اس میں بھی مخاطب رابعہ ہیں۔ اس نظم میں اداسی اور بے چارگی اپنی انتہا پر ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رابعہ خاتون کی طرف سے ملاقات کا اصرار تھا۔ رابعہ خاتون خود بھی بیماری اور صدمات سے دوچار تھیں جس کا ز خ ش کو علم تھا۔ چنانچہ اس نظم میں شدتِ احساس اور تلخ حقائق کا ایسا اظہار ہے

جو دل پر گہرا اثر کرتا ہے۔ نظم میں ظاہری اور باطنی دونوں کیفیتوں کو بے حد روانی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سے چند اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

لذت دید کا چسکا ہے تو آ دیکھ مجھے ۔۔۔ صاحب دیدۂ بینا ہے تو آ دیکھ مجھے
جو نہ دیکھا تھا کبھی تجھ کو دکھائی دے گا ۔۔۔ ساری دنیا کو بھی دیکھا ہے تو آ دیکھ مجھے
حسن صورت ہے پسندیدہ تو جا غیر سے مل ۔۔۔ حسن اخلاص کی شیدا ہے تو آ دیکھ مجھے
مٹ گیا فرق من و تو جو مٹی میں تجھ پر ۔۔۔ آئینہ گر نہیں دیکھا ہے تو آ دیکھ مجھے
مری صورت ہے تماشا گہ یاس و امید ۔۔۔ گر تجھے شوقِ تماشا ہے تو آ دیکھ مجھے
دیدنی ہے مرے پہلو کا پری خانہ بھی ۔۔۔ سیر باطن کی تمنا ہے تو آ دیکھ مجھے
سب مری بات پہ کہتے ہیں کہ مختل ہے دماغ ۔۔۔ تجھ کو دیوانوں کا سودا ہے تو آ دیکھ مجھے
مجھ سے بھی برسرپیکار ہے قسمت میری ۔۔۔ دیکھنا جنگ کا نقشہ ہے تو آ دیکھ مجھے
غم مرا دیکھ کے بھولے گی سب اپنی کلفت ۔۔۔ تیرے دل کو کوئی صدمہ ہے تو آ دیکھ مجھے
رابعہ! ہے مرض غم سے برا حال مرا ۔۔۔ گر مزاج آج کل اچھا ہے تو آ دیکھ مجھے
لوگ پوچھیں گے مری صورت و سیرت تجھ سے ۔۔۔ منہ کسی کو جو دکھانا ہے تو آ دیکھ مجھے
دیکھ اب سیر عدم مد نظر ہے تجھ کو ۔۔۔ جیتے جی دید مری چاہے تو آ دیکھ مجھے

دیدنی ہے مری کیفیت ناگفتہ بہ
اس میں کرشمۂ بیجا ہے تو آ دیکھ مجھے

اگلی نظم ''ارمغان'' فارسی میں ہے۔ یہ بھی منظوم خط ہے جو شریف بی بی لاہور میں ۲۲ مئی ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا۔ خط کی مخاطب فاطمہ (فاطمہ بیگم صاحب بنت مولوی محبوب عالم ایڈیٹر اخبار شریف بی بی لاہور) ہیں۔ اس نظم کے بارے میں انیسہ خاتون تحریر کرتی ہیں۔

''فاطمہ بیگم صاحبہ بنت مولوی محبوب عالم مرحوم سابق ایڈیٹرس شریف بی بی لاہور سے بھی مرحومہ کا اکثر تبادلہ خطوط ہوا کرتا تھا اور نہ صرف خط وکتابت تھی بلکہ دو تین مرتبہ ملاقات بھی ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد اپنے منظوم فارسی خط میں انہیں لکھتی ہیں۔''

خواہرِ من فاطمہ ہمنام بنت المصطفےٰ ﷺ آں کہ از ملکیت او دولت خلق نکوست

آمدو مخانۂ مارا مسرت خانہ کرد اے خوشا وقتے کہ بیند طالبے دیدار دوست

شرح فرح و انبساطِ من نگنجد دربیاں نیک میدانی سرورم گر حبیبت روبروست

ارمغانم شعر رنگیں پیش آں باغِ کمال تحفۂ بادِ بہاری بہر گلشن رنگ دبوست

نظم پر معنی نیا مدنزھت! از طبعِ علیل

فکر عالی منفعل ازدوستانِ نکتہ جوست

''.....۱۸

اگلی نظم ''تم کہاں ہو'' دوسرے دور کی ہے جو جنوری ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی۔ یہ منظوم خط ہے جو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی احمد اللہ خان حیران کو لکھا۔ نظم کے حاشیے سے پتہ چلتا ہے کہ احمد اللہ خان حیران ان دنوں کلکتہ میں تھے۔ اس نظم میں بہن کی محبت' نصیحت اور فرقت کے احساسات کا اظہار سادہ انداز میں کیا گیا ہے۔ چند اشعار دیکھیں۔

راحتِ دل ہو لطف جاں ہو تم احمد اللہ خاں! کہاں ہو تم

دستگیرِ فتادۂ غم ہو قوتِ جسمِ ناتواں ہو تم

جلوہ گاہِ عروس حب وطن ہے یہی سرزمیں جہاں ہو تم

چاہیے تم کو بھی وطن پہ نظر چشمِ بددور۔ نوجواں ہو تم

تم پہ آنکھیں لگی ہیں ملت کی کس تصور میں ہو؟ کہاں ہو تم

یاں کے اشرار سے بچے رہنا ابھی محتاج پاسباں ہو تم

مجھ کو نفرت ہے شور سے ۔شر سے رازداں ہو۔ مزاج داں ہو تم

نظم کا نظم میں جواب ملے ماشاء اللہ نکتہ داں ہو تم

تم جو آؤ۔ تو جاں میں جاں آئے

نزھتِ خستہ جاں کی جاں ہو تم

اس حصے کی اگلی نظم ''وصل و فصل'' دسمبر ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی ہے۔ یہ بے حد پر اثر اور شدید اداسی کی کیفیت میں لکھی گئی ہے۔ اس میں مخاطب ان کی بچپن کی ساتھی انیسہ خاتون شروانی ہیں۔ یہ نظم اُن کے بھائی احمد اللہ خان

حیران اور پھوپھی زاد بھائی انس احمد ابد(انیسہ خاتون کے سگے بھائی) کا نوحہ ہے۔ اس حزنیہ نظم میں انہوں نے اپنے احساسات کے اظہار کے ساتھ ساتھ انیسہ خاتون سے تعزیت بھی کی ہے اور تسلی بھی دی ہے۔ نظم کے چار حصے ہیں۔ نظم سے چند اشعار نقل کر رہی ہوں۔

رنج مہاجرت سے تھے بے قرار دونوں
ہو کر رہے ملاقی انجام کار دونوں

لے کر گئے جہاں سے دل ہی میں دل کے ارماں
لائے تھے ساتھ بخت ناسازگار دونوں

چھوڑی نہ کچھ نشانی۔ ہاں دے گئے ہیں دل کو
داغ مفارقت کی اک یادگار دونوں

او پیچھے جانے والے! پہلے سے جب ہو ملنا
ملنے سے سیر ہولیں جب دوست وار دونوں

بہنوں کا حال شاید بھولے سے پوچھے احمد
کہیو کہ خستہ جاں ہیں اور دل فگار دونوں

نازک ہے حال نزہت صحت رہی نہ قوت
اس نے تری محبت پر کیں نثار دونوں

میری انیس مضطر! میری غریب خواہر
پائیں گے ہم نہ ان کو روئیں ہزار دونوں

کیا فائدہ جو پھڑکیں مچھلی کی طرح ہم تم
کیا فائدہ جو تڑپیں سیماب وار دونوں

اب بند کر کے آنکھیں یکبارگی چڑھالیں
صبر و رضا کا جامِ ناخوش گوار دونوں

اگلی نظم ''من الحریم الی الحریم'' اگست ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی۔ نظم سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے پھوپھی زاد بھائی محمد مونس خان شروانی جب حج بیت اللہ کو گئے تھے اس دوران لکھی گئی ہے۔ نظم میں اُن کا بذات خود اس سعادت سے محروم رہ جانے کا دکھ بھی ہے۔ خراب حالات میں سفر کرنے پر اندیشے بھی اور بھائی سے رشک و محبت

کے ساتھ مخاطبت ہے۔

مرا بھائی مونس ذی حشم۔ گیا بے درنگ سوئے حرم
اسے علم تھا۔ اسے تھی خبر۔ کہ یہ عہد عہدِ مصاف ہے
اسے اے صبا! یہ پیام دے کہ چھٹرا ہمیں غمِ ہجر سے
تنِ کوہ جس سے ہے مرتعش۔ یہ وہ تیغ سینہ شگاف ہے
تو صفائے قلب کی سعی میں۔ در اہل دل کا طواف کر
کہ فیوضِ صحبت کعبہ سے متبرک اس کا غلاف ہے
تراشوق دید کمال ہے۔ ترا ہجر دل پہ وبال ہے
بخدا حقیقتِ حال ہے۔ نہ یہ لاف ہے نہ گزاف ہے

اس نظم میں انہوں نے اس عہد کو عہدِ مصاف کیوں لکھا اس کی وضاحت لیلیٰ خواجہ بانو کے نام خط سے ہوتی ہے۔ انہوں نے ۱۲جولائی ۱۹۱۸ء کو خط میں لکھا ہے۔"آج کل ہم لوگ ایک ناگہانی واقع سے سخت تشویش میں مبتلا ہیں۔ میرے پھوپھا حاجی محمد یونس خان صاحب رئیس دتاولی 9 شوال کو بمبئی سیرج کیلئے روانہ ہونے والے ہیں۔ اوّل تو انہی کا خیال کچھ کم نہ تھا اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے چھوٹے لڑکے مونس خاں کو بھی ہمراہ لیے جاتے ہیں۔ایسا کون کمبخت مسلمان ہوگا جو اس مقدس عزم کی مخالفت کرے۔مگر یہ وقت پر آشوب ہے جبکہ دنیا میں قیامت صغریٰ برپا ہے' راستے غیر محفوظ ہیں' واپسی کیلئے جہاز کی دستیابی بھی غیر یقینی ہے۔

اگلی نظم "صحبت لیلیٰ" ستمبر ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی۔ حاشیے میں تحریر ہے کہ یہ لیلیٰ خواجہ بانو اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی کے نام ہے۔ لیلیٰ خواجہ بانو سے اُن کی طویل خط و کتابت رہی اور ملاقات بھی ہوئی ہے۔ لیلیٰ خواجہ بانو دو بار اُن سے ملاقات کیلئے بھی آئیں تھیں اور بے حد محبت کرتی تھیں۔ یہ نظم اُن سے ملاقات کے بعد لکھی گئی ہے۔ مختصر نظم مکمل یہاں نقل کر رہی ہوں۔

دیا ہمیشہ قناعت کا درس اپنے تئیں ۔۔۔ کہ پاؤں زیادہ چادر کو دیکھ کر پھیلا
ملے جو بخت سے تجھ کو۔ خوشی خوشی لیجو ۔۔۔ کبھی نہ کہیو کہ"یہ شے بری ہے وہ شے لا"
گر اتفاق سے دست طلب ہوا بھی دراز ۔۔۔ جناب بخت نے فرمایا سرہلا کے"لا"
یہ اب کے کھایا زمیں آسماں نے کیا پلٹا ۔۔۔ کہ پر ہے جنسِ مسرت سے قلب کا تھیلا

ملا کے بخت نے مجھ سے مری پیاری کو کہا پیار سے ''لے خوش ہو۔ کر نہ واویلا''

چھٹا نہ دوست کے ملنے سے رنج و فکر کا ساتھ رہا خیال جدائی سے جی مرا میلا

غرض دو گونہ عذاب است جاں مجنوں را

بلائے فرقتِ لیلا و صحبتِ لیلا (تضمین)

اگلی نظم ''لطف ستم'' بھی لیلیٰ خواجہ بانو سے مخاطب ہوکر لکھی گئی ہے۔ یہ ایک منظوم خط ہے جس کا پس منظر انیسہ خاتون شروانی نے اس طرح لکھا ہے۔

''ایک مرتبہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے (جن کی اہلیہ لیلیٰ خواجہ بانو صاحبہ سے مرحومہ کی گہری محبت اور خط و کتابت کا تذکرہ کسی جگہ آ چکا ہے) ملاواحدی صاحب کا اخبار رعیت اپنی طرف سے ان کے نام جاری کرادیا' اور اس کو کچھ عرصے تک وہ خواجہ صاحب کے پاس خاطر سے مفت لیتی رہیں۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ انہوں نے اخبار سے قطع تعلق کر لیا ہے تو فوراً امتناعی خط لکھ دیا۔ اس پر خواجہ صاحب اور لیلیٰ بانو صاحبہ نے اظہار آزردگی و ملال کیا تو ان کی محبت شعار طبیعت کو بے حد صدمہ پہونچا' اور ایک طویل معذرت نامے کے ذریعے اپنے طرزِ عمل کو ان الفاظ میں حق بجانب ثابت کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایک دلچسپ منظوم خط بھی اس بارے میں ان کو لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔''

خفا ہو اس پہ کہ خواجہ کو دست کش پاکر
رہا نہ شوق اخبار کا مرے دل میں
خفا ہو اس پہ کہ رکھتی نہیں ہے کیوں وقعت
کسی کی مکرمت بے بہا مرے دل میں
اٹھائے بوجھ ترے دوستوں کے احساں کا
کہاں یہ زور یہ طاقت بھلا مرے دل میں
سنو سنو کہ نہیں سوء ظن روا دیں میں
کہو کہو کہ نہیں اب گلا مرے دل میں

مجموعہ فردوس تخیل کا اگلا حصہ ''بزم طرب'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں تیرہ نظمیں ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو خوشی کی تقریبات کے موقع پر لکھی گئیں۔ مسرت کا دورانیہ ان کی زندگی میں بہت مختصر رہا۔ یہ نظمیں بھی مختصر ہیں اور زیادہ تر احباب اور عزیزوں کی خوشیوں میں تہنیتی شرکت قلم کے ذریعے کی گئی ہے کیونکہ ان کے پاس رابطے کی یہی صورت

تھی۔ پہلی نظم ''کامیابی امتحان'' منظومہ جون ۱۹۱۱ء ہے۔ یہ اس وقت لکھی گئی جب اُن کے بھائی احمد اللہ خان نے علی گڑھ کالج سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ یہ ایک رسمی نظم ہے جس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں خوشی کے جذبات ہیں اور دوسرے حصے میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ خوشی کی وجہ کیا ہے۔ دونوں حصوں سے دو دو اشعار نقل کر رہی ہوں۔

صحن بستاں میں مرتب بزم عشرت آج ہے ہر روش آراستگی سے رشک جنت آج ہے

شاخ گل پر ہے ترنم زیر بلبل بے دھڑک خوف گلچیں ہے نہ صیادوں کی دہشت آج ہے

جسکی اک عرصہ سے طالب تھی خدائے پاک سے آج ہے ہاں ہاں مرے دل کو وہ فرحت آج ہے

امتحانِ خدمت ملت میں بھی ہو کامیاب یہ دعائے نزھت شیدائے ملت آج ہے

اگلی نظم ''جشن افتتاح'' ہے۔نظم کے نیچے حاشیے میں تحریر ہے۔''یہ نظم علی گڑھ کے زنانہ مدرسے میں سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس کی رسم افتتاح پر بتاریخ یکم مارچ ۱۹۱۴ء خاکسار کا نام و نشاں ظاہر کئے بغیر پڑھی گئی تھی۔ بعد میں اصلاح کی گئی۔'' سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس کا افتتاح نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے علی گڑھ آ کر کیا تھا اور اس وقت یہ نظم ''قدوم میمنت لزوم'' کے عنوان سے زخ ش نے بلا اظہار نام پڑھنے کیلئے بھیجی تھی۔ بیگم بھوپال نے اس نظم کو پسند کیا تھا اور معلوم کرنا چاہا تھا کہ یہ کس نے لکھی ہے۔ اگرچہ ان کا قیام زخ ش کے والد کے گھر پر ہی تھا لیکن انہیں پتہ نہ چل سکا کہ یہ شاعرہ اسی گھر میں موجود تھی۔ اس نظم کے دو حصے ہیں اور اختتام کے بعد ایک قطعہ ''مادہ تاریخ'' کے عنوان سے ہے۔ یہاں پر دونوں حصوں سے تین تین اشعار نقل کر رہی ہوں۔

خندہ زن ہیں اہلِ دل مثل گل گلزار آج نغمہ زن جوں عندلیب شکریں منقار آج

کام نکلا تم سے اپنا۔ نالہائے نیم شب قسمت خوابیدہ آخر ہوگئی بیدار آج

حضرت عیسی کو لایا چرخ چارم سے یہی دل سے دیتا ہے دعائیں درد کو بیمار آج

یہ زنانہ مدرسہ۔ بنیاد قصر علم ہے ہے یہی امید گاہِ قوم بے تکرار آج

مہمانِ مدرسہ ہے ملکہ گردوں حشم سر بہ گردوں کیوں نہ ہوں اسکے درودیوار آج

اگلے اشعار میں سرسید احمد کی تعریف ہے۔

سید ملت بھی تو ہے خادم ملت بھی تو صادق آیا تجھ پہ قول سید الابرار آج

مادہ تاریخ بہت سادہ اور مختصر ہے۔

اجتماع اہل فن کو دیکھ کر فکر تھی مجھ کو یہ کیسا جلسہ ہے

از سر احسان ہاتف نے کہا افتتاح مدرسہ کا جلسہ ہے

۱۳۳۱ھ

اگلی نظم ''شادی نمبر ایک'' دوسرے دور کی ہے۔ یہ نظم ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو شریف بی بی لاہور میں شائع ہوئی۔ جیسا کہ نظم اور اس کے حاشیے پر دیئے ہوئے ناموں سے ظاہر ہے یہ تہنیتی نظم ہے اور سعیدہ بانو جو اس دور کی انشاء پرداز خاتون تھیں اور خواتین کے حقوق کیلئے ان کی ہم آواز تھیں۔ ان کی شادی بیرسٹر احسان الحق سے ہونے کے موقع پر کہی گئی تھی۔ اس میں بھی شادی کی تاریخ ۱۳۳۱ھ نکالی گئی ہے۔ چند اشعار دیکھیں۔

شادی ہے بہن سعیدہ کی آج گھر گھر ہے نشاط و عیش کا راج

کیوں ہو نہ مجھے دلی مسرت ہے مجھے کو دلہن سے ایک نسبت

دونوں کا ہے نصب عین اک ہی دارفتۂ قوم وہ بھی۔ میں بھی

ہے تم پہ سعیدہ ! حق کا احساں دولہا ملا خیر خواہِ نسواں

رہبر بنو فرقۂ نسا کی اس راہروشکستہ پا کی

انجام دو شان دار خدمات سید ہو دکھاؤ شانِ سادات

اگلی نظم کا عنوان بھی ''شادی نمبر۲'' ڈالا گیا ہے۔ اس کے نیچے حاشیے میں تیسرا دور درج ہے۔ یہ نظم مولانا حبیب الرحمٰن خان کی بڑی بیٹی رضیہ کی شادی کے موقع پر لکھی گئی تھی اور اس میں بھی تاریخ شادی ۱۳۳۵ھ نکالی گئی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان کا ذکر ابتدائی باب میں آچکا ہے۔ وہ نامور عالم اور ن رخ ش کے قریبی عزیز تھے۔ نظم مختصر اور رسمی ہے۔ ایک شعر جس میں تاریخ ہے درج ذیل ہے۔

بعد تبریک رضیہ سے کہا نزھت نے

سال تاریخ ہے فیروزیٔ بخت زیبا

اگلی نظم ''شادی نمبر۳'' ان کی عزیز ترین سہیلی اور پھوپھی زاد بہن انیسہ خاتون شروانی کی شادی پر لکھی گئی ہے۔ یہ دراصل دو نظمیں ہیں۔ پہلی ''تاریخ عقد'' کے عنوان سے ہے اور دوسری ''بیان وداع انیسہ خاتون'' تاریخ ۱۳۲۷ھ نکالی گئی ہے۔ تاریخ عقد میں تین اشعار ہیں جو درج ذیل ہیں۔

انیسہ کے عقد کی سنائی ہے فضلِ رب نے نوید نزہت — نظر میں ہے شب برات کے چاند جلوۂ ماہِ عید نزہت

حویلیوں میں ہوا چرچا۔ کہ ہے پرستارِ ہند دولھا — خیال بنگلہ کی سمت پہنچا بفکرِ سال سعید نزہت

وفاق ملکی کے دن تھے فصلی و بنگلہ دونوں میں سال نکلا — زروئے بہجت انیسہ خاتون کی زندگی جدید نزہت

دوسرا حصہ طویل ہے۔ انیسہ خاتون کی شادی ہارون خان شروانی سے ہوئی تھی جو ان کے قریبی عزیز تھے۔ اس نظم میں انیسہ خاتون اور ان کے شوہر کو مخاطب کر کے مبارکبادیں دی گئیں ہیں۔

نزہت کو مبارک ہو دعا گوئی خواہر — خواہر ہو مری میرے برادر کو مبارک

اچٹے نہ کبھی نیند تری فکر و مرض سے — بیداری پیہم ہو مقدر کو مبارک

ہو جلوہ نما فرح ترے دوست کے دل میں — آزردہ دلی دشمنِ ابتر کو مبارک

اظہار شرافت ترے جوہر کو ہمایوں — اقرار فضیلت ترے شوہر کو مبارک

مردود ہوں یاس و غم و حسرت ترے در سے

مقبولیت اس نذرِ محقر کو مبارک

انیسہ خاتون سے انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ وہ جذبہ اس نظم میں عیاں ہے۔

اگلی نظم ''شادی نمبر۴'' زخ ش کی حقیقی بڑی بہن احمدی بیگم نکہت کی شادی کے موقع پر لکھی گئی ہے۔ یہ شادی ان کے ننھیالی عزیز عبدالمقیت خان سے ہوئی تھی۔ نظم کے حاشیے پر منظومہ اپریل ۱۹۲۱ء درج ہے۔ نظم کا انداز ایسے موقع پر لکھے جانے والی نظموں سے مختلف اور غیر رسمی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کو محبت کے ناطے کہنا چاہتی تھیں وہ پورے خلوص سے نظم کر دیا ہے۔ نظم میں جذبات اور دانش کا بہت خوبصورت امتزاج ہے نظم کی ابتداء بہنوئی سے مخاطب ہو کر کی گئی ہے اور پھر بہن سے بھی مخاطبت ہیں۔ اگر چہ وہ عمر میں چھوٹی ہیں مگر بڑی نزاکت سے دونوں کو خوشگوار ازدواجی زندگی کے رموز سمجھاتی نظر آتی ہیں۔ نظم پر ان کی دسترس پختگی جو اس دور کی شاعری میں عیاں ہوگئی تھی واضح ہے۔ نظم سے چند اشعار نقل کر رہی ہوں۔

یہ زمزمہ مبارک۔ مخلوق کی زباں کو — شادی کا دن مبارک عبدالمقیت خاں کو

کہ فرح کتخدائی۔ کہ کلفتِ جدائی — رقت ہنسی پہ آئی چشمِ گہرفشاں کو

بھائی! میانِ دوراں بیوی ہے راحتِ جاں — آپا! بہ قدر امکاں پہنچاؤ سکھ میاں کو

بھائی! فسانہ کوئی ان سے رکھو نہ مخفی آپا نہ بات ان کی بتلاؤ رازداں کو

بھائی! ہے فرض تم پر تسخیرِ نفس ابتر آپا! کرو مسخر اخلاق سے جہاں کو

چھوٹوں کی وعظ خوانی۔ ہے جہل کی نشانی اے طبع کی روانی! تو لے چلی کہاں کو

بخشے شمیمِ الفت دولہا دلہن کو فرحت جبتک متاعِ زینت نکہت ہے گلستاں کو

اے خواہر! اے برادر فرصت نہیں ہے دم بھر

سمجھو طویل دفتر اس مختصر بیاں کو

اگلی نظم ''سہرا نمبرا'' یہ اپریل ۱۹۱۴ء میں شریف بی بی لاہور میں شائع ہوا۔ یہ ترک رہنما انور پاشا کا سہرا ہے جن پر انہوں نے ایک نظم ''زندہ باد انور پاشا'' ۱۹۱۲ء میں بھی لکھی تھی جس کا ابتداء میں ذکر آ چکا ہے۔ چار شعر یہاں نقل کر رہی ہوں۔

اوجِ طالع سے ہے زیب رخ انور سہرا کیوں نہ ہو موجب سوزِ دل نیر سہرا

آج سلطان کا داماد بنا ہے نوشہ سوئے یلدیز چلا باندھ کے سر پر سہرا

قابل دید ہے گلہائے معانی کی بہار لائی ہوں بزم عروسی میں بنا کر سہرا

ترک کا عقد مواخات سے سہرا لکھنا

ہاں اس ایجاد کا نزہت! ہے ترے سر سہرا

اگلی نظم ''ولادت نمبرا'' منظومہ ۱۹۱۴ء ان کی سہیلی رابعہ سلطان کی بیٹی طاہرہ کی پیدائش کی خبر موصول ہونے پر لکھی گئی ہے۔ پوری نظم میں سہیلی سے خوشی اور دعاؤں کا اظہار یہ نظم بھی رابعہ سلطان سے ان کی گہری محبت کا اظہار کر رہی ہے۔ اس نظم سے چند اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

فیروزیٔ طالع مجھے دیتی ہے نوید آج لو ختم ہوئی کشمکش یاس و امید آج

کس جوش سے ہے جنس مسرت کی خرید آج ہے گرمی بازار جہاں قابل دید آج

اللہ نے دی رابعہ سلطان کو لڑکی وہ رابعہ سلطان۔ جو ہے فرد فرید آج

وہ رابعہ سلطان۔ کہ ہے ارض سے جس کا تا چرخ بریں غلغلۂ خلقِ حمید آج

غنچہ کی نسیم سحری عقل کشا ہے قفل دل نزہت کو یہ مژدہ ہے کلید آج

ماں باپ کے سایہ میں چڑھے طاہرہ پروان
یہ عرض ہے میری بدرِ ربِ وحید آج

اگلی نظم ''ولادت نمبر۲'' بھی تہنیت کا اظہار ہے۔ نظم میں بیٹی کی ولادت پر مبارکباد دی گئی ہے اور مخاطب مولوی بشیر الدین احمد صاحب دہلوی ہیں جو ڈپٹی نذیر احمد کے صاحبزادے تھے۔ نظم میں تاریخ پیدائش ۱۳۳۰ھ نکالی گئی ہے۔ یہ تاریخ مولوی بشیرالدین کی دوسری بیٹی صفیہ بیگم کی ولادت کی ہے۔ مولوی بشیرالدین احمد کی پوتی پروفیسر تاج بیگم فرخی نے مجھے بتایا کہ صفیہ بیگم کی والدہ سید زمانی صفیہ بیگم کی پیدائش کے دن دن بعد انتقال کر گئی تھیں۔ صفیہ بیگم کا انتقال کراچی میں ہوا۔ مختصر نظم سے پہلے دو اشعار اور آخری ایک شعر جس میں تاریخ نکالی گئی ہے نقل کر رہی ہوں۔

خالق نے فرش خاک کو دی عزت بلند   شرمندگی سے کیوں نہ نگوں ہو سر فلک
دختر ہوئی بشیر مبارک سیر کے ہاں   روشن دلی سے جن کی خجل نیر فلک

ہمسر ہیں اختر فلک۔ ان کا اڑاؤ سر
پھر کہیو ہاں یگانہ ہے یہ اختر فلک
۱۳۳۰ھ

اگلی نظم ''تولید سعید نمبر۳'' کے عنوان سے ہے۔ یہ نظم بھی تہنیتی ہے اور ان کی معاصر ادیبہ اور سہیلی سعیدہ بانو کے بیٹے مظہر الحق کی ولادت پر لکھی گئی ہے۔ نظم کے آخری شعر میں تاریخ ولادت ۱۳۳۱ھ نکالی گئی ہے۔ یہ تین اشعار کی رسمی نظم ہے۔ واضح رہے کہ سعیدہ بانو کی شادی کے موقع پر بھی انہوں نے ایک تہنیتی نظم لکھی تھی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ نظم یہاں نقل کر رہی ہوں۔

جو دیا سعیدہ بانو کی نظر کو نورِحق نے
دلِ دوستاں ہوا خوش۔ دلِ دشمناں ہوا شق
ہے دعائے قلبِ نزہت کہ فدائے راہ ملت
کرے مثل مظہر الحق اسے کارساز مطلق
ہے عجیب فالِ نیکو۔ خبرمآلِ نیکو
کہ پسر کا سال نیکو ہے۔ محب مظہرالحق

''ولادت نمبر۴'' ایک تہنیتی قطعہ ہے جوان کے رشتے بھائی ابوبکر خان صاحب رئیس دادوں کی بیٹی کی

ولادت پر لکھا گیا ہے۔ یہ فارسی میں ہے۔اس میں تاریخ پیدائش عیسوی سن میں ۱۹۲۰ء نکالی گئی ہے۔قطعہ درج ذیل ہے۔

گشت پیدا دختر فرخ نشاں
در سرائے حضرت بوبکر خاں
دیدمش چوں غیرت ناہید رُخ
نزھتا! نامید مش ''خورشید رُخ

اس قطع پر بزم طرب کا اختتام ہوا ہے۔ مجموعے کا اگلا حصہ بزمِ عزاء ہے۔

مجموعہ فردوس تخیل کا اگلا باب ''بزم عزاء'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں اٹھارہ نظمیں ہیں۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ تعزیتی نظمیں ہیں تاہم ان میں یک رنگی نہیں اور انداز و بیان میں تنوع ایک مستزاد ہے۔ پہلی نظم ''ہے ہے شہ یوناں'' بظاہر شاہ یونان کا نوحہ ہے جو شریف بی بی لاہور میں ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔لیکن اس میں گہرا طنز ہے اور اس وقت کے حالات کا احاطہ بھی اس طرح کیا گیا ہے کہ شاہ یونان کے بدعزائم منظوم ہوگئے ہیں۔ اس طرح یہ ایک تاریخی نوحہ بن گیا ہے۔ یہ شاہ یونان جارج ،ڈنمارک کا شہزادہ تھا۔ یورپی طاقتوں کی رضامندی سے اسے جارج اول کا لقب دے کر یونان کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا۔اس نے یونان پر ۱۸۶۳ء سے ۱۹۱۳ء تک حکومت کی۔ اسی کے دور حکومت میں یونان نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔مگر یورپی طاقتوں نے اسے روکے رکھا۔۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۸ء تک یونان میں ترکی کے خلاف بغاوت کی وجہ سے بہت زیادہ بے چینی پھیلی رہی اور ۱۸۸۱ء میں تھسلی کے علاوہ اپی رس کا ایک حصہ یونان کو مل گیا تھا۔۱۸۸۲ء میں یونان نے دوبارہ لڑائی کے لیے تیاری شروع کی لیکن دوبارہ یورپی طاقتوں نے اسے روکے رکھا اور یونان کی ناکہ بندی کردی تاکہ جنگ سے باز رہے۔اکتوبر ۱۹۰۸ء میں اہل کریٹ نے اپنی بگڑی ہوئی حالت کے باعث یونان کے ساتھ اتحاد کا فیصلہ کرلیا۔۱۹۱۲ء میں یونان نے بلغاریہ کے ساتھ اتحاد کرلیا اور اسی سال کریٹ کے نمائندے بھی یونان کی پارلیمنٹ میں شامل ہوگئے۔۱۹۱۳ء میں شاہ جارج اول مارا گیا اور یوں ایک پرآشوب دور کا اختتام ہوا۔یہ نظم اسی شاہ جارج پر طنز ہے۔

بے وقت پڑا جام فنا کا تجھے پینا کیوں شق نہ ہو سینا
راس آئی نہ افسوس تجھے فتح جتینا ہے ہے شہ یوناں
ہے ہے نہ ہوا تیری بخت سے روشن یہ نکتۂ مبین
الفاظ ''جتینا'' میں ہے پوشیدہ نہ جینا ہے ہے شہ یوناں
شاہانہ گیا بیت مقدس میں نہ تو آہ موت آ گئی ناگاہ

ہاتھ آیا نہ بغداد۔ نہ مکہ۔ نہ مدینہ ہے ہے شہ یوناں

تازہ تھا غمِ معرکہ ترکی و یوناں وہ یاس۔ وہ حرماں

منجدھار میں تھا جب تری عزت کا سفینا ہے ہے شہ یوناں

یہ جنگ ہے کیسی نظر آتے نہیں انساں یونان ہے ویراں

بھرپور تباہی ہے کہ خالی ہے خزینا ہے ہے شہ یوناں

گوخوں ہوا دل۔ پا ہوئے شل۔ جاں گئی تن سے آدھا نہ ہوا طے

کس قہر کا تھا بامِ ترقی کا یہ زینا ہے ہے شہ یوناں

دوسری نظم ''ہائے شبلی'' ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی اور ۲۳ اپریل ۱۹۱۵ء کو شریف بی بی لاہور میں شائع ہوئی۔ یہ ایک پراثر مرثیہ ہے اور میر انیس کی مرثیہ نگاری سے متاثر محسوس ہوتا ہے۔ شبلی سے ان کو خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ ان کی وفات پر لکھے جانے والے پندرہ بند کے اس مرثیے میں انہوں نے عقیدت ومحبت کے جذبات کو بڑی دلسوزی سے رقم کیا گیا ہے اور وہی انداز و وقار موجود ہے جو مرثیے کے مزاج سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔ نظم سے ابتدائی پانچ بند یہاں نقل کر رہی ہوں۔

دامانِ صبر! توڑ دے سوزن سے رشتہ تو یوں چاک ہو۔ کہ ہو نہ سکے پھر کبھی رفو

اے اشکِ خونفشاں! تو مرا ہی پئے لہو بہہ بہہ کے گر ڈبوئے نہ دریا کی آبرو

ہاں برقِ آہ! اور ذرا زور سے چمک

اٹھ اے فغانِ دل! سوئے عرشِ بریں لپک

ماتم نشیں ہو۔ سوگ کر۔ اے علم! اے ہنر آتش بجسم دفترِ حکمت ہو سر بسر

مل کر ورق کتاب کے باہم ہوں نوحہ گر ہلچل وہ ہو کہ۔ حرف ہوں سب زیراور زبر

الماریوں سے سر کو پٹک دیں مجلدات

شق ہو قلم کا سینہ۔ سیہ پوش ہو دوات

ہاں گر کے خاک پر تڑپ اے رفعتِ خیال اے قوتِ بیان! تو رو رو کے ہونڈھال

خاک اے عروسِ نظم! اب آراستگی پہ ڈال غم اپنی بے سری کا کر۔ اور کھول سر کے بال

قومی شرف کا آج پھٹا جامہ حیات

پائی جنابِ شبلی علامہ نے وفات

وہ سینہ۔ جو خزینہ تھا علم و کمال کا وہ سر۔ جو جلوہ گاہ تھا حسن خیال کا
وہ لب۔ جو نوحہ سنج تھا قومی زوال کا وہ چہرہ آئنہ تھا جو دل کے ملال کا

یعنی وہ ذات جو ہمہ تن دردِ قوم تھی
بختِ زبونِ قوم سے نابود ہوگئی

شعر و سخن کا لطف گیا وا مصیبتا تاریخ کا سہاگ لٹا وا مصیبتا
سیرۃ کا کارِ پاک رکا وا مصیبتا کہتا ہے ندوۃ العلما ''وامصیبتا''

ہے لا کلام شبلی عالی نسب کی موت
تاریخ و فلسفہ کی کلام و ادب کی موت

اگلی نظم ''وائے حالی'' مولانا حالی کی وفات پر لکھی گئی ہے۔ جو شریف بی بی لاہور میں ۱۸ جون ۱۹۱۵ء کو شائع ہوئی۔ اس کا انداز شبلی کے مرثیے سے جدا ہے۔ یہ چار بندوں پر مشتمل ہے ہر بند آٹھ مصرعوں کا ہے۔ ہر بند میں پہلے چھ مصرعے ہم قافیہ اور آخری دو مصرعے ہم قافیہ ہیں۔ اس نظم کی کیفیت بھی مرثیے کی ہے۔ حالی سے ان کا متاثر ہونا بہت فطری تھا کہ حالی اپنے عہد میں عورتوں کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے اور ان کے لیے سماجی انصاف کے وکیل تھے۔ اس مرثیے سے پہلا اور آخری بند نقل کر رہی ہوں۔

سوکھنے پائی نہ تھی چشمِ گہر بار ابھی اور تھی سیرابیِ صد کشت کو طیار ابھی
بھرنے پایا تھا نہ زخمِ دل افگار ابھی گھٹنے پایا تھا نہ رنج و غمِ بسیار ابھی
ہم نہ بھولے تھے غمِ شبلی غمخوار ابھی مٹنے پائے تھے نہ اس سوگ کے آثار ابھی

کردیے زخم ہرے پھر فلک اخضر نے
پھر کیا خوں دل مے۔ سرخی چشم تر نے

زاھدہ! فائدہ فریادِ دل مضطر سے حالی اٹھنے سے رہے زاریٔ چشم تر سے
کوئی اٹھا ہی نہیں خاک کے اس بستر سے اہل بینش بھی ہیں اس امر میں کچھ ششدر سے
التجا دیدۂ خونبار کی ہے داور سے تربتِ حالیٔ مرحوم پہ رحمت برسے

فضلِ رب۔ فیض نبی سے ہو انہیں خلد میں چین
شامل حال ہو مہرِ حسن۔ الطاف حسین

اگلی نظم ’’آہ گوکھلے‘‘ ہے جو شریف بی بی لاہور میں ۱۴ مئی ۱۹۱۵ء کو چھپی۔ گوپال کرشنا گوکھلے (۱۸۶۶۔۱۹۱۵) برصغیر کے نیشنلسٹ لیڈر تھے اور انگریز حکمرانوں پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ وہ ابتدا سے ہی کانگریس کے ممبر رہے اور ۱۹۰۵ء میں انہوں نے ہندوستانی مشینری تیار کرنے کیلئے سرونٹ آف انڈین سوسائٹی بنائی تھی۔ اس عہد کے دانشور اور سیاستدان جن میں قائداعظم محمد علی جناح بھی شامل ہیں اِن سے متاثر تھے۔ مہاتما گاندھی انہیں اپنا سیاسی گرو کہتے تھے۔ اس نظم کے دو حصے ہیں۔ دونوں حصوں سے چار چار اشعار نقل کر رہی ہوں۔

کیوں یاس ہو نہ مجھ کو بہبودِ ہندیاں سے　　سنتی ہوں گوکھلے بھی رخصت ہوئے جہاں سے
کبتک بندھا رہے گا تانتا مصیبتوں کا　　کب تک نجات ہوگی اس سخت امتحاں سے
بڑھتی ہوئی امیدیں۔ اٹھتی ہوئی اُمنگیں　　مٹی میں مل گئیں سب۔ اس مرگِ ناگہاں سے
افسوس ملک بھر میں ہو اک چراغ۔ وہ بھی　　بجھ جائے جلتے جلتے سوزِ غمِ نہاں سے

کرتی ہے صاف اشارہ تصویر گوکھلے کی　　پچھتائے گی جنہوں نے تحقیر گوکھلے کی
سرگوشیاں کریگی اک روز آسماں سے　　ہاں ہاں یہی ادھوری تنویر گوکھلے کی
تعلیم ابتدائی ہو کر رہے گی لازم　　روشن کرے گی آنکھیں تنویر گوکھلے کی
اے معترض! حصارِ باطل ہو لاکھ محکم　　کرلے گی پر صداقت تسخیر گوکھلے کی

اگلی نظم ’’اف غلام حسین‘‘ ستمبر ۱۹۱۷ء میں لکھی گئی۔ غلام حسین مولانا محمد علی کے اسسٹنٹ بے حد ذہین و فعال صحافی تھے اور کامریڈ سے متعلق تھے۔ ان کی ناگہانی وفات حادثے میں ہوئی تھی۔ یہ نظم بھی مرثیے کی طرز پر ہے۔ ابتدائی دو بند نقل کر رہی ہوں۔

جانکاہ مثلِ موت نہیں ہے کوئی الم　　دم پیر ناتواں کا بھی ہوتا ہے مغتنم
پھر بالخصوص کس کا غم؟ اک نوجواں کا غم　　جو غفدانِ عمر میں ہو راہیِ عدم
بہرہ جسے نعائمِ ہستی سے کم ملے
ہاں کچھ ملے تو درد ملے رنج و غم ملے

وہ نوجواں جو علم کا قدر آشنا بھی ہو　　تیغِ قلم کے زور سے کشور کشا بھی ہو
جو ملک پر نثار۔ وطن پر فدا بھی ہو　　پہلو میں جس کے ایک دلِ مبتلا بھی ہو

اگلی نظم 'آہ گوکھلے' ہے جو شریف بی بی لاہور میں ۱۴ مئی ۱۹۱۵ء کو چھپی۔ گوپال کرشنا گوکھلے (۱۹۱۵-۱۸۶۶) برصغیر کے نیشنلسٹ لیڈر تھے اور انگریز حکمرانوں پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ وہ ابتدا سے ہی کانگریس کے ممبر رہے اور ۱۹۰۵ء میں انہوں نے ہندوستانی مشینری تیار کرنے کیلئے سرونٹ آف انڈین سوسائٹی بنائی تھی۔ اس عہد کے دانشور اور سیاستدان جن میں قائداعظم محمد علی جناح بھی شامل ہیں ان سے متاثر تھے۔ مہاتما گاندھی انہیں اپنا سیاسی گرو کہتے تھے۔ اس نظم کے دو حصے ہیں۔ دونوں حصوں سے چار چار اشعار نقل کر رہی ہوں۔

کیوں یاس ہو نہ مجھ کو بہبودِ ہندیاں سے — سنتی ہوں گوکھلے بھی رخصت ہوئے جہاں سے
کبتک بندھا رہے گا تانتا مصیبتوں کا — کب تک نجات ہوگی اس سخت امتحاں سے
بڑھتی ہوئی امیدیں۔ اٹھتی ہوئی اُمنگیں — مٹی میں مل گئیں سب۔ اس مرگ ناگہاں سے
افسوس ملک بھر میں ہو اک چراغ۔ وہ بھی — بجھ جائے جلتے جلتے سوزِ غم نہاں سے

کرتی ہے صاف اشارہ تصویر گوکھلے کی — پچھتائے گی جنہوں نے تحقیر گوکھلے کی
سرگوشیاں کریگی اک روز آسماں سے — ہاں ہاں یہی ادھوری تنویر گوکھلے کی
تعلیم ابتدائی ہو کر رہے گی لازم — روشن کرے گی آنکھیں تنویر گوکھلے کی
اے معترض! حصارِ باطل ہو لاکھ محکم — کرلے گی پر صداقت تسخیر گوکھلے کی

اگلی نظم ''اف غلام حسین'' ستمبر ۱۹۱۷ء میں لکھی گئی۔ غلام حسین مولانا محمد علی کے اسسٹنٹ بے حد ذہین و فعال صحافی تھے اور کامریڈ سے متعلق تھے۔ ان کی ناگہانی وفات حادثے میں ہوئی تھی۔ یہ نظم بھی مرثیے کی طرز پر ہے۔ ابتدائی دو بند نقل کر رہی ہوں۔

جانکاہ مثلِ موت نہیں ہے کوئی الم — دم پیر ناتواں کا بھی ہوتا ہے مغتنم
پھر بالخصوص کس کا غم؟ اک نوجواں کا غم — جو عنفوانِ عمر میں ہو راہی عدم

بہرہ جسے نعائم ہستی سے کم ملے
ہاں کچھ ملے تو درد ملے رنج و غم ملے

وہ نوجواں جو علم کا قدر آشنا بھی ہو — تیغِ قلم کے زور سے کشور کشا بھی ہو
جو ملک پر نثار۔ وطن پر فدا بھی ہو — پہلو میں جس کے ایک دلِ مبتلا بھی ہو

جاں وقفِ رنج قوم کرے جو خوشی کے ساتھ
ہو محوِ خدمتِ عملی۔ خامشی کے ساتھ

مولانا محمد علی نے بھی غلام حسین کی وفات پر نظم کہی تھی۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین
کاش کچھ اور دن جیتے ہوتے

آخری شعر ہے۔

آج جوہر ہیں دل کے قاش فروش
کاش کچھ اور قافیے ہوتے

اگلی نظم ''نور کی آخری شعاع'' نومبر ۱۹۱۷ء میں لکھی گئی۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے اور نظم پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حزنیہ تخلیق بھی مرثیہ ہے جو انہوں نے اپنے شفیق نانا کی وفات پر لکھا۔ نظم کے پہلے حصے میں مدینہ منورہ جا کر اپنا حالِ دل سنانے کی خواہش ہے۔ دوسرے حصے میں اس محبت کا ذکر ہے جو انہیں اپنے شفیق نانا سے حاصل ہوئی تھی اور تیسرے حصے میں ان سے بچھڑنے کا دکھ ہے۔ تینوں حصوں سے دو دو اشعار یہاں نقل کر رہی ہوں۔

یاد رکھ۔ اچھی نہیں آہِ دلِ اندوہ ناک
چیرہ دستی کر نہ مجھ پر اے فلک! تَبّتْ یَداک
جی میں آتا ہے اسی دم چل پڑوں یثرب کی سمت
اور کہوں جا کر اغثنی یا نبی! روحی فداک

عاصیوں میں جب اضافہ میری ہستی کا ہوا
حلقہ زن تھا گرد و پیش اک مجمعِ ارواحِ پاک
ان کے بالوں کی سپیدی جلوۂ صبحِ امید
ان کے نورِ رخ سے اپنا نجمِ قسمت تابناک

اب کہاں افسوس وہ میرے بزرگوں کے بزرگ
مثلِ گنج ان کی چمک پنہاں ہے زیرِ فرشِ خاک

تھی بس کہ جانِ گرامی یادگارِ رفتگاں
خیر اس جاں کی منا تھا دل اندوہناک

اگلی نظم ''واقعہ فاجعہ'' ان کی سہیلی رابعہ خاتون کی وفات پر فارسی میں لکھی گئی جو تہذیب نسواں لاہور میں شائع ہوئی۔ اس میں تاریخ وفات بھی نکالی گئی ہے۔ اس نظم پر سید ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں کا ایک نوٹ بھی شائع ہوا تھا۔

''محترمہ ز خ ش صاحبہ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں دست گاہ کامل رکھتی ہیں اور نہایت اچھا شعر کہتی ہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا قطعہ تاریخ ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہے۔ ایسی اچھی فارسی لکھنے والے مردوں میں بھی معدودے چند ہوں گے۔''......۱۹

رابعہ خاتون سے ان کو بے حد محبت تھی اور مسلسل خط و کتابت بھی ان کے نام کئی نظمیں مجموعے شامل ہیں جن کا ذکر آ چکا ہے۔ اس نظم سے بھی محبت کے جذبات ظاہر ہیں۔ وہ شعر جس میں تاریخ وفات نکالی گئی ہے درج ذیل ہے۔

تا چند کنی نالہ۔ کنوں نزہتِ مضطر
از روئے بکا سال بگو ''رابعہ خاتوں''

اگلی نظم ''شاعر کی موت'' ستمبر ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی۔ یہ طویل تعزیتی نظم ہے جو اکبر الہٰ آبادی کی وفات پر لکھی گئی ہے۔ اکبرالہ آبادی سے ان کو خاص عقیدت تھی۔ خود اکبر الہ آبادی بھی زخ ش کی شاعری کے مدح تھے اور ان کی غائبانہ تعریف کرتے تھے جو ان تک خواجہ حسن نظامی اور لیلیٰ خواجہ بانو کے ذریعے پہنچتی تھی۔ انیسہ خاتون لکھتی ہیں۔

''ایک مرتبہ خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے مکان پر زاہدہ خاتون کا کلام دیکھ کر آپ نے فرمایا تھا کہ اگر یہ اشعار کسی خاتون نے کہے ہیں تو مردوں کو دعوائے شاعری سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیئے۔''

اکبر الہ آبادی کی وفات کی خبر سن کر انہوں نے لیلیٰ خواجہ بانو کو لکھا۔

''حضرت کے حادثہ وفات پر دل سے نالہ موزوں برآمد ہوا جو جناب خواجہ کی بارگاہ میں نذر محقر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کسی اخبار کو نہیں بھیجا گیا۔ اگر وہ پسند فرمائیں تو سیرۃ اکبر کے کسی گوشہ میں جگہ دیں۔ اس ناچیز نظم کی زبان ثقیل یعنی خراب ہے۔ مگر جو مضامین مندرج ہیں وہاں وہ روزمرہ کے ذریعے ادا بھی نہ ہو سکتے تھے۔ اگر چہ اپنے مقابلہ میں اقبال کا نام لینا سخت ترین سوئے ادب ہے مگر صرف تمثیلاً عرض کرتی ہوں کہ وہ بھی فلسفیانہ مضامین کو زیادہ سہل الفاظ میں بیان نہیں فرماتے۔''......۲۰

اس طویل پراثر حزنیہ نظم سے چند اشعار یہاں نقل کررہی ہوں۔

آمدورفت سر کوچہ وبازار ہے آج — کوئی جلسہ ہے؟ کچہری ہے؟ کہ دربار ہے آج
خلق کا قلزمِ مواج بڑھا آتا ہے — لوٹ؟ آتشزدگی؟ فتنہ پیکار ہے آج
چار اشخاص کے کاندھوں پہ ہے اک گہوارہ — مرگیا کوئی؟ کہ زخمی ہے؟ کہ بیمار ہے آج

رسم تدفیں بھی متانت سے ادا کرتے ہیں
نہ رلاتے ہیں نہ روتے ہیں۔ یہ کیا کرتے ہیں

آخر اک سردِ بزرگ اگلے زمانے والے — بولے اللہ کو سونپا تجھے جانے والے
آئے ہیں۔ ہم تجھے مرقد میں سلانے کے لئے — نغمہ شعر سے روحوں کو جگانے والے
آئے ہیں مفلس و رنجورو غلام و مزدور — ترے محبوب ترے دل کے لبھانے والے
شور ہے غمکدہ دہر سے اٹھا اکبر — عالم با عمل و شاعر یکتا اکبر
جوش سے بڑھ کے کہا عاشق رب نے لبیک — ملک الموت نے جس وقت پکارا ''اکبر''
شعر میں اس کی روش منبع تقلید رہی — اُدھر آیا دلِ شاعر۔ جدھر آیا اکبر

پائیں گے جب نہ تری بوکسی استاد میں ہم
اشکِ گل رنگ بہائیں گے تری یاد میں ہم

اگلی نظم ''تعزیت تہنیت'' فارسی میں ہے جس میں ان کی عزیز سہیلی رابعہ سلطان کے شوہر کی وفات پر قطعہ تاریخ بھی شامل ہے، جو ۱۳۲۹ھ ہے۔ اس مختصر نظم سے پانچ اشعار یہاں نقل کررہی ہوں۔

پاک اندیش رابعہ سلطاں فخرِ نسوان علم پرور۔ آہ
کرد جاداغ بیوگیش بدل کوہ اوفتا و برسر۔ آہ
رابعہ آں عروس تازہ او ہست رنجوروزارو مضطر۔ آہ
سال غم نسبت از خرو نزہت آں شریکِ ملال خواہر۔ آہ

گشت القاذ ہاتف غیبی
قلق انتقال شوہر۔ آہ

اس سے اگلی نظم ''حادثہ ہائلہ'' شریف بی بی لاہور میں ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ بھی فارسی میں ہے اور ان کے اپنے سگے بھائی احمد اللہ خان کی وفات کی تاریخ ۱۳۳۴ھ منظوم کی گئی ہے۔ اس مختصر نظم سے چار اشعار نقل کر رہی ہوں۔

عزیزم که بود احمد اللہ نامش زخشم' رسول و خدادور بادا

ندیدم بخلق و نکوی نظیرش بنزد خدا وند ماجور بادا

زمهرو وفا شاد کردی دلِ ما الٰہی روانِ تو مسرور بادا

بہنگام فکر سنِ ارتحالش

خرد گفت در گوش ''مغفور بادا''

اگلی نظم ''رحلت عزیز بانو'' قطعہ تاریخ وفات پر ختم ہوتی ہے۔ نظم سے پتہ چلتا ہے کہ عزیز بانو نوجوانی میں انتقال کر گئی تھیں۔ اس نظم میں ان کی والدہ کو بیٹی کا پرسہ بھی دیا گیا ہے۔ قطعہ تاریخ میں رحلت کی تاریخ ۱۹۱۲ء نکالی گئی ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

ہُوا نہ شادی کا اسکی ساماں رہے دلوں کے دلوں میں ارماں

جہاں تھے کل لوگ تہنیت خواں۔ وہاں پہ اف۔ شورِ تعزیت ہو

جسے ہو درکار سالِ رحلت۔ جو چاہے حسنِ مآل رحلت

وہ صبر کی بے دلی سے کہدے ''عزیز بانو کی مغفرت ہو''

اگلی نظم ''یونیورسٹی'' ہے۔ اس کا پس منظر خود زخ ش کے مضمون ''مسلم یونیورسٹی ضرور قائم ہونی چاہئے۔'' میں تحریر ہے۔ یہ طویل مضمون خاتون علی گڑھ کے شمارے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ لکھتی ہیں۔

''اگر سرکار حشمت مدار کا قصد مختص المقام اور اس پر بھی محدود الاثر یونیورسٹی دینے کا تھا تو ہمیں اس خوشگوار خواب سے چونکا کیوں نہ دیا کہ ہمیں ایک کامل الاختیار اور حق الحاق رکھنے والا دارالعلوم نہ ملے گا''

یہی گلہ ان کی نظم ''یونیورسٹی'' میں فارسی میں منظوم ہے۔ تین اشعار کی اس نظم میں اس واقعے کی تاریخ بھی موجود ہے۔ جو ۱۳۳۰ھ ہے۔ نظم درج ذیل ہے۔

جو نیورسٹی را کرد محدود الاثر خسرو

دل اسلامیاں شد پرورش گاہ شکایتہا

زماں دشمن۔ زمیں پر خاش جو۔ گردوں عدو پرور
چہ سازو باجہاں۔ یک ملت و صدگو نہ آفتہا
بصد حسرت چوگفتم خونِ حسرتہائے مسلم شد
خردگفتہ بگوشم سال ہم گو''خونِ حسرتہا''

اگلا قطعہ ''تاریخ وفات حسرت آیات'' کے عنوان سے ہے۔ یہ قطعہ تاریخ وفات مولانا حبیب الرحمٰن خان حسرتؔ شروانی کے صاحبزادے محمد محبوب الرحمٰن خان کی وفات پر کہا گیا ہے اور تاریخ وفات ۱۳۳۵ھ نکالی گئی ہے۔ قطعہ درج ذیل ہے۔

وائے حسرت۔ کہ ابن حسرت نے قبل از وقت لی عدم کی راہ
بطفیل محمد ﷺ محبوب بخشے رحمٰن اس کے جرم و گناہ
فکرِ سال وفات میں نکلی
سوزِ داغ دل و جگر سے آہ

اگلی نظم ''غم وقار الملک'' سات اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ تعزیتی نظم نواب وقار الملک کی وفات پر لکھی گئی ہے۔ نواب وقار الملک سرسید احمد خان کے قریبی ساتھیوں اور علیگڑھی یونیورسٹی کے بانیوں میں سے تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے بے حد متحرک حامی اور زبردست مقرر تھے۔ اس نظم میں ان سے عقیدت کا اظہار ہے اور قطعہ تاریخ بھی شامل ہے جس میں تاریخ وفات ۱۳۳۵ھ منظو ہے۔ اس نظم سے پانچ اشعار نقل کر رہی ہوں۔

جن سے تھی محفل اسلام کی زیب و رونق جا بسے کوئے خموشاں میں سب اک اک کرکے
رہ گئے تھے فقط اک حضرت مشتاق حسین حسرت اے قوم خریں وہ بھی ہوجائے جاں بحق
اے ہمارے گہر گمشدہ! اے کلمہ حق پالیا تھا تجھے جس نے۔ اسے کھوبیٹھے ہم
مرے ہادی! میرے رب! میرے قدیر مطلق خلد پہنچے برہِ راست ہمارا رہبر
اس جگر پاش غم و حزن و قلق کی تاریخ
کی رقم نزہتِ ناشاد نے غم۔ حزن۔ قلق

اس سے اگلہ قطعہ تاریخ وفات ''ماتم شیخ الہند'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مولانا محمود الحسن کی وفات پر کہا گیا

ہے۔ اس میں تاریخ وفات ۱۳۳۹ھ نظم کی گئی ہے۔ ان سے عقیدت کے اظہار میں ایک نظم شیخ الاسلام ہند مجموعے کی ابتداء میں شامل ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے۔

جس کا منہ دیکھو۔ وہی ہے اشکِ خوں برسا رہا
جس جگہ جاؤ۔ وہیں ہے نالۂ نامنتہا
حیرتِ دانش نے پوچھا'' کس کا غم ہے قوم کو''
''ہائے محمود الحسن کا غم ہے'' ہاتف نے کہا

اگلی نظم ''کوکبِ مشرق'' تین اشعار پر مشتمل ہے اس میں تاریخ وفات شبلی شامل ہے۔ یہ تاریخ ۱۹۱۴ء ہے۔ شبلی کی وفات پر انہوں نے ایک مئوثر مرثیہ لکھا تھا۔ قطعہ تاریخ میں بھی عقیدت کا اظہار ہے۔ وکبِ مشرق یہاں نقل کررہی ہوں۔

اک آفتاب ہوا آج عازمِ مغرب
بڑھا کے مرتبہ و شان و منصبِ مشرق
بھری تھی جس میں شراب مصیبت وکلفت
چھلک پڑا ہے وہ جامِ ملبب مشرق
وفات حضرت شبلی کی زاھدو! تاریخ
کہو۔''غروب ہوا آہ۔ کوکب مشرق''

اگلا قطعہ ''داغ طرابلس'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں طرابلس پر قبضے کی تاریخ ۱۳۳۰ھ نظم ہے۔

کیا پوچھتے ہو آہ۔ سراغ طرابلس
گلچیں ہوا ہے قابضِ باغ طرابلس
نزھت! جو پوچھے حادثہ جانگسل کا سال
کہہ دو بکا کے ساتھ کہ''داغ طرابلس''

اگلی نظم ''جنگ فرنگ'' کے عنوان سے ہے اس میں پہلی جنگ عظیم کی تاریخ ۱۹۱۴ء منظوم کی گئی ہے۔ جنگ فرنگ کے عنوان سے ایک اور نظم مجموعے کی ابتداء میں شامل ہے جو پہلی جنگ عظیم پر ہے۔ اس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ اس نظم سے قطعہ تاریخ یہاں نقل کررہی ہوں۔

خونِ ہمجنساں ہوا کیونکر بحل؟ اہلِ فرنگ

تم ہی بتلاؤ۔ یہ ہے کیسا ستم۔ کیسا غضب؟

پہلے نزھت! التجائے رحم مالک سے کرو

پھر کہو تاریخِ حربِ غرب۔مالک کا غضب

اگلی دو نظمیں ''تضمین اشعار غالب'' نمبر ۱ اور ۲ ہے۔ یہ دونوں نظمیں مرزا غالب کی ان مشہور غزلوں کی تضمین ہیں جو انہوں نے اپنے متنبہ عارف کی وفات پر لکھی تھیں۔زخ ش کی یہ دونوں نظمیں بے حد پر درد ہیں اور ان میں یہ وضاحت ہے کہ یہ ۱۹۱۶ء میں بھائی کی وفات پر کہی گئی تھیں۔ انہیں اپنے بھائی احمد اللہ خان کی ناگہانی وفات کا ایسا دکھ تھا کہ وہ ان کے بعد دنیا میں رہنا نہیں چاہتی تھیں اور متعدد نظمیں ان کے فراق میں لکھیں۔ یہ دونوں تضمینی نظمیں ان کے بھائی کا مرثیہ ہیں۔ پہلی تضمین سے دو بند نقل کر رہی ہوں۔

دردِ الفت یونہی تھا رگ رگ میں ساری۔ ہائے ہائے

کیوں لگایا پھر وفا کا زخم کاری۔ ہائے ہائے

تجھ سا بے فکر۔ اور کسی کی غمگساری۔ ہائے ہائے

درد سے میرے ہو تجھ کو بے قراری۔ ہائے ہائے

جیتے جی ہم تم رہے گر یک دل ویک جا۔ تو کیا

تادمِ آخر۔ بھرا گر دم محبت کا تو کیا

عمر بھر پیاں رہا منتِ کش ایفا تو کیا

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

دوسری تضمین کے بھی دو بند پیش کر رہی ہوں۔

دنیا میں ہوں زحمت کشِ دنیا کوئی دن اور

ہے طوعاً وکرہاً مجھے جینا کوئی دن اور

تھا صبر و سکوں تم کو بھی زیبا کوئی دن اور

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور

ٹکڑے نہ ہوں کیونکر مری جاں! غم سے جگر کے

یہ دن تو کسی طرح نہ تھے عزمِ سفر کے

ہوتا ہے نہاں ماہ بھی کچھ روز ابھر کے
تم ماہِ شب چار دھم تھے مرے گھر کے

مجموعے کا اختتامی باب ''بکھرے ہوئے موتی'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں قطعات' رباعیات اورمنفرد اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ابتداء انیسہ خاتون کے نام ایک قطعہ اور دو رباعیات سے ہوئی ہے۔ یہ منظوم پیغامات ہیں جو مختلف تاریخوں میں لکھے گئے ہیں۔ پہلے قطعہ پر بریکٹ میں تحریر ہے ۱۲۸کتوبر ۱۹۱۱ء کا ایک واقعہ۔قطعہ حسب ذیل ہے۔

مری اچھی بہن! خالق کی قدرت اس کو کہتے ہیں
کہو منکر سے ''رؤیا کی صداقت اس کو کہتے ہیں
جو نادانی سے کہتے ہیں نہیں ''تاثیرالفت میں''
انیسہ! ان سے کہہ دو ''جذب الفت اسکو کہتے ہیں''
کھلا رویا میں حال رنج ہم دونوں پہ اک ہی دن
محبت ایسی ہوتی ہے۔ محبت اس کو کہتے ہیں

دوسری اور تیسری رباعی بنام موصوفہ عیدالفطر ۱۳۳۳ھ اور علالت ۱۹۱۷ء کے موقع پر لکھی گئیں ہیں۔

ہو عیاں روشنی مہر میں کیا عید کا چاند — تم جو چھپ جاؤ تو ہو جلوہ نما عید کا چاند
پسِ مدت رخِ تاباں نظر آیا ہے مجھے — ہوگئیں تم تو پیاری! بخدا عید کا چاند

جاں بلب ضعف سے ہوں لب کو ہلاؤں کیونکر — دسترس اس پہ نہیں۔ خامہ اٹھاؤں کیونکر
حال پوچھو نہ۔ مرا خود ہی بتاؤ مجھ کو — ایسی حالت میں تمہیں حال بتاؤں کیونکر

اگلی دو رباعیات رابعہ خاتون کے نام ہے جو ان کی تصویر موصول ہونے پر لکھی گئیں ہیں۔ یہ رباعیات حسب ذیل ہے۔

اے پردہ نشیں! تری جو پائی تصویر — جھٹ خانۂ دل میں جا چھپائی تصویر
آغوش خیال میں نہ آئے گا کبھی — جس جوش سے سینے سے لگائی تصویر

ہے صنعت انسان کی خاموش گواہ تفضیل خموشی سے ہے گویا آگاہ
کہہ دیتی ہے آنکھوں ہی میں سارا مطلب کیا بات ہے تصویر کی۔ اللہ اللہ

اس کے بعد کی رباعیات اور منفرد اشعار میں مضامین و خیالات کا وہی سلسلہ ہے جو اُن کی نظموں میں ہے۔ یعنی قومی، سماجی اور مذہبی نوعیت کے مضامین اس وقت کے حالات خصوصاً اور ترکی اور برصغیر کے مسلمانوں کی مشکلات، سیاسی و سماجی رویے اور ذاتی تعلقات میں محبت و شکوے نقادان فن سے مخاطبت وغیرہ منظوم کیے گئے ہیں۔ یہاں نموںتا تین رباعیات نقل کر رہی ہوں۔

مشغول گناہ ہے جو عہدِ فانی سمجھا ہے حیات کو وہ جاویدانی
جب بحر فنا میں کشتی عمر پھنسی یہ فعل کریں گے تجھ کو پانی پانی

"بھولوفیشن کو" یہ کب میں نے کہا؟ اے صاحب حق رہے یاد۔ یہ مطلب تھا مرا اے صاحب
گو نمازیں ہوں قضا۔ چست ہو پتلون ضرور یہ بھی ہے کوئی اداؤں میں ادا؟ اے صاحب

پوچھتے ہیں جو مرا حال سخن کے نقاد
صاف گو ہوں۔ سخن آرائی سے ہے مجھ کو عناد
نہ میں نزھت سے ہوں آگاہ نہ میں زاہدہ ہوں
خود فراموش ہوں۔ اتنا ہے فقط مجھ کو یاد

اس آخری رباعی پر ان کے مجموعہ فردوس تخیل کا اختتام ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حیات زرخ ش۔ صفحہ نمبر ۳۵۔ انیسہ خاتون شروانیہ۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔
۲۔ حیات زرخ ش۔ صفحہ نمبر ۱۸۴۔ انیسہ خاتون شروانیہ۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔
۳۔ حیات زرخ ش۔ صفحہ نمبر ۵۵۔ انیسہ خاتون شروانیہ۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۴۔ (نکتۂ راز شان الحق حقی' صفحہ۲۹۲)

۵۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۱۶۵۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۶۔ (زخ ش کا روزنامچہ۔غیر مطبوعہ۔نقل محفوظ)

۷۔ (نکتۂ راز شان الحق حقی' صفحہ۲۹۴)

۸۔ روزنامچہ زخ ش ، بتاریخ ۱۷ دسمبر ۱۹۲۰ء، غیر مطبوعہ کاپی محفوظ

۹۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۱۸۱۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۱۰۔ (نکتۂ راز شان الحق حقی' صفحہ۲۸۵)

۱۱۔ کلیات اقبال۔صفحہ نمبر ۵۴۔مطبوعہ فضلی سنز

۱۲۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۷۷۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۱۳۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۱۸۰۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۱۴۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا' فیروز سنز صفحہ ۱۲۰)

۱۵۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۱۲۹۔۱۲۸۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۱۶۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط ۔بتاریخ ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء ۔غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے

۱۷۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۱۱۷۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۱۸۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۲۱۶۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۱۹۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر ۱۲۰۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔

۲۰۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط ۔بتاریخ ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء ۔غیر مطبوعہ' کاپی محفوظ ہے۔

باب ہشتم

زخ ش کی غزلیں (غیر مطبوعہ)

زخ ش نے نظموں کے علاوہ غزلیں بھی لکھیں اور ایک دیوان مرتب کیا تھا ۔ انیسہ خاتون شروانیہ لکھتی ہیں ۔

''دیوان نزہت (نزہت الخیال) ان کی اخلاقی غزلیات کے مجموعے کا نام تھا جو فردوس تخیل سے جداگانہ چیز تھی اور اس میں ''الف'' سے لے کر ''ی'' تک ردیف وار تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اخلاقی غزلیں موجود تھیں۔ اس کی بابت مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ یہ ادب اردو میں بالکل نرالی چیز ہوگی۔'' ۱

انیسہ خاتون کے مطابق سوائے فردوس تخیل کے ان کی اور کسی تخلیق کا قطعی پتہ نشان نہیں کہ کہاں گئیں۔ اس تحقیق کے دوران ان کے خاندان سے رابطہ کرنے پر ۱۶ غزلیں دستیاب ہوئیں ہیں۔ دیوان کے لیے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ والد نے غزلیں جلوادی تھیں ۔ ایک اور روایت ہے کہ یہ دیوان شائع کرنے کو دارالاشاعت لاہور بھیجا گیا تھا اور وہاں سے لاپتہ ہوگیا۔ان کی سگی بھانجی مدیحہ خاتون شروانیہ نے مجھے جو کچھ بتایا وہ زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے رواج کے مطابق مرنے والے کی چیزوں کو ایک کمرے میں بند رکھ کر مقفل کردیا جاتا تھا۔ چنانچہ زخ ش کا کتب خانہ اور تمام دیگر تصنیفات دیمک کی خوراک بن گئیں۔ انیسہ خاتون نے بھی ایک منتخب کتب خانے اور کتاب ''پری رویانِ ناکام'' کا نامکمل ترجمہ ''نزھت الخیال (دیوان)'' اور نثری مضامین کا مجموعہ منتخب کلام کی چند نوٹ بکس چھوڑنے کا ذکر کیا ہے اور لکھا کہ ان میں سے تمام چیزیں سوائے فردوس تخیل کے نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں گئیں۔ اس طرح یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تحریریں امتداد زمانہ کا شکار ہوئیں۔ زخ ش کے خاندان سے رابطہ کرنے پر ۱۶ غزلیں مدیحہ خاتون شروانیہ نے جو ان کی خالہ اور ساس انیسہ خاتون شروانیہ سے ملی تھیں مجھے مہیا کی ہیں ۔ (ضمیمہ نمبر ۲) یہ غزلیں قومی نوعیت کی ہیں اور مضامین وہی ہیں جو نظموں کے ہیں ۔ زخ ش کی غزلوں کے لیے شان الحق حقی لکھتے ہیں ۔

''ان کو زیادہ تر نظم گوئی سے شغف تھا لیکن غزل کا بھی ضرور اچھا ذوق رکھتی تھیں۔ اقبال' ظفر علی خان' اکبر' شبلی کے ساتھ ہی داغ و امیر کی بھی مداح تھیں۔''

آ گے لکھتے ہیں ۔

''بات یہ ہے کہ ان کے قدامت پرست ماحول میں غزل کا تو ذکر ہی کیا شعر گوئی ہی کی صحیح نہ تھی۔ان کا کلام جو رومانیت سے مبرا نظر آتا ہے' اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ رومان کا نام لینا بھی مستقل زبان بندی کو دعوت دینا

تھا۔ انہوں نے قومی و سیاسی موضوعات کی آڑ لے کر اپنے آپ کو کامل ادبی موت سے بچالیا۔ جو کچھ لکھا طبیعت کو روک روک کر لکھا۔ یہ اس ناتمامی کا ایک اور پہلو ہے جو ان کی ذات سے مختص ہے۔ عین عنفوان شباب میں ان کا کلام خاصا یاسیت زدہ نظر آتا ہے۔ طرز ادا کچھ تو ان کی علمیت کے باعث اور کچھ اُس بندش کی وجہ سے جو ان کی سانسوں پر لگی ہوئی تھی، مغلق اور مولویانہ ہے، لیکن درد آشنا نگاہیں اب بھی اس برودت کی تہ میں دل کے گداز اور روح کی تشنگی کو تاڑ سکتی ہیں، اور جودت و ذکاوت کے ساتھ غمگینی و برہمی تو سطح پر بھی نظر آتی ہے۔''......۲

شان الحق حقی نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ دیوان غزلیات نزہت الخیال کی گمشدگی کے بعد ان کے رنگ تغزل کا اندازہ نظموں میں اور منظوم خطوط میں شامل جستہ جستہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ شان الحق حقی کو ان کی غزلیں دستیاب نہیں ہوئی تھیں جبھی انہوں نے نظموں اور منظوم خطوط سے وہ اشعار نقل کیے ہیں جن میں غزل کا رنگ موجود ہے۔ تاہم ان کی وہ اٹھارہ غزلیں جو دستیاب ہیں ان میں رنگِ تغزل بھی ہے اور وہ خطیبانہ انداز بھی جو نظموں میں حاوی ہے۔

زخ ش کی شاعری کا دور وہ تھا جب برصغیر سیاسی کروٹ بدل رہا تھا جس سے وہاں کا سماجی اور ادبی منظرنامہ بھی تبدیل ہورہا تھا۔ ادب میں جدیدیت کی لہر آئی تھی اور شاعری روایتی غزل سے کترا کر نظموں کی جانب رواں تھی۔ مولانا آزاد اور حالی روایتی شاعری سے ہٹ کر نئی راہ نکالنے پر زور دے چکے تھے۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر باقاعدہ تنقید کی راہ سجھائی تھی۔ غزل میں بھی نئے مضامین داخل ہورہے تھے اور روایتی غزل جو داخلی کیفیات تک محدود تھی اب اس میں رومانی موضوعات کے علاوہ سماجی اور سیاسی جذبات کو بھی موضوع بنایا گیا تھا۔ زخ ش اگرچہ غالب، ذوق اور داغ سے متاثر تھیں۔ اپنی خاندانی اور سماجی بندشوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے غزل کے میدان میں خصوصاً بہت محتاط قدم رہیں۔ اگر ان کی غزلوں کا نظموں سے موازنہ کیا جائے تو بعض نظموں کے اشعار زیادہ پرتغزل نظر آتے ہیں کہ ان اشعار پر کسی ایسے عنوان کا پردہ ڈالا گیا ہے جو اجتماعی، سماجی مسئلہ ہو۔ یہاں میں وہ اشعار نقل کررہی ہوں۔ جنہیں نظموں سے الگ کردیا جائے تو غزل کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔

شکوے گلے کئے نہ فغاں کی نہ آہ کی ۔۔۔ کیوں کر اڑی خبر مرے حالِ تباہ کی

میں احتیاط سوز ہوں وہ آتشیں مزاج ۔۔۔ اہلِ حرم سے شکل نہیں کچھ نباہ کی

اے شیخ ہے رسیدہ درگاہ حق وہی ۔۔۔ جس نے ہمارے ٹوٹے ہوئے دل میں راہ کی

ہائے کیا کیا آرزوئیں ہائے کیا کیا حوصلے ۔۔۔ درد بن کر اٹھے اور اشک بن بن کر بہے

ہو جو ممنونِ بشر اُس ہستی فانی پہ خاک ۔۔۔ تشنہ لب مرنا گوارا غیر کے پانی پہ خاک

ان اشعار میں ان کی مشکل پسندی اور ردیف کی سنگلاخی قابل ملاحظہ ہے۔

تکلیف ہی رہی تری چاہت میں عمر بھر　　بے چین ہی رہا یہ دل مبتلا سدا
دل میرا داغ داغ تھا دل تیرا باغ باغ　　تو نالہائے غم پہ ہنسا ہی کیا سدا

موت پر زور نہ جینے کی توانائی ہے　　تاب شیون ہے نہ یارائے شکیبائی ہے
باعث وحشت دل گوشہ تنہائی ہے　　شرکتِ بزم میں دیوانے کی رسوائی ہے
دن رات یاں وفا ہے جس ہے نہ واں اثر ہے　　فولاد ہے کہ دل ہے پتھر ہے یا دگر ہے
دنیا کو چھان مارا ہر شے کو دیکھ ڈالا　　تو اے وفا کہاں ہے اے مہر تو کدھر ہے
اے رب نور وظلمت خلاق یسر و عسرت
میری بھی شام فرقت حسرت کش سحر ہے!

ہم ہیں جینے سے اجل ہم سے خفا تیرے بعد　　ہم سے دل' دل سے ہے آرام جدا تیرے بعد
حد کو پہنچی تھی محبت مری تیرے آگے　　ہوگئی حد سے یہ کمبخت سوا تیرے بعد

یہ تو وہ پرتغزل اشعار تھے جو نظموں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اب میں ان غزلوں کی طرف آتی ہوں جو دستیاب ہیں۔ یہ غزلیں کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ ان ۱۶ غزلوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے انہیں ایسے طاقتور اظہار کی صلاحیت عطا کی تھی جو سنگلاخ زمین میں بھی راستہ بناتی رہی۔ تمام تر پابندیوں کے باوجود ان کی طبع رواں کے سامنے بند نہیں باندھا جاسکا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے نام کو چھپایا اور بہت سی تحریروں کو عام بھی نہیں ہونے دیا۔ لیکن ہر کیفیت' ہر جذبے کا شاعرانہ اظہار اسی طرح کیا جس طرح ان کے ہم عصر مرد شعراء لکھ رہے تھے۔ پردے میں رہ کر ایک طرح سے وہ ان پابندیوں سے بھی ماوراء ہوگئیں تھیں جو عام حالات میں اگر انہیں بحیثیت خاتون شاعرہ پہچانے جانے کا خوف ہوتا تو مصنوعی پن کی صورت میں ظاہر ہوتیں۔ ان کی غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے تین موضوعات سامنے آتے ہیں۔ یہ موضوعات تقریباً ہر غزل میں موجود ہیں۔ پہلا موضوع جو غزل کی مروجہ روایت کا حصہ ہے داخلی جذبات و کیفیات کا اظہار دوسرے دو موضوعات مذہب اور سماجی و سیاسی حالات ہیں۔

داخلی کیفیات جن میں ذاتی جذبات کا داخلی اظہار ملتا ہے۔ درج ذیل ہیں۔ یہ غزل ان کی وفات کے بعد اگست ۱۹۲۴ء میں رسالہ شباب اردو میں چھپی ہے۔ غزل کے نیچے زخ ش مرحومہ لکھا ہے۔ مرسلہ: م۔ب شروانیہ لکھا ہے

جو غالباً مونسہ بیگم شروانیہ کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔

سحر کا ہے منظر سہانا سہانا کسی دیدہ ور کو بلانا بلانا

طبیبوں سے نفرت ہے بیمارِ غم کو انہیں سامنے سے ہٹانا ہٹانا

نچانا۔ نچانا۔ مری بیخودی پر مجھے جس نے دیوانہ جانا نچانا

کہا تھا نہ کہہ راز دل سب سے ز۔خ

مگر تم نے کہنا نہ مانا نہ مانا

مقصد براریوں سے نہ ہوتا کبھی نصیب جو تجھ سے سکھ ملا دل بے مدعا سدا

ٹوٹا خدا ہی جانے طلسم امید کب یہ ٹوٹتا ہے دل کی طرح بے صدا۔ سدا

باقی ہے ایک تیری نوا سب تو مٹ گئے تو بھی نہیں رہے گی۔ بقائے فنا سدا

حسرتوں نے گھر کیا دیمک زدہ خانہ دل کی خرابی آ گئی

جب کسی کے زردی رخ کا سنا چہرے پر رنگت گلابی آ گئی

شعر سے غائب ہوئے سارے ہنر اک فقط حاضر جوابی آ گئی

پرسوں تھا اپنی وفا کا امتحاں کل نوید کامیابی آ گئی

تھا نہ علم فتنہ ہائے ہستی فانی مجھے ہائے یاں آ کر ہوئی کیسی پشیمانی مجھے

قحط میں جس طرح مرتے ہیں گرانی سے بشر کر رہی ہے قتل جنس غم کی ارزانی مجھے

آخری تسلیم اے ہمسایۂ گانِ ذی شعور لے چلی دشتِ خطر میں میری نادانی مجھے

ہے خلافِ رسم دنیا پاکی دامن کی خیر وہ بڑھا دستِ ہوس یوسف کے پیراہن کی خیر

میرا بارِ جرم اٹھالیتا ہے اپنے دوش پر دوستوں میں مانگتی ہوں رات دن دشمن کی خیر

دستِ گلچیں کو جو دیکھا سوئے گل بڑھتے ہوئے ہاتھ اٹھائے برگ نے سوئے فلک گلشن کی خیر

نزہت آوارہ نہ پھر دشت میں صرصر کی طرح دشت بہہ جائے نہ اشکوں سے کہیں گھر کی طرح
گوش غافل میں پہنچ۔ دل سے نکل نالہ غم سونے والے کو جگا شورش محشر کی طرح

کیا عجب گر ہو کسی کامل کی فرزانے کی لاش ایسی ناقدری سے اٹھواؤ نہ بیگانے کی لاش
پردہ محمل اٹھا۔ او لیلیٰ نظارہ دوست بن میں بے گورو کفن ہے ایک دیوانے کی لاش
دل کو تڑپانے لگی یثرب میں مرنے کی ہوس جب نظر آئی قریب شمع پروانے کی لاش
خاک میں ملنا ہی ہے رہنے دو دم بھر اور یاں حاملو! کچھ پر لگا کر اُڑ نہیں جانے کی لاش
دیکھو مر کر ہو نہ رسوا وضع کا پابند رند دیکھو مسجد میں نہ جانے پائے میخانے کی لاش
نزہت دیندار کی ہمکو وصیت یاد ہے
اس مسافر کی وطن ہر گز نہیں جانے کی لاش

بادِ عشرت چمن دہر میں ہر صبح چلی نہ کھلی پر نہ کھلی اس دلِ پژماں کی کلی
دشمنوں کا تو چلا زور بھی اور جادو بھی آرے چلتے ہیں جگر پر کہ میری کچھ نہ چلی
شیخ کترائے کہ جھنجھٹ نہ ہو ناحق سر رہ سانس لی میں نے بھی کھل کر کہ بلا سر سے ٹلی
باغ دل میں شجر غم تو بہت جلد بڑھا سخت حیرت ہے کہ پھر شاخ اجل کیوں نہ پھلی
گئے وہ دن کہ نظر آتی تھی نزہت ہرجا
اب تو اک گوشہ تنہائی بھلا اور وہ بھلی

امیدوں سے ہے لطفِ خطراتِ الفت سفینوں سے ہوتی ہے ساحل کی رونق
جو کہنا ہے کہہ لو جو سننا ہے سن لو کہ مٹنے کو ہے چشمِ بسمل کی رونق
میرے رخ کی رونق ہے منزل رسی سے پہنچنے سے ہے میری منزل کی رونق

وہ مجنوں کی پاکوبی و شعر خوانی   وہ نغمات ساز سلاسل کی رونق
وہ فرقت کی کلفت وہ قربت کی راحت   وہ ''اف اف'' کی زینت وہ کھل کھل کی رونق
ابھی دیکھ لو پھر نہ پاؤ گے ڈھونڈے
یہ نزھت کے ذہنی فواعل کی رونق

یاں کس کو ہے ضمیر کی شاباش کی ہوس   کس کو نہیں حریف کی دشنام کا لحاظ
رکھتا ہے باز ہجو خرابات سے مجھے   ارواح پاک حافظ و خیام کا لحاظ

جب ہوئی مجھ کو عطا نعمتِ ذوقِ نظری   جس طرف آنکھ اٹھی پائی تیری جلوی گری
دل پرخون میں کہاں جائے غمِ بے اثری   رخصت اے نالہ شب گیر و دعائے سحری
لادوا ہو کے بنا دردِ دل آرام جگر   دردمندوں کو ہے پیغام قضا خوشخبری
اب نہیں رازِ غم دل تجھے افشا سے مفر   اس کے در پے ہیں لب و چشم کی خشکی و تری
دل سے کہہ دو ہوئی جاں بھی ہدف تیر بلا   کام آئی نہ مری جان تیری سینہ سپری
جا کے تو اپنے ہوا خواہوں کا دل ٹھنڈا کر   خانہ بربادوں سے کیا چھیڑ نسیمِ سحری
چارہ گر ہوش میں آ عقل کہاں ہے تیری   جا چکی نزھت بے خود کی یہ شوریدہ سری
باغ فردوس کے کیا کہنے ہیں سبحان اللہ   مگر اے خاکِ در دوست تو چیز دگری
رازداروں کے چھپائے نہ چھپا میرا جنوں   اڑ گئی ہوش کی صورت خبر بے خبری
شعر کے فن میں ہے استاد وہی جس کا سخن
جامعیت سے ہو پر حشو وزوائد سے بری

غزلوں کے ان اشعار میں رومانیت' کیفیت' حسرت و یاس کے مضامین غرض روایتی غزل کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔تاہم ان کے بیچ بیچ ایسے اشعار آجاتے ہیں جو روایت سے ہٹ کر ہیں اور بالکل سیاسی یا مذہبی نوعیت کے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کو زبان تو دی مگر اس داخلی اظہار پر خارجی پردہ ڈالتی رہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ایک خوبصورت دوشیزہ چہرے پر نقاب ڈال لے مگر اس کے حسین ہاتھ پاؤں پردے سے آزاد

ہوں۔ یہ طرز اظہار اس دور کے حالات اور ان کی خاندانی روایات کا تقاضا تھے۔ جنہیں انہوں نے بڑی مہارت سے نبھایا۔

زخ ش کی ایک غزل کا شعر ہے۔

ذاتی الم گیا تو غم قوم آ گیا
مہماں سرائے غم دلِ نزہت رہا سدا

اس شعر میں سچائی کے ساتھ شاعرانہ انکسار بھی ہے۔ غمِ قوم بچپن سے اُن کے ساتھ رہا۔ ان کی نظمیں خطوط مضامین ان کے عہد کے قومی مسائل سے معمور ہیں۔ نظموں میں انہوں نے شبلی کی طرح اس دور کے ہر مسئلے کو موضوع بنایا۔ جبکہ حالی کی مانند وہ خواتین کے حالِ زار پر بھی مسلسل لکھتی رہیں۔ شاعری میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ جو ان کے عہد کے اعتبار سے بے مثال ہے وہ ہے برصغیر کی خواتین کی حالت پر مدلل سوال اٹھانا۔ انہوں نے مثنوی ''آئینہ حرم'' میں جو آئینہ برصغیر کے مسلمانوں کو دکھایا ہے۔ اس میں اُن کے کردار اور عورتوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ پوری طرح منعکس ہے۔ اس غیر منصفانہ رویے پر احتجاج اُن کی غزلوں میں بھی موجود ہے۔

کیا ہے مطعون عورتوں کو جو تم نے گرمِ عتاب ہوکر
جواب اس کا تمہیں ملے گا سوالِ یومِ حساب ہوکر
یہ کیسے مانوں کہ اس میں داخل تفاوت حق مردو زن ہے
رہی ہے زیرِ مطالعہ یاں ہمیشہ فطرت کتاب ہوکر

اور

رفعت خوئے ملک کو بھی اڑالو صاحب
خوش نہ ہو حسن میں گر تم سے فرو تر ہے پری

مندرجہ بالا اشعار میں انہوں نے بڑی جرأت و بے باکی سے مردوں کو مخاطب کر کے صنفی امتیاز پر آواز اٹھائی ہے۔ جہاں تک دیگر سماجی اور قومی مسائل کا تعلق ہے اُن پر فکر و تشویش زخ ش کی سرشت میں تھی۔ اُن کے جذبات ہر اُس واقعے اور سانحے پر جو قومی نقصان کا باعث ہوں مجروح ہوتے۔ خصوصاً جنگ اور تفرقہ بازی سے روکنے کیلئے انہوں نے اپنے قلم کی پوری قوت صرف کی۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے۔

ہوئے مشتعل سنی و شیعہ یک دم
لگی آگ گھر میں بجھانا بجھانا

ردا جو ہے بردبرید محبت

اڑھانا خدیجہ اڑھانا اڑھانا

وہ مسلمانوں میں قومی یکجہتی کا جذبہ جگانے کے ساتھ ساتھ خود غرضی اور بے راہ روی کا بھی خاتمہ چاہتی تھیں۔ ایک اور طرحی غزل میں اُن کا لہجہ مکمل ناصحانہ ہے۔ یہ غزل انہوں نے لیلیٰ خواجہ بانو کوایک خط کے ساتھ بھیجی تھی ،وہ لکھتی ہیں۔

''کل 'ہمدم' میں خواجہ صاحب کی طرف سے اہل سخن کو شرکتِ مشاعرے کی دعوت دی گئی۔ اگر چہ مجھ جیسی کس مپرس کو اس شاندار تقریب میں مہمان ناخواندہ بن کر حاضر ہونے کا کوئی حق نہ تھا مگر مصرعہ طرح میں کچھ ایسی دل آویزی اور مجوزہ نفسِ مضمون سے مجھے کچھ ایسا شغف تھا کہ میں فوراً بلا پس و پیش قافیہ پیمائی شروع کردی اور تھوڑی سی دیر میں غزل تیار ہوگئی۔ مہربانی کر کے اسے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچادو اور مجھے مطلع کرو کے میری غزل ضائع نہیں ہوئی اور مشاعرے سے پہلے پہنچی۔ یہ ضرور خیال رہے کہ غزل علی گڑھ کی ایک مسلمہ کے نام سے پڑھی جائے اور کسی قسم کا نام و نشان آشکارا نہ ہو۔''......۳۰

یہ مکمل غزل یہاں نقل کررہی ہوں۔

مُرغِ دل کو طمع سے آزار رکھ

بے نیازِ دانۂ صیاد رکھ

قید میں بھی روح کو آزاد رکھ

دل میں یادِ اسوۂ سجادؑ رکھ

درس ''فلیبکوا کثیرا'' کو نہ بھول

''زلزلوا'' کا ہے زمانہ یاد رکھ

خون مسلم میں ہوا پیدا فساد

ہاتھ پر ہاتھ اب نہ اے فصاد رکھ

نسل آئندہ کی لعنت کر قبول

ورنہ قائم عظمت اجداد رکھ

لیس للانسان الا ما سعی

خانہ دین سعی سے آباد رکھ

کنج عزلت سے نکل بے پیش و پس
دور دل سے فکر ابرو باد رکھ

دیکھ زال ''یاس'' پاس آنے نہ پائے
ذہن مین افسانہ فرہاد رکھ

کر نہ غم جاہ و جلال کفر کا
یاد حشر جنت شدادر رکھ

تکیہ کر اے قوم! حق پر تکیہ کر
شادر کہہ اے قوم دل کو شاد رکھ

انــت الاعــلــی. انــت الاعــلــی. لا تــخف
دور دل سے وہم بے بنیاد رکھ

بھولنا مت وعدہ فتــح قــریــب
''انَّ وعــد اللہ حــق ۔ یاد رکھ''

زخ ش کی غزلوں سے ان مثالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس شاعرہ نے عمر طبعی پائی ہوتی اور وہ دیگر غزلیں جو تلف ہوگئیں ہیں وہ دستیاب ہوتیں تو اردو ادب کے خزانے میں بیش بہاں اضافہ ہوتا تاہم جو شاعری ان کی دستیاب ہے اسے منظر عام پر آنا چاہیئے اور تاریخ ادب میں انہیں وہ مقام ملنا چاہیے جو اس قد آور شاعرہ کی شایانِ شان ہے۔ اُن کی شاعری ہم عصر نامی گرامی شعرا٫ حالی٫ شبلی٫ آزاد کے ہم پلہ ہے جبکہ اقبال نے صحیح کہا تھا کہ اگر وہ عمر طبعی پاتیں، تو اُن کے پائے کی شاعرہ ہوتیں جبکہ اکبرالہ آبادی کی تعریف میں بھی کوئی طرف داری شامل نہ تھی۔

حوالہ جات،

۱۔ حیات زخ ش ۔صفحہ نمبر۱۸۴۔انیسہ خاتون شروانیہ ۔مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس ،چھتہ بازار حیدرآباد دکن۔
۲۔ (شان الحق حقی٫ نقطہ راز٫ صفحہ نمبر ۲۹۸)
۳۔ لیلیٰ خواجہ بانو (زوجہ خواجہ حسن نظامی) کو خط ۔بتاریخ ۱۳ جولائی ۱۹۱۹ء ۔غیر مطبوعہ٫ کاپی محفوظ ہے

خلاصہ مطالب

جب ہم اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں خواتین شعر لکھتی رہیں ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ کا سرسری ذکر تذکرے میں موجود ہے اور اکثر شریف گھرانوں میں لکھنے والی خواتین کا کام اور نام ریکارڈ پر نہیں ہے۔ زخ ش وہ پہلی شاعرہ ہیں جو اپنی مضبوط فکر اور طرز کلام کی وجہ سے اتنی نمایاں ہیں کہ انہیں نا تو نظرانداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی سرسری ذکر کرکے گزرا جاسکتا ہے۔ زاہدہ خاتون شروانیہ جن کا تخلص ابتدا میں گل اور بعد میں نزہت تھا۔ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد نواب سرمزمل اللہ خان سرسید احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے۔ اس لیے ان کی اور ان کی بڑی بہن احمدی بیگم کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ جیسا کہ مسلمان گھرانوں کا دستور ہے۔ زاہدہ خاتون کی تعلیم کی ابتداء چار برس کی عمر میں قرآن شریف سے کی گئی پھر ایک استانی اردو پڑھانے اور لکھانے کے لیے مقرر کی گئیں۔ عام طور سے اس زمانے میں لڑکیوں کو پڑھایا نہیں جاتا تھا۔ مگر زاہدہ خاتون کو علمی اور ادبی ماحول کے ساتھ ساتھ باقاعدہ فارسی اور عربی کی تعلیم کی سہولت مہیا کی گئی۔ انہیں فارسی پڑھانے کے لیے ایران سے ترک وطن کرکے آنے والی ایک باکمال شاعرہ فرخندہ بیگم طہرانیہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان خاتون کی شاعری اور گھر کے علمی اور ادبی ماحول نے بچپن میں زاہدہ خاتون کو شعر گوئی کی طرف مائل کردیا۔ وہ دس برس کی عمر سے شعر کہنے لگیں۔ زاہدہ خاتون نے صرف ونحو اور فقہ کی تعلیم مولوی سید احمد ولایتی جیسے عالم سے حاصل کیں۔ اس کے علاوہ ان کے بھائی احمد اللہ خان بہنوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔

زخ ش کو جہاں تحصیل علم کا شوق تھا وہاں خدا نے انہیں ذہن رسا اور حساس دل بھی عطا کیا تھا۔ وہ غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ بہت کم عمری میں انہوں نے لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ برصغیر کے سماجی اور سیاسی مسائل کا شعور خصوصاً مسلمانوں کو درپیش مسائل کا ادراک حاصل کرلیا۔ یہ ان کی قوت ادراک تھی جس نے ایک طرف تو ان کے تخلیقی اضطراب کو علم کی جستجو کا راستہ دکھلایا تو دوسری طرف حساس دل و ذہن کو قومی مسائل کی طرف متوجہ رکھا۔ اگر انہیں پے در پے ایسے ناقابل برداشت صدموں سے نہ گزرنا پڑتا جو ان کی خراب صحت اور بہت کم عمری میں موت کا سبب بنے اور وہ موافق حالات ملتے جس میں انہیں اپنی تخلیقی کاوشوں کو سامنے لانے کی آزادی ہوتی تو برصغیر کی تاریخ میں ایک ہستی ابھرتی جو بیک وقت مصلح قوم اور اعلیٰ تخلیق کار بھی ہوتی۔ تاہم وہ بہت کم عرصے میں یعنی ستائیس سال کی عمر تک انہوں نے جو کچھ لکھا ہے جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ تخلیقی جوہر ایک ایسی سیلابی قوت ہے جسے سماج اور معاشرے کا بند روک نہیں سکتا۔

زخ ش کو حصول علم کی اجازت ملی تھی مگر اظہار کی وہ آزادی نہیں جو ان جیسی علمی و ادبی استطاعت رکھنے والی شخصیت کو ملنی چاہیئے تھی۔ وہ اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی رہیں۔ والد کی نافرمانی کا خوف، پہچانے جانے کا اندیشہ، معاشرے کا ردعمل اور ایسے کم اندیش لوگوں سے تحفظ جو تحریر سے زیادہ صاحب تحریر کی ذات میں دلچسپی لیتے تھے۔ ایسی صورت حال تھی جس میں انہیں کئی مرتبہ اپنا نام تبدیل کرنا پڑا اور کچھ عرصے کے لیے نہ لکھنے کا فیصلہ بھی کرنا پڑا۔ چونکہ تخلیقی اظہار کو پابند نہیں کیا جاسکتا اس لیے وہ لکھتی رہیں پر چھپنے میں محتاط رہیں اور صرف وہی کلام و مضامین زیر طباعت آسکے جو اس وقت برصغیر کے معاشرے کے لیے قابل قبول تھے۔

زاہدہ خاتون شروانیہ نے ایک ایسے گھر میں جنم لیا جہاں معاشی مسائل نہیں تھے۔ والد نواب مزمل اللہ خان انگریزی سرکار کے مراعات یافتہ تھے۔ لیکن صدمات کا ایک در تھا جو اس خاندان کے رخ پر کھلا ہوا تھا۔ ان سے ایک سال چھوٹے بھائی احمد اللہ خان جو حیران تخلص کرتے تھے۔ ان کے تمام علمی، ادبی، سماجی و سیاسی مشاغل میں شریک رہتے تھے۔ بائیس سال کی عمر میں ۱۹۱۶ء میں وفات پا گئے۔ ابھی وہ اس شدید صدمے سے نکل بھی نہ پائی تھیں کہ ان کے پھوپھی زاد بھائی محمد انس خان ابد جو بچپن سے ان کے ساتھ پلے بڑے تھے اور ان سے منسوب بھی تھے۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں اچانک انتقال کر گئے۔ محبت کرنے والے بزرگوں نانا، نانی، تایا اور خالہ کی اموات کا صدمہ بھی وہ جھیل چکی تھیں۔ ان کی ایک عزیز ترین سہیلی رابعہ خاتون بھی اس دوران وفات پا گئیں۔ ایک حساس طبع ہستی کے لیے ان صدمات کا سہنا اور تحریروں میں ان کا ماتم گسار رہنا کتنا تکلیف دہ ہوگا اس کا پورا اندازہ ان کی شاعری اور خطوط سے ہوتا ہے۔ وہ مضطرب وجود جس نے دامنِ علم میں پناہ لی تھی۔ آگہی کے ساتھ غم کے الاؤ میں جھلس گیا۔ جو ہستیاں ان کے لیے پناہ گاہ تھیں ایک ایک کر کے بچھڑ گئیں۔ نہ بھائی کی محبت کا بادل رہا نہ خالہ کی شفقت کا سایا۔ پھوپھی زاد بھائی ابد شروانی کی مدد سے اپنے مرحوم بھائی کا کلام جمع کر رہی تھیں وہ بھی موت کی وادیوں میں گم ہوگئے اور یہ ماتم گسار رسم و رواج کی پابند ہوکر اپنے غم کا کھل کر اظہار بھی نہ کرسکیں۔ غزلیں لکھنے پر پابندی تھی۔ جو لکھیں وہ تلف کردی گئیں۔ چند غزلیں ادھر اُدھر سے دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کی حزنیہ نظموں، روزنامچے کے اوراق اور خطوط سے ان کی دلی کیفیت اور ان صدمات کا اندازہ ہوتا ہے جن سے وہ بہت مختصر دورِ حیات میں گزر گئیں۔

اس نابغہ روزگار ہستی کی شاعری اور وہ نثر پارے جو خطوط اور ڈائری کی شکل میں دستیاب ہیں۔ ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں اور وجدانی قوت کا ایسا مظہر ہیں جسے پوشیدہ رکھنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود ظاہر ہونا تھا۔ اگر انہیں موافق حالات ملتے اور عمر وفا کرتی تو وہ کس مقام پر پہنچتی اس کا اندازہ ان کے مجموعہ نظم ''فردوس تخیل'' سے لگایا جاسکتا ہے

جو انہوں نے اپنی زندگی میں مرتب کر دیا تھا۔ نظموں میں ان کا تاریخی و سماجی شعور، حالات حاضرہ سے وابستگی اور قومی زبوں حالی کا دکھ، موثر اظہار اور زبان و بیان پر ان کی قدرت کے آئینہ دار ہیں۔

زخ ش کو اس بات کا بھی مکمل ادراک تھا کہ برصغیر کی خواتین پر تعلیم کے دروازے بند ہیں۔ جو ایک طرف تو خود ان سے نا انصافی ہے اور دوسری طرف قومی انحطاط کا سبب بھی۔ اپنے اس خیال کا وہ بار بار اظہار کرتی ہیں کہ ہندوستان کی عورت کو علم کے میدان میں پسماندہ رکھا جا رہا ہے۔ بہت کم عمری میں انہوں نے خواتین کی علمی و ادبی بیداری کے لیے کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے زمانے کی کروٹ کو محسوس کر لیا تھا کہ اب انگریزی زبان کی تعلیم بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنی خانہ زاد انجمن بنائی تو اس کا نام ''ینگ شروانیز'' رکھا اور انگریزی نام پر اعتراض کرنے والوں کو مدلل جواب دیا۔ خواتین میں علم کی روشنی پھیلانے کا خواب دیکھنے والی یہ شاعرہ اس بات پر ملول رہی اور بار بار اپنی شاعری میں اس کا اظہار بھی کرتی رہی کہ عورت پر ترقی کی راہیں مسدود کر دی گئیں ہیں۔ دراصل عورت کی بڑی صلاحیتیں حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ سماج، معاشرہ، خاندانی وقار اور روایات کے نام پر جو بنے بنائے راستے ہیں۔ ان میں سے کوئی نیا راستہ بنانا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن تخلیقی فکر ان بنے بنائے سانچوں سے چھلک جاتی ہے۔ آج اتنی ترقی کے باوجود ساری دنیا کی خواتین میں ایک احساس مشترک ہے کہ انہیں کوئی لائحہ عمل اپنانے اور اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے کتنی ہی ایسی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو بظاہر موجود نہیں ہوتی۔ مگر کہیں نہ کہیں شیشے کی یہ دیوار ہوتی ضرور ہے جس سے وہ بار بار ٹکراتی ہیں۔ یہ نادیدہ دیوار جس کے لیے انگریزی میں glass ceilling اصطلاح استعمال کی جاتی ہے کبھی سیسہ پلائی ہوئی ایسی مضبوط چہار دیواری تھی جس سے برصغیر کی عورت کی پرچھائیں بھی باہر نہیں جا سکتی تھی۔ زخ ش نے اس بات کا گلہ کیا ہے کہ اسلام نے عورت کو مقام اور حقوق دیے ہیں۔ رسم و رواج نے اسے بھی ان سے چھین لیا ہے۔ وہ مردوں اور خواتین دونوں کو مخاطب کر کے اس صورتحال کو تبدیل کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ وہ ایسی پرعزم شخصیت اور باکمال تخلیق کار تھیں جو اپنے لیے بھی کوئی راہ تلاش کر لیتی تھیں اور دوسروں کو بھی وہ راستہ دکھاتی تھیں جو انہیں منزل تک پہنچا سکے۔ شعوری اور لاشعوری دونوں سطح پر وہ خواتین کی آزادی رائے اور آزادی عمل کی طلب گار نظر آتی ہیں۔ ان کی ذہنی استطاعت اور سماجی و نسائی شعور کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف وہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر افسوس کرتی ہیں تو دوسری طرف کسان اور مزدور ان کا موضوع بنتے ہیں۔ شبلی، حالی اور اکبر الہ آبادی پر گریہ کناں یہ شاعرہ جب شاہِ یونان کا نوحہ لکھتی ہے تو طنز کے نشتر چمکتے ہوئے نظر آتے ہے۔ کسی بھی بڑے تخلیق کار کی طرح انہیں مناظر قدرت کی قلمی تصویر بنانے پر بھی پورا عبور تھا۔ وہ روانی طبع کے ساتھ ساتھ اعلیٰ جمالیات اور فکر و فلسفے کا بھی شعور رکھتی تھیں۔ ان کا انتقال ستائیس برس کی عمر میں ۲ فروری ۱۹۲۲ء کو ہوا۔

دوران تحقیق زخ ش کے دوسو سے زائد ایسے خطوط مجھے دستیاب ہوئے جو ۱۹۱۶ء سے اپنی وفات تک انہوں نے لیلیٰ خواجہ بانو زوجہ خواجہ حسن نظامی کو لکھے تھے۔ لیلیٰ خواجہ بانو ان کی ہم عمر تھیں اور ان سے خاندانی مراسم کی وجہ سے خط وکتابت میں بے تکلفی تھی۔ چنانچہ ان کو لکھے جانے والے خطوط میں وہ زخ ش پوری سامنے آتی ہیں جو علم و آگہی رکھتی تھیں، سوچتی اور محسوس کرتی تھیں اور ادراک وشعور کی اعلیٰ منزلوں کی طرف گامزن تھیں۔ انہوں نے ان خطوط میں اپنے عہد کے ہر مسئلے، قوم کے ہر عمل پر اپنے احساسات و خیالات کا نہ صرف اظہار کیا ہے بلکہ ان مسائل کے حل کی طرف رہنمائی بھی کی ہے۔ ان خطوط سے ان کی شاعری کے سیاق وسباق اور فکری گہرائی کو سمجھنے میں بھی مدد ملی ہے اور اس دور کے سیاسی وسماجی حالات کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔

اس نابغہ روزگار ہستی کو تاریخ ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جو اس کا جائز حق تھا۔ میری تحقیق کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ حالات اور وقت کی گرد ہٹا کر اس شخصیت کو اس طرح سامنے لاؤں کہ انہیں ان کے جائز مقام پر فائز دیکھا جاسکے۔ اس تحقیق کی تین جہتیں ہیں۔ پہلی جہت ان رسائل واخبار کا کردار ہے جنہوں نے برصغیر کی خواتین کو نہ صرف پہلی مرتبہ اپنی آواز عام لوگوں تک پہنچانے کا موقع فراہم کیا بلکہ ان کی تحریروں کو محفوظ بھی رکھا۔ دوسری جہت ادب کی تاریخ میں ایک قدآور شاعرہ کی موجودگی کا پتہ دینا ہے اور تیسری جہت نسائی علوم (Women Studies) کے طلبہ کو ایک ایسی مثالی ہستی سے متعارف کرنا ہے جو نسائی شعور سے مالا مال تھی اور اس کا اظہار اس وقت کر رہی تھی جب برصغیر میں خواتین کا دور تاریک تھا۔

ضمیمہ نمبرا

S.H. Haqqee
3700 Kaneff Crecent, #203,
Mississauga Ont. L5A 4B8,
Canada

۱۱نومبر۲۰۰۳ء

محترمہ مدیحہ شروانی صاحبہ سلام و رحمت

مجھے آپ کا ستمبر کا لکھا ہوا خط وصول ہوا تھا، اور اسے پاکر سچ مچ بہت مسرور ہوا کہ آپ مرحومہ احمدی بیگم کی صاحبزادی اور زاہدہ خاتون شروانی کی بھانجی ہیں، اور نواب سر مزمل اللہ خان اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی نواسی۔ میں علیگڑھ اور اردو کے تعلق سے آپ کے افراد خاندان سے ارادت رکھتا ہوں۔ سب سے پہلے تو تاخیر جواب کی معذرت۔ میں ان دنوں مبتلائے حوادث رہا، جن میں سے ایک میری بیوی سلمیٰ حقی کی وفات بھی ہے۔ جنہوں نے یکم ستمبر کو یہیں ٹورونٹو میں داغ مفارقت دیا۔ ان سے زندگی بھر ساتھ رہا تھا۔ وہ میری عمزاد بہن بھی تھیں۔ علیگڑھ کی پرانی طالبہ تھیں اور شیخ عبداللہ مرحوم کے گرلز کالج میں ۱۹۴۷تک پانچ سال پڑھاتی بھی رہیں۔ پھر کراچی میں یہی شغل جاری رہا۔ ادھر چند سال سے ہم اپنے لڑکوں کے ساتھ کینیڈا میں مقیم ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، احمدی بیگم صاحبہ پاکستان آ گئی تھیں☆۔ کیا آپ نہیں آئیں؟ غالباً آپ کی شادی ہندوستان میں ہوئی ہوگی۔ فردوس تخیل کے دوسرے کو چک ایڈیشن کا ایک نسخہ آپ کے ماموں صاحب نے علیگڑھ میں دیا تھا جب میں ۱۹۹۸ میں وہاں گیا تھا۔ میں نے ادارۂ یادگار غالب کراچی سے درخواست کی تھی کہ فردوس تخیل کا ایک ایڈیشن پاکستان سے شائع کریں اور انہوں نے منظور بھی کرلیا تھا۔ مگر ابھی تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس ادارے کی صدر بیگم آمنہ ملک ہیں۔ یہ علی گڑھ ہی میں پلی بڑھیں۔ ان کے والد ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ طبیہ کالج علی گڑھ کے پرنسپل اپنے زمانے کے معروف آدمی تھے۔ میرس روڈ پر ان کی کوٹھی، بٹ کدہ، کہلاتی تھی۔ آمنہ ملک صاحبہ نے اپنے بچپن میں زاہدہ خاتون کو دیکھا ہے جنہوں نے ان کو بندوں کی ایک جوڑی تحفے میں دی تھی۔ اب آمنہ بیگم کی عمر ۸۸سال ہے۔ میں ان کا پتہ لکھتا ہوں۔ آپ انہیں خط لکھیے تو اچھا ہوگا اور کہیئے کہ فردوس تخیل کو چھپوانے میں دیر نہ کریں۔ دراصل اس ادارے کے کرتا دھرتا مشفق خواجہ صاحب ہیں۔ لیکن بیگم صاحب کو یاددلایا جائے تو ان پر تقاضا کر کے کتاب جلد چھپوائی جاسکتی ہے۔ میں بھی لکھتا ہوں۔ پتہ یہ ہے:

Begum Amina Majeed Malik 21, 10th Central St.k Phase IV, Defence
Authority, Karachi 75500 Pakistan

آپ نے کیا اچھی خبر سنائی کہ مرحومہ کا مجموعۂ غزلیات ''نزہت الخیال'' آپ کے پاس محفوظ ہے☆☆۔ ارے واہ! وہ تو ضرور ہی چھپنا چاہئے اور اچھا ہے کہ دونوں کتابیں ہم جلد ہوں۔ جہاں تک یاد آتا ہے مجھے بیگم ہارون خان شروانی نے یہ بتایا تھا کہ وہ دارالاشاعت پنجاب کو بھیج دیا گیا تھا مگر چھپنے نہ پایا۔ آپ کے پاس شاید اس کا مثنیٰ ہوگا۔

موصوفہ کا اردو ادب کی تاریخ میں ایک مقام ہے۔ جیسا کہ میں نے لکھا، وہ ہماری پہلی ترقی پسند شاعرہ تھیں۔ ان کی علمی استعداد بہت سے نامی شعرا سے بڑھ کر تھی۔ ان کا کلام خوبی اور پختگی میں استادی کے درجے پر تھا۔ خواتین میں تو دراصل وہی سب سے ممتاز تھیں۔ ان کے بعد بہت سے شاعرات میدان میں آئیں اور انہوں نے شاعری میں بڑے گل کھلائے ہیں، لیکن بنیاد کسی کی بھی اتنی پختہ نہیں۔ ز خ ش کا مقام اپنی جگہ محکم ہے۔ اس کا پوری طرح اعتراف ہونا چاہیئے۔

میں نے ۱۹۵۴ء میں ایک مقالہ ان پر کراچی کے حلقۂ ارباب ذوق کے ایک جلسے میں پڑھا تھا جو بعد میں ماہنامہ ''نور'' میں چھپا، پھر میرے پہلے مجموعۂ مضامین ''نکتۂ راز'' میں شامل ہوا۔ میں آپ کو اس کی عکسی نقل بھیجتا ہوں۔ اس نے اس وقت لوگوں کو خاصا چونکا دیا کیوں کہ لوگ اس نام اور اس کے مسمیٰ سے واقف نہ تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ دراصل مساۃ ہیں۔ اس کے بعد بھی غالباً آپ کے علاوہ کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ تاریخ ادب میں کوئی ذکر نہیں آیا یہ بڑی زیادتی ہے۔

مرحومہ کے خطوط کی نقلیں میں نے برسوں کی پیروی کے بعد حسن ثانی صاحب سے حاصل کی تھیں اور اپنے سابقہ مقالے کے ضمیمے کے طور پر ایک مضمون ان پر بھی لکھا۔ خطوط مشفق خواجہ صاحب کے پاس جمع کرا دیئے تھے جو میرے عزیز دوست نوادرادب کے جامعہ ہیں۔ ان سے درخواست کی تھی کہ یہ خطوط بیگم مجید ملک کو ضرور پڑھنے کے لیے دیں مگر انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جانے پائیں مبادا پھر ہاتھ نہ آئیں۔

ایک خاتون فاطمہ حسن جو خود بھی خاصی معروف شاعرہ ہیں ان دنوں ز خ ش پر کراچی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے مقالہ تیار کر رہی ہیں۔ میرے پاس ان کا ڈاک کا پتہ نہیں لیکن آپ کراچی میں کسی سے کہیں تو معلوم ہو جائے گا۔ یونی ورسٹی میں ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کی معرفت خط لکھیں تو امید ہے کہ ان کو مل جائے گا۔ وہ خود بھی آپ سے رابطے کی کواہش مند ہونگی۔ ز خ ش اور آپ کی والدہ صاحبہ کے خطوط پر میرا جو مضمون آپ کے مطالعے میں آیا افسوس کہ میں خود ابھی تک اسے چھپی ہوئی شکل میں نہیں دیکھ سکا۔ یہ میں نے مشفق خواجہ صاحب کو دے دیا تھا۔ انہی نے لاہور کے مجلّے کو بھیجا جہاں شائع ہوا۔

خیر و عافیت

شان الحق حقی

مکرر: میرے پاس نواب صاحب مغفور کی فارسی غزلیات کا دیوان بھی تھا۔ آپ کے پاس بھی ہوگا۔ مگر میری بہت سی کتابیں میری عدم موجودگی میں گم ہوگئیں۔ آپ اپنے مضامین کی نقل مجھے بھیجیں تو ممنون ہوں گا۔
ملفوفہ: مقالہ زخ ش از حقی، مطبوعہ نکتہ ٔراز (۱۹۷۲)

بخدمت مدیحہ شروانی صاحبہ، 58 Aligarh Apartments, Shamshad Market, Aligarh, 202002

☆ وہ پاکستان نہیں آئیں تھیں۔

☆☆ مدیحہ خاتون کے پاس ''نزہت الخیال'' کی صرف پندرہ غزلیں محفوظ ہیں۔ (ضمیمہ نمبر ۳)

غزل نمبر۱۔ مطبوعہ شباب اردو اگست ۱۹۲۴ء

سحر کا ہے منظر سہانا سہانا کسی دیدہ ور کو بلانا بلانا

طبیبوں سے نفرت ہے بیمارِ غم کو انہیں سامنے سے ہٹانا ہٹانا

جہاں میں نہیں خود غرض کون انساں عزیزوں خدارا بتانا بتانا

بلاتی ہے منت سے گر زالِ دنیا دغا ہے دغا ہے نہ جانا نہ جانا

ہوئے مشتعل سنی و شیعہ یکدم لگی آگ گھر میں بجھانا بجھانا

نہ کھل جائے مجھ ننگِ ہستی کا پردہ مرے کملی والے چھپانا چھپانا

شبیہہ نبی تو نہیں ہے فرشتو! یہ کیا ہے یہ کیا ہے دکھانا دکھانا

ردا جو ہے بردے بریدِ محبت اڑھانا خدیجہ اڑھانا اڑھانا

نچانا۔ نچانا۔ مری بیخودی پر مجھے جس نے دیوانہ جانا نچانا

کہا تھا نہ کہہ راز دل سب سے ز۔خ مگر تم نے کہنا نہ مانا نہ مانا

غزل نمبر۲۔ ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء

مظلوم ہی رہیں گے یہ اہلِ جفا سدا باقی رہے گا صرف وجودِ خدا سدا

مقصد براریوں سے نہ ہوتا کبھی نصیب جو تجھ سے سکھ ملا دل بے مدعا سدا

ٹوٹا خدا ہی جانے طلسم امید کب یہ ٹوٹتا ہے دل کی طرح بے صدا۔ سدا

باقی ہے ایک تیری نوا سب تو مٹ گئے تو بھی نہیں رہے گی۔ بقائے فنا سدا

ذاتی علم گیا تو غمِ قوم آگیا

مہماں سرائے غم دلِ نزہت رہا سدا

غزل نمبر۳

عورتوں میں بے حجابی آگئی ملک و ملت کی خرابی آگئی

حسرتوں نے گھر کیا دیمک زدہ خانہ دل کی خرابی آگئی

خوبیِ ہم جنس کو کرنا نہاں قوم میں یہ کیا خرابی آ گئی
جب کسی کی زردیِ رخ کا سنا چہرے پر رنگت گلابی آ گئی
ذکرِ حق سے گُل المِ جاتا رہا ہاتھ قفلِ دل کی چابی آ گئی
شعر سے غائب ہوئے سارے ہنر اک فقط حاضر جوابی آ گئی
پرسوں تھا اپنی وفا کا امتحاں کل نوید کامیابی آ گئی

غزل نمبر۴

تھا نہ علمِ فتنہ ہائے ہستی فانی مجھے ہائے یاں آ کر ہوئی کیسی پشیمانی مجھے
کیا ہو قانوں سازیِ مغرب سے حیرانی مجھے یاد ہے مسلم کا آئین جہانبانی مجھے
''ترک'' کہتا ہے نہ سمجھے روس ''ایرانی'' مجھے جنگ کا نعرہ ہے بلبل کی غزل خوانی مجھے

قدرتِ تسخیر موجودات عالم بخش کر اُف رہ حکمت دے دیا ذوقِ تن آسانی مجھے
سحرِ ظلمات لحد کیجئے پے آبِ حیات مہرِ حق نے دی ہے شمع نورِ ایمانی مجھے
قحط میں جس طرح مرتے ہیں گرانی سے بشر کر رہی ہے قتل جنسِ غم کی ارزانی مجھے
تشنہ لب ہی مرنے دے کفار جوں آلِ نبی ہے قسم اُن کو نہ دے وقتِ فنا پانی مجھے
دھو گیا رنگِ سیاہ کاریِ بُنِ منہ کا عرق چشمۂ رحمت بنی میری پشیمانی مجھے
آخری تسلیم اے ہمسائے گانِ ذی شعور لے چلی دشتِ خطر میں میری نادانی مجھے
سخت مشکل سے بھی آسانی مجھے ملتی نہیں کیسی پالیتی ہے ہر مشکل باآسانی مجھے

غزل نمبر۵۔ اگست ۱۹۱۵ء

ہے خلافِ رسم دنیا پاکیِ دامن کی خیر وہ بڑھا دستِ ہوس یوسف کے پیراہن کی خیر
میرا بارِ جرم اٹھالیتا ہے اپنے دوش پر دوستوں میں مانگتی ہوں رات دن دشمن کی خیر
آتش گل جانے گلچیں آہِ بلبل کو نہ تو جل کے خاکستر نہ ہوجائے منا دامن کی خیر

دانت ہے سر سر کا اس پر برق کو ہے اس سے لاگ
کیا منائے بلبلِ مسکین اب مسکن کی خیر

مٹ گئے ہم پر نہ سیاہیٔ خطِ طالع مٹی
جو رہے سر سر سے نہیں شمع سر مدفن کی خیر

دستِ گلچیں کو جو دیکھا سوئے گل بڑھتے ہوئے
ہاتھ اٹھائے برگ نے سوئے فلک گلشن کی خیر

اے خدا اب تو ہی مالک ہے دلِ نادان کا
اس گرفتارِ بلا اس عقل کے دشمن کی خیر

اس زمیں پر ہندو و مسلم حیات ہند ہیں
زندگی چاہو تو مانگو وصلِ جان و تن کی خیر

زندگی بھر نزہت چھوٹے نہ ساتھ اسلام کا
راستہ تاریک و کج ہے مشعلِ روشن کی خیر

غزل نمبر۶۔ اگست ۱۹۱۹ء

نزھت آوارہ نہ پھر دشت میں صرصر کی طرح
دشت بہہ جائے نہ اشکوں سے کہیں گھر کی طرح

گوشِ غافل میں پہنچ۔ دل سے نکل نالہ غم
سونے والے کو جگا شورشِ محشر کی طرح

دلِ مومن میں ہے اب نقش خیالِ خوباں
ہوگیا کعبہ صنم خانۂ آزر کی طرح

بتِ مغرب! جو مرا تجھ پہ بچا مر مر کر
تن بھی مرمر ہے ترا دل بھی ہے مرمر کی طرح

مرکز دین سے نہ ہٹ نورو ضیا کے طالب
گردِ محور ہو رواں تودہ اخبر کی طرح

حسن تقدیر سے جوں خضر ملی نہر بقا
سوئے تدبیر سے ہے تشنہ سکندر کی طرح

بے نوا اہل ہے تو سعی کا ماشاء اللہ
پاشکستہ ترے دشمن ہوں تونگر کی طرح

دن کو کرتا ہے تو محنت شہہِ دیں کی مانند
شب کو فرماتا ہے آرام بھی قیصر کی طرح

شور ہے ہندو و مسلم میں شکر رنجی کا
کیا مزا ہو جو ملیں شیر کی شکر کی طرح

حسن تھا گر صفت ابروئے خوباں ملتے
فتنہ اٹھا جو لڑے چشمے فسوں گر کی طرح

غزل نمبر۷

کیا عجب گر ہو کسی کامل کی فرزانے کی لاش
ایسی ناقدری سے اٹھواؤ نہ بیگانے کی لاش

پردہ محمل اٹھا۔ او لیلیٰ نظارہ دوست
بن میں بے گورو کفن ہے ایک دیوانے کی لاش

دل کو تڑپانے لگی یثرب میں مرنے کی ہوس
جب نظر آئی قریب شمع پروانے کی لاش

خاک میں ملنا ہی ہے رہنے دو دم بھر اور یاں　　حاملو! کچھ پر لگا کر اُڑ نہیں جانے کی لاش

دیکھو مر کر ہو نہ رسوا وضع کا پابند رند　　دیکھو مسجد میں نہ جانے پائے میخانے کی لاش

نزھت دین دار کی ہمکو وصیت یاد ہے
اس مسافر کی وطن ہرگز نہیں جانے کی لاش

غزل نمبر ۸

بادِ عشرت چمن دہر میں ہر صبح چلی　　نہ کھلی پر نہ کھلی اس دلِ پژماں کی کلی

دشمنوں کا تو چلا زور بھی اور جادو بھی　　آرے چلتے ہیں جگر پر کہ میری کچھ نہ چلی

شیخ کترائے کہ جھنجھٹ نہ ہو ناحق سرِ رہ　　سانس لی میں نے بھی کھل کر کہ بلا سر سے ٹلی

باغ دل میں شجر غم تو بہت جلد بڑھا　　سخت حیرت ہے کہ پھر شاخ اجل کیوں نہ پھلی

گئے وہ دن کہ نظر آتی تھی نزھت ہرجا
اب تو اک گوشہ تنہائی بھلا اور وہ بھلی

غزل نمبر ۹۔ دسمبر ۱۹۱۹ء

محمد سے ہے خانۂ دل کی رونق　　تجلی لیلیٰ ہے محمل کی رونق

محمد کے بن ساری دنیا ہے ویراں　　گئی صدر کے ساتھ محفل کی رونق

امیدوں سے ہے لطفِ خطراتِ الفت　　سفینوں سے ہوتی ہے ساحل کی رونق

قسم ہے طبل تہی بانگ پرور　　قسم سے ہے بازار باقی کی رونق

سکوت رعایا ہو بے لطف ظالم　　جو تو دیکھ لے ملک عادل کی رونق

چمن میں سکوت شجر خوف زا ہے　　دریغا وہ شور عنادل کی رونق

جو کہنا ہے کہہ لو جو سننا ہے سن لو　　کہ مٹنے کو ہے چشم بسمل کی رونق

میرے رخ کی رونق ہے منزل رسی سے　　پہنچنے سے ہے میری منزل کی رونق

تبارکث۔ احسنت عشق حقیقی　　تیرا حسن ہے عالمِ دل کی رونق

دکھا اپنی بے مثل طاقت کے صدقے　　خداوند کی شانِ کامل کی رونق
وہ شاں جو ہے مقصورۂ دل کا جلوہ　　وہ شاں جو ہے معمورۂ کُل کی رونق
وہ موسیٰ نوازی وہ دھندلا سا پرتو　　وہ آئینۂ زار مقابل کی رونق
وہ احمد کے خلق خصائل کی خوبی　　وہ یوسف کے شکل و شمائل کی رونق
حبش کا وہ میکش عرب کا وہ ساقی　　وہ منصور وہ کوئے قاتل کی رونق
وہ مجنوں کی پاکوبی و شعر خوانی　　وہ نغمات ساز سلاسل کی رونق
وہ فرقت کی کلفت وہ قربت کی راحت　　وہ ''اف اف'' کی زینت وہ کھل کھل کی رونق
وہ ارواحِ بے بزم عالی کی تزئین　　وہ اجسام بیدارِ سافل کی رونق
ابھی دیکھ لو پھر نہ پاؤ گے ڈھونڈے　　یہ نزھت کے ذہنی فواعل کی رونق

غزل نمبر ۱۰۔ فروری ۱۹۲۰ء

ہم کو نہیں تمسخر اقوام کا لحاظ　　ہے صرف اپنی ذات کے آرام کا لحاظ
اٹھتی ہوں آج رایت حق لے کے ہاتھ میں　　دیکھوں کسے ہے عزت اسلام کا لحاظ
یاں کس کو ہے ضمیر کی شاباش کی ہوس　　کس کو نہیں حریف کی دشنام کا لحاظ
سمجھو ادائے فرض میں شاہ وگدا کو ایک　　دیکھو کیا نہ گور نے بہرام کا لحاظ
تھوڑا بہت ضمیر کا بھی پاس چاہیئے　　ایسا بھی کیا مخالفتِ عام کا لحاظ
رکھتا ہے پاس بعض ہجوِ خرابات سے مجھے　　ارواحِ پاک حافظ و خیام کا لحاظ
اے باپ چومیو نہ لب نازک پسر　　لازم ہے طبع نازک ایتام کا لحاظ
سن قول حضرت انس اے زبردست کش　　کر شاہ دیں ﷺ کی خدمتِ خدام کا لحاظ
احمد کا واسطہ مرے احمد کو بخش دے　　کر اے خدا مشارکت نام کا لحاظ

غزل نمبر ۱۱۔ فروری ۱۹۱۹ء

آغاز کا لحاظ نہ انجام کا لحاظ　　حاضر کا ہے لحاظ یہ کس کام کا لحاظ

آرام کا لحاظ ہو سرما کی شب میں کیا | ہے مجھ کو پائے شاہ کے اورام کا لحاظ

قانونِ شرد توڑ کے مسلم بنے ہو تم | شرماؤ کرکے معنیٔ اسلام کا لحاظ

اللہ کا وجود بھی مشکوک ہوگیا | اللہ: اس قدر خردِ خام کا لحاظ

پر خوں کرے نہ طعن سے عاصی کا دل کبھی | حاجی کو گر ہو حرمت احرام کا لحاظ

عابد کو بیت چاہئے عارف کو رب بیت | اس کو شراب کا ہے اسے جام کا لحاظ

دعوائے فضل پیشِ بشر کرنا اے ملک | لازم ہے اس کے عزت و اکرام کا لحاظ

نزہت: خموش رازِ فناء الفنا نہ کہہ | للہ کر عوام کالانعام کا لحاظ

غزل نمبر ۱۲۔ نومبر ۱۹۱۶ء

جب ہوئی مجھ کو عطا نعمتِ ذوقِ نظری | جس طرف آنکھ اٹھی پائی تیری جلوہ گری

دشتِ وحشت ہے پھر آمادہ پئے جامہ دری | ہاتھ کو روک لے او منہمک بخیہ گری

دل پرغم میں کہاں جائے غمِ بے اثری | رخصت اے نالہ شب گیر و دعائے سحری

لادوا ہو کے بنا دردِ دل آرامِ جگر | دردمندوں کو ہے پیغام قضا خوشخبری

اب نہیں رازِ غم دل تجھے افشا سے مفر | اس کے در پے ہیں لب و چشم کی خشکی و تری

کثرت گریہ سے بجھ جاتا ہے غم کا شعلہ | مجھ سے کہتی ہے یہ خاموشیٔ شمع سحری

دل سے کہہ دو ہوئی جاں بھی ہدف تیر بلا | کام آئی نہ مری جاں تیری سینہ سپری

بزم عشرت کا ابھی رنگ بدل جائے گا | رو نہ مل مل کے گلے اشک سے خونِ جگری

جا کے تو اپنے ہوا خواہوں کا دل ٹھنڈا کر | خانہ بربادوں سے کیا چھیڑ نسیمِ سحری

صوفیٔ تشنہ لب وجد نے جھانکی بغلیں | لے اڑی مشرب مستاں میری عالی نظری

چارہ گر ہوش میں آ عقل کہاں ہے تیری | جا چکی نزہت بے خود کی یہ شوریدہ سری

باغ فردوس کے کیا کہنے ہیں سبحان اللہ | مگر اے خاکِ در دوست تو چیز دگری

رازداروں کے چھپائے نہ چھپا میرا جنوں | اڑ گئی ہوش کی صورت خبر بے خبری

نزہت ہیچمداں کو بھی ہو دعویٰ ترا | رحم آتا ہے تیرے حال پہ اے نکتہ وری

شعر کے فن میں ہے استاد وہی جس کا سخن
جامعیت سے ہو پر حشو وزوائد سے بری

اضافہ بطور ارقام سطور بالا

کیا کرے گا وہ سر حشر مری پردہ دری ‏ ‏ جس کی شفقت سے ہے خجلت زدہ مہرِ پدری
بسکہ ہے عکسِ فگن خاورِ داغِ جگری ‏ ‏ دل میں ہے شام و سحر نور طلوعِ سحری
رفعتِ خوئے ملک کو ہی اڑا لو صاحب ‏ ‏ خوش نہ ہو حسن میں گر تجھ سے فروتر ہے پری
عارضِ ہوش کے جلوہ سے نہ خوش ہوں احباب ‏ ‏ پہلے بجھنے سے بھڑک اٹھتی ہے شمع سحری
خوابِ غفلت سے جگایا مجھے چٹکی لے کر ‏ ‏ کھل گئی آنکھ خوشا لذتِ دردِ جگری
دیکھ کچھ نہ نظر اے دلِ ناداں اس پر ‏ ‏ جلوۂ شاہدِ دنیا ہے فریبِ نظری
منظرِ صبح پہ یوں دیدۂ بینا ہے نثار ‏ ‏ جیسے بیمار کو مرغوب ہو خوابِ سحری

غزل نمبر ۱۳۔ جولائی ۱۹۱۹ء

مُرغِ دل کو طمع سے آزار رکھ
بے نیازِ دانۂ صیاد رکھ
قید میں بھی روح کو آزاد رکھ
دل میں یادِ اسوۂ سجادؑ رکھ
درس ”فلیبکوا کثیرا“ کو نہ بھول
”زلزلوا“ کا ہے زمانہ یاد رکھ
خونِ مسلم میں ہوا پیدا فساد
ہاتھ پر ہاتھ اب نہ اے فصاد رکھ
نسل آئندہ کی لعنت کر قبول
ورنہ قائم عظمت اجداد رکھ

لیس للانسان الا ما سعی

خانہ دین سعی سے آباد رکھ

کنج عزلت سے نکل بے پیش و پس

دور دل سے فکر ابرو باد رکھ

دیکھ زال ''یاس'' پاس آنے نہ پائے

ذہن مین افسانہ فریاد رکھ

ہے محرم کا یہ عشرہ رو ضرور

پر نظر میں عشرتِ اعیاد رکھ

کر نہ غم جاہ و جلال کفر کا

یاد حشر جنت شدادر رکھ

تکیہ کر اے قوم! حق پر تکیہ کر

شادر کہہ اے قوم دل کو شاد رکھ

انت الاعلی۔ انت الاعلی۔ لا تخف

دور دل سے وہم بے بنیاد رکھ

بھولنا مت وعدہ فتح قریب

''انَّ وعد اللہ حق ۔ یاد رکھ''

غزل نمبر ۱۴

ساقی کو مے مبارک مے کو سبو مبارک	کیف شرابِ وحدت مسلم کو تو مبارک
یستخلفھم کی قرآن دی بشارت	اے خادم خلافت! فال نکو مبارک
آئی بہار مغنی مضموں ہوئے شگفتہ	اے گلشن تخیل جوشِ نمو مبارک
یہ مائل طرب ہے وہ پیکر تعب ہے	آگاہی خیال یارو عدو مبارک
اے شاہد صداقت اے لطف زندگانی	نزہت تجھے مبارک نزہت کو تو مبارک
پائے نبی پہ سر ہے قرباں شکوک دل کے	ثابت ہوئی حقیقت کی جستجو مبارک

حق نے یہ دن دکھایا اے خوش نصیب حق گو
رسوائی دیارو بازار و کو مبارک

مالک ہے تو ارم کا ''وعداً علیہ حقا''
اے جاں فروش: ''فستقشرو'' مبارک

اب تجھکو غم ہے راحت اے خوگرِ مصیبت
تقلیب دل مبارک تغیر خو مبارک

پایا ہلال معنی زیب سپہر صورت
ہاں عید تجھکو طبع اسرار جو مبارک

مقہور ہو کہ اب میں سرخوش ہوں یاد رب میں
تھی شہرت خطابِ بیگانہ خو مبارک

اے مجرم محبت زندہ ہے تجھ کو بستاں
زنجیرِ پا مخلد طوق گلو مبارک

ہے مشہد محبت، دریائے خونِ نزہت
اے شائق طہارت! غسل و وضو مبارک

غزل نمبر ۱۵۔ نومبر ۱۹۱۴ء

چمک نہ اے نور طبع اوج سخن پہ تو آفتاب ہوکر
خرد کا دود آتش دل چھپا ہی لے گا سحاب ہوکر

کیا ہے مطعون عورتوں کو جو تم گر میں عتاب ہوکر
جواب اس کا تمہیں ملے گا سوال یوم الحساب ہوکر

زہ شرف دامن کرم نے بصد محبت اسے ہوا دی
کیا جو عاصی نے ذکر عصیاں عرق عرق آگ آگ ہوکر

وہ قوم حاضر جوابیوں میں جواب تھی جو کہ آپ اپنا
سنے جو اس نے دلائل حق تو رہ گئی لاجواب ہوکر

سنی نہ مسلم نے جوش بخشش میں پیرِ دانش کی پیش گوئی
کہ فدوی بارگاہ تیرے گھر رہیں گے عالی جناب ہوکر

یہ کیا کیا تو نے آہ مسلم کہ پیش اغیار ہتک دیں کی
عرب کی عزت کنارے گنگا ڈبوئی مست شراب ہوکر

جو آج ہیں منکرین ایماں جو آج ہیں مبتلائے عصیاں
کریں گے کل شور وبقا ''اکشف'' وہ مبتلائے عذاب ہوکر

یہ کیسے مانوں کے اس میں داخل تفادحق مرد و زن ہے
رہی ہے زیر مطالعہ یاں ہمیشہ فطرت کتاب ہوکر

ترے فوائد نہیں کسی کو ترے بغیر عزیز ہرگز
مشاورت صرف دل سے کرکے وہ کام جس میں صواب ہوکر

جیئے گے ہم برائے دعوت کہ دوست لذت چش الم ہوں
بنا جو شور آبا خوں دل کا جگر بھی آیا قباب ہوکر

حریف عاقل نے عین موقع پر کرلیا تھا جو کام نزہت
کیا وہی ہم نے بھی مگر کب تباہ ہوکر خراب ہوکر

غزل نمبر ۱۶۔ ستمبر ۱۹۱۹ء

کرکے اس طرح دین کا استخفاف
سخت پچھتاؤ گے قصور معاف

نہ رہا کچھ نشانِ قومیت
قوم کے منہ پر کہہ رہی ہوں صاف

سر بہ زانو ہوں سوچ اے مسلم　　تھے سر افراز کیوں تیرے اسلاف

غور کر ان کی حکمتوں پر شروع　　ختم کر ان کی تربتوں کا طواف

پڑھ بے نملی لہم لیزدا ددا　　حافظ وعدہ ہائے استخلاف

عزۃ المومنین ہے موعود　　رب عزت نہیں ہے وعدہ خلاف

کس خطا میں ہیں عورتیں ماخوذ　　اے مسلمانو شرط ہے انصاف

کیوں نہ ہو خادمِ وطن عورت　　کیوں معطل رہے یہ بیٹر ہاف

صدق سے کہہ دو عہد باطل ہے　　اے گہر اٹھ گئے تیرے صراف

اب ہے دارالاماں صنم خانہ　　حرم مومناں محاذ مصاف

باغ فردوس پر بھی ایک نظر　　اے ثناخان راحت اعراف

مجھ کو ٹھہرایا مجرم ازرہِ عدل　　بخش اب یارب ازرہِ الطاف

ضمیمہ نمبر۳

درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی ﷺ، دہلی　　　　۹ ستمبر ۱۹۱۶ء

صاحب علم و قلم بہن　　　　السلام علیکم۔

آپکا خط آیا۔ خدا کا شکر ہے آپکی خیریت آئی۔ آپ مجھ سے ایک سوال کرتی ہیں تو میں دس پانچ جواب دیتی ہوں۔ سنیئے۔

میری عمر سترہ سال کی ہے خواجہ صاحب کے خاندان کی ہوں۔ میری والدہ اور خواجہ صاحب کی پہلی بیوی سگی بہنیں تھیں۔ حور بانو نے میری والدہ یعنی اپنی خالہ کے ہاں پرورش پائی ہے۔ میرے عقد کو یہ دسواں مہینہ ہے۔ میں اس بستی کے باہر رہتی ہوں جس میں میرے خاندان کے سب لوگ آباد ہیں۔ میرا گھر درگاہ کے قریب ہے۔ میرے دل کو بہت ندامت ہوئی آپ کا یہ فقرہ دیکھ کر کہ آپ خداوالا اور صوفی جان کر مجھ سے خط و کتابت چاہتی ہیں۔ خلقت ہم کو پیرزادہ سمجھ کر اچھا ہی خیال کرتی ہے۔ مگر ہم لوگوں کے عمل اس قابل نہیں ہیں۔ آپ یہاں آئے اور ہم کو دیکھیں تو آپ کو افسوس ہوگا کہ جو خیال آپ نے ہماری نسب قائم کیا تھا وہ درست نہ تھا۔ ہم کو تو اچھی اور نیک باتیں معلوم تک نہیں ہیں عمل تو دوسری چیز ہے۔

خواجہ صاحب کی مرید خواتین مجھ سے ملنے آتی ہیں اور ادب آداب کی رسمیں ادا کرتی ہیں تو میں غیرت و شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہوجاتی ہوں کہ مجھے ان سے اس قسم کی باتیں تک کرنی نہیں آتیں جو خیال وہ لے کر آتی ہیں۔

میں نے پہلے ہی لکھا تھا گاؤں کی رہنے والی ہوں ملنے جلنے کا سلیقہ بالکل نہیں ہے۔ دو سال میں لکھنا پڑھنا سیکھا اور دس مہینے میں خط و کتابت کی مشق ہوئی وہ بھی اس طرح کے خواجہ صاحب کے پاس آنے والے خط پڑھتی ہوں اور بعض کے جواب وہ مجھ سے لکھواتے ہیں کیونکہ عورتوں کے جوابات اکثر مجھ سے لکھواتے ہیں۔

لیجئے میں آپ کو رات دن کے کام بتائے دیتی ہوں اس سے آپ سمجھ لیں گی کہ ہم لوگ خدا کی یاد میں کتنا وقت صرف کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب رات کو تین بجے بیدار ہوتے ہیں اور اپنے کام سے فارغ ہوکر ساڑھے چار بجے ہم کو جگا دیتے ہیں۔ اس وقت تارے آسمان پر چمکا کرتے ہیں میں اور حور بانو خواجہ صاحب کے ہمارے ہمایوں کے مقبرے یا عیسیٰ خاں کے مقبرے پر جو ہمارے گھر سے پاؤ میل ہے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک میل کے قریب صبح ہوا خوری ہوجاتی ہے۔ واپس آکر سب نماز پڑھتے ہیں۔ نماز کے بعد ڈاک آجاتی ہے۔ خواجہ صاحب تلاوت قرآن میں ہوتے ہیں اور میں ڈاک چھانٹ کر ان کی ذاتی الگ کردیتی ہوں اور دفتر کی باہر منشیوں کو بھجوا دیتی ہوں۔ خواجہ صاحب فارغ ہوکر لکھنے بیٹھ

جاتے ہیں اور میں گھر کی صفائی دیکھتی ہوں پینے کا پانی جوش کرتی ہوں وغیرہ۔ خانہ داری کے کاموں میں دس بج جاتے ہیں۔ میری والدہ کے یہاں سے کھانا پک کر آتا ہے۔ خواجہ صاحب مردانے میں جاتے ہیں اور میں تازہ اخبار پڑھتی ہوں۔ بارہ بجے سو جاتی ہوں۔ دو بجے بیدار ہو کر ظہر کی نماز پڑھتی ہوں پھر سینا لے کر بیٹھتی ہوں۔

عصر کے بعد خواجہ صاحب گھر میں آتے ہیں کیونکہ وہی وقت مولوی صاحب کے آنے کا ہے جو ہم کو عربی پڑھاتے ہیں۔ سبق دے کر مولوی صاحب گئے اور مغرب تک خواجہ صاحب نے ہم کو سبق یاد کروادیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ خواجہ صاحب عشاء کی نماز باہر پڑھتے ہیں اور میں عشاء تک کسی قصے کی کتاب پڑھتی ہوں۔ عشاء کے بعد ساڑھے نو بجے سو جاتے ہیں۔ اب بتلایئے ان سب کاموں میں سوائے نماز کے جو ہر مسلمان پڑھتا ہے اور کونسا کام ایسا ہے جو ہم دوسروں سے زیادہ کرتے ہیں۔ طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ پھر ابھی سے دماغ اور آنکھوں کی کمزوری بری ہے اس کا علاج کرنا چاہیے۔ سچ ہے محنت زیادہ نہ کیا کیجئے۔

ہم لوگوں کا علی گڑھ یا بھیکم پور آنا بہت مشکل ہے۔ علی گڑھ کالج اور زنانہ مدرسے کا شوق تو بہت ہے مگر اخباروں میں اس کی مخالفت پڑھ کر میرا دل کچھ اوپر سے ہٹ گیا۔ حسرت موہانی صاحب کی بیگم نے بھی خواجہ صاحب کو زنانہ مدرسے کے خلاف خط لکھا تھا۔ مگر خواجہ سے معلوم ہوا کہ یہ مخالفت کسی رنج کے سبب ہے۔

اس بھادوں کے مہینے میں خواجہ صاحب کو بخار شدت سے آیا کرتا ہے۔ اب کے اس کا ڈر ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ شملہ چلے جاؤ۔ وہ کہتے ہیں کہ تم بھی چلو مگر میری ہمت نہیں پڑتی کیونکہ میں نے آج تک گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اتنے بڑے سفر پر خبر نہیں کیا پیش آئے۔ ایک ہم ہیں کہ ریل میں بیٹھے تک نہیں۔ ایک ہمارے بزرگوں کی عورتیں تھیں کہ ہزاروں کوس کا سفر کیا کرتی تھیں جبکہ ریل بھی نہ تھی۔ میں نے آپکا وقت بہت ضائع کیا۔ اپنی بڑی بہن کو سلام کہیئے۔

خاکسار لیلیٰ

خواجہ بانو

کتابیات

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	ناشر کا نام	سن اشاعت
۱	ابوسلمان شاہجہاں پوری	تذکرۂ نعت گو شاعرات	مکتبہ شاہد کراچی	۱۹۸۴ء
۲	ابوالقاسم محتشم	ماہ درخشاں (تذکرۃ شاعرات)	مطبوعہ	۱۳۰۰ھ
۳	ابوالکلام آزاد	غبارِ خاطر	مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، لاہور	-
۴	ادا جعفری	جو رہی سو بے خبری رہی	مکتبۂ دنیا	۱۹۹۵ء
۵	اسد سلیم شیخ	انسائیکلو پیڈیا تحریک پاکستان	-	
۶	احتشام حسین	ادب اور سماج	قادری پریس بمبئی	۱۹۴۸ء
۷	اقبال ڈاکٹر محمد	کلیات اقبال	فضلی سنز لمیٹڈ	۱۹۹۷ء
۸	انجم اعظمی	ادب اور حقیقت	کراچی اشاعت گھر	۱۹۷۹ء
۹	ام سلمیٰ زمن	مسلم خواتین اور جدوجہد آزادی	کفایت اکیڈمی	۱۹۹۷ء
۱۰	انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں	انجمن ترقی اردو	۱۹۸۵ء
۱۱	انور سدید	اردو ادب کی مختصر تاریخ	اے ایچ پبلشرز، لاہور	۱۹۹۶ء
۱۲	انور سدید	پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ	رمنا پرنٹرز، اسلام آباد	-
۱۳	امداد صابری	روحِ صحافت، جلد چہارم، پنجم	یونین پریس اردو بازار، دہلی	-
۱۴	انیسہ خاتون شروانیہ	حیات ز خ ش	اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد دکن	۱۹۴۰ء
۱۵	ایلین شوالٹر Elain Showalter	دی نیو فیمینسٹ کریٹسزم The New Feminist Critism	پینتھان بک نیویارک	۱۹۸۵ء
۱۶	آسی، عبدالباری	تذکرۃ الخواتین	نولکشور پریس، لکھنو	-
۱۷	بسمل، عبدالرزاق	تذکرۂ جمیل (تذکرۂ شاعرات)	شمس الاسلام پریس، حیدرآباد	۱۹۲۹ء

۱۸	ترنم ریاض	بیسوی صدی میں خواتین کا اردو ادب	ساہتیہ اکادمی، دہلی	-
۱۹	چندا، گلزار ماہ لقا	دیوان چندا بی بی مخاطب بہ ماہ لقا چندا	نظام المطابع، حیدرآباد	۱۳۲۴ھ
۲۰	حالی، الطاف حسین	مقدمۂ شعر و شاعری	انوارالمطابع، لکھنو	-
۲۱	حالی، الطاف حسین	مجالس النساء	گورنمنٹ پبلشرز، انارکلی، لاہور	۱۹۲۹ء
۲۲	خواجہ حسن ثانی نظامی	خواجہ حسن نظامی، حیات اور کارنامے	اردو اکادمی، دہلی	۱۹۸۷ء
۲۳	خواجہ منظور حسین	تحریک جد و جہاد، بطور موضوع سخن	نیشنل بک فاؤنڈیشن	۱۹۷۸ء
۲۴	دشکا سید ڈاکٹر	برطانوی پنجاب کی مسلمان خواتین	سنگِ میل، لاہور	۲۰۰۳ء
۲۵	رام بابو سکسینہ (مرزا محمد عسکری مترجم)	تاریخ ادب اردو	غضنفر اکیڈمی، کراچی	
۲۶	رشید النساء	ناول اصلاح النساء	روشن خیال، کراچی	۲۰۰۰ء
۲۷	رنج، حکیم فصیح الدین	بہارستان ناز (تذکرۂ شاعرات)	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۵ء
۲۸	ز خ ش	فردوس تخیل	پنجاب پبلشنگ ہاؤس، لاہور	-
۲۹	زاہدہ حنا	عورت زندگی کا زنداں	شہرزاد	۲۰۰۴ء
۳۰	سعید لخت	اردو انسائیکلوپیڈیا' تیسرا ایڈیشن	فیروز سنز لمیٹڈ لاہور' راولپنڈی' کراچی	
۳۱	سیمیں ثمر فضل، ڈاکٹر	ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ		
۳۲	شرم، نواب شمس النساء	دیوان	نظامی پریس، لکھنو	۱۸۹۰ء
۳۳	شرر عبدالحلیم	بدرالنساء	-	۱۹۰۱ء
۳۴	شمس الرحمن فاروقی	اردو کا ابتدائی زمانہ	آج کی کتابیں، کراچی	۱۹۹۹ء
۳۵	شان الحق حقی	نکتۂ راز	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۷۲ء
۳۶	شفیق بریلوی	تذکرۂ شاعرات	مشہور پریس، کراچی	۱۹۶۱ء

۳۷	شیریں، شاہجہاں بیگم	دیوان	نظامی پریس، کانپور	۱۲۸۸ھ
۳۸	شیما مجید	ادبی مذاکرے	سنگِ میل پبلی کیشنز	۱۹۸۹ء
۳۹	صغریٰ مہدی	مجلّہ غالب نما دہلی		۲۰۰۲ء
۴۰	صدیقہ ارمان ڈاکٹر	سرسید تحریک کا ردعمل	سرسید یونیورسٹی پریس	۱۹۹۹ء
۴۱	صفا، عبدالحیٔ	شمیم سخن (تذکرۂ شاعرات)	نولکشور پریس، لکھنو	۱۸۹۱ء
۴۲	طاہر مسعود	اردو صحافت کی نادر تاریخ	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور	۱۹۹۲ء
۴۳	طاہرہ بیگم	نادر جہاں	-	۱۹۰۱ء
۴۴	عابد علی عابد	اسلوب	مجلس ترقی اردو ادب، لاہور	۱۹۹۶ء
۴۵	عباس خان شروانی	شروانی نامہ	شروانی پرنٹنگ پریس، علیگڑھ	۱۹۵۲ء
۴۶	غالب اسداللہ خان	دیوان	فضلی سنز	-
۴۷	فاطمہ حسن	فیمنزم اور ہم	وعدہ کتاب گھر	۱۹۹۴ء
۴۸	فرخی، ڈاکٹر اسلم	محمد حسین آزاد، جلد اول، دوئم	انجمن ترقی اردو، کراچی	۱۹۶۵ء
۴۹	فرمان فتح پوری	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	-	۱۹۹۰ء
۵۰	فہمیدہ ریاض	نسائی ردِ تشکیل	وعدہ کتاب گھر	۱۹۹۵ء
۵۱	کرار حسین، پروفیسر	سوالات و خیالات	فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی	۱۹۹۹ء
۵۲	قرۃ العین حیدر	داستانِ عہد گل	مکتبہ دانیال، کراچی	۲۰۰۲ء
۵۳	قیصر جہاں	اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ	شعبہ اردو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی	۲۰۰۴ء
۵۴	نادیہ اتم	اردو شاعری میں عورت کا تصور	الخطاط پبلی کیشنز، لکھنو	۱۹۹۱ء
۵۵	محمود الرحمٰن	انتخابِ کلام داغ	دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد	۱۹۹۶ء
۵۶	محمد جمیل احمد بریلوی	تذکرۂ شاعرات	قومی کتب خانہ، دہلی	۱۹۴۴ء
۵۷	ممتاز حسین	ادب اور روحِ عصر	شہرزاد	۲۰۰۳ء

۵۸	ممتاز گوہر، ڈاکٹر	منتخبات تہذیب نسواں	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور	۱۹۱۸ء
۵۹	مولوی محمد امین زبیری	مسلم خواتین کی تعلیم		
۶۰	ممتاز حسین	ادب اور روحِ عصر	شہرزاد	۲۰۰۳ء
۶۱	ولیم ایل لینگر	انسائیکلو پیڈیا' تاریخ عالم۔جلد اول	شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، کراچی	

رسائل

نمبر شمار	مصنف کا نام	رسالہ	سن اشاعت
۶۲	مولوی ممتاز علی	تہذیب نسواں، لاہور	۱۹۲۲ء
۶۳	ز خ ش	خاتون علی گڑھ	۱۹۱۲ء
۶۴	ز خ ش	شریف بی بی، لاہور	۱۹۱۴ء
۶۵	رازق الخیری	عصمت جلد ۱۰۱، کراچی	۱۹۵۸جولائی
۶۶	شائستہ اکرام اللہ	عصمت، کراچی	۱۹۹۸ء اکتوبر
۶۷	مدیحہ خاتون شروانی	آج کل دہلی	۱۹۹۶ء اپریل
۶۸	مدیحہ خاتون شروانی	سنگت کوئٹہ	۲۰۰۶ء اگست